سرورق پہلے والا ہے، بیک ٹائٹل پر دیا گیا میٹر ۲۰۱۴ء کا ہے

حیدر قریشی کی اب تک کی کتابیں

(یہ کتابیں مختلف شعری، نثری اور نثری و شعری مشترکہ کلیات کے کتابی اور انٹرنیٹ ایڈیشنز میں شائع ہو چکی ہیں)

تخلیقی ادب

سلگتے خواب (غزلیں) — **عمرِ گریزاں** (غزلیں، نظمیں اور ماہیے)

محبت کے پھول (ماہیے) — **دعائے دل** (غزلیں، نظمیں)

درد سمندر (غزلیں، نظمیں، ماہیے) — **زندگی** (غزلیں، نظمیں، ماہیے)

روشنی کی بشارت (افسانے) — **قصے کہانیاں** (افسانے)

میری محبتیں (خاکے) — **کھٹی میٹھی یادیں**

فاصلے قربتیں (انشائیے) — **سوئے حجاز** (عمرہ و حج کا سفرنامہ)

....

تنقید و تبصرے

حاصلِ مطالعہ — **تاثرات** — **مضامین اور تبصرے**

ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ما بعد جدیدیت

ستیہ پال آنند کی "...بودنی نابودنی"

....

اردو ماہیا تحقیق و تنقید

اردو میں ماہیا نگاری.....اردو ماہیے کی تحریک.....

اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما

اردو ماہیا..........اردو ماہیے کے مباحث

....

حالاتِ حاضرہ (انٹرنیٹ کالموں کے مجموعے)

منظر اور پس منظر — **خبر نامہ**

ادھر اُدھر سے — **چھوٹی سی دنیا** (صرف ای بک)

سروَر ادبی اکادمی جرمنی کے زیرِ اہتمام

بیک وقت کتابی صورت میں اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہونے والا اردو کا ادبی جریدہ

جدید ادب

www.jadeedadab.com

شمارہ:3 (جولائی تا دسمبر 2004ء)

ایڈیٹر

حیدر قریشی

•••••

رابطہ کرنے کے لئے اور تخلیقات بھیجنے کے لئے ایڈریسز:

Haider Qureshi : Rossertstr.6 Okriftal
65795 - Hattersheim, (**GERMANY**)

Prof. Nazar Khaleeq: Commercial Area, Near Masjid Alrehman,
Satelite Town Khanpur,
Distt. Rahim yar khan (**PAKISTAN**)

Umar Kairanvi : L-21/B, Abul Fazal Enclave, Okhla,
Delhi-25 (**INDIA**) -- Mobile: 98714 16172
umarmohd@hotmail.com

جن احباب کے پاس ای میل کی سہولت ہے وہ ان پیج فائل میں اپنا میٹر ان ای میل ایڈریسز پر بھجوائیں۔شکریہ!

hqg7860000@aol.com اور **khaleeqkhanpur@yahoo.com**

فہرست

غزلیں

افسانے

نظمیں اور گیت

سرورق: ریحانہ احمد
مطبع: فرید بک ڈپو، دہلی

نوٹ: "جدید ادب" کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ ڈاک خرچ بھیج کر اسے مفت منگوایا جا سکتا ہے۔

NOTE:This Journal JADEED ADAB is free of cost. readres can get it just paying the postal fee.

گفتگو!

اس بار جدید ادب کے سلسلے میں اتنا میٹر جمع ہوگیا کہ ضخامت ۳۲۰ صفحات سے بڑھ گئی۔ چنانچہ بہت سا موصولہ میٹر نکالنا پڑا۔ میری کوشش تھی کہ رسالہ ۲۵۰ صفحات تک لے آؤں لیکن اتنی تگ و دو کے باوجود ۲۸۰ صفحات سے کم نہیں ہو سکا۔ ابتدا میں نے اپنے ایک مضمون کو حذف کرنے سے کی۔ سو بہت سے دوستوں کی تخلیقات اس میں موجود نہ ہوں تو اسے کسی بدظنی کے طور پر دیکھنے کی بجائے میری مجبوری کے طور پر دیکھیں۔ حقیقتاً میں ۱۶۰ صفحات کا ایک شمارہ جیسے تیسے نکال سکتا ہوں لیکن دوسرے شمارے تک صفحات ۲۳۲ ہوگئے اور اب ۳۰۰ سے بھی تجاوز کر گئے تھے۔ میں اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلانا چاہتا ہوں۔ اس لئے جدید ادب کی ٹیم اور دوسرے بہی خواہوں کے مشورے سے اس بار طے کیا ہے کہ جدید ادب کے تمام قارئین خواہ وہ کہیں بھی رہتے ہوں ان سے درخواست کی جائے کہ وہ جدید ادب کے پیکٹ پر رجسٹرڈ بک پوسٹ کے ٹکٹ کی رقم دیکھیں اور صرف ڈاک خرچ کے طور پر اتنی رقم اپنی سہولت کے مطابق انڈیا میں عمر کیرانوی صاحب کو یا پاکستان میں نذر خلیق صاحب کو بھیج دیں۔ (مجھے رسائل بھیجنے والے مدیران اس سے مستثنیٰ ہیں) اس شمارے کے بعد جو دوست ڈاک خرچ کی ادائیگی نہیں کرسکیں گے، ان سے شرمندگی کے ساتھ معذرت چاہوں گا کہ پھر ان کو جدید ادب کا اگلا شمارہ نہیں بھیجا جا سکے گا۔ مجھے ایسے کسی دوست سے گلہ نہیں ہوگا اور ان کو بھی مجھ سے گلہ نہیں ہونا چاہئے۔

ادبی دنیا میں اس وقت بعض سینیئرز کے خلاف ایک مہم سی چلی ہوئی ہے۔ اسی طرح بعض ہمعصروں کے درمیان بھی ٹھنی ہوئی ہے۔ اختلاف رائے سے کسی کو روکا نہیں جانا چاہئے لیکن ادب میں اختلاف رائے میں ''پہلا قرینہ'' بھی ''ادب'' ہونا چاہئے۔ ہوسکتا ہے بعض سینیئرز کے خلاف لکھنے والے دوستوں کی در پردہ اصل نیم ذاتی اور نیم ادبی شکایات میں بڑی حد تک ''جائز شکایت'' ہونے کا عنصر موجود ہو، ان کے ساتھ کسی رنگ میں ناانصافی بھی ہوئی ہو لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان قدآور علمی و ادبی شخصیات کے علمی اور ادبی کردار کو مسخ کیا جائے جن کے علم و فضل سے ہم سب فیضیاب ہوئے ہوں اور جن کی علمی اور ادبی حیثیت ابھی موجودہ عہد کے فیصلے سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ میں ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ رہا ہوں کہ ایسے کاموں کا نتیجہ بعض مخصوص حلقوں کی طرف سے وقتی واہ واہ کے علاوہ کچھ نہیں نکلتا، لیکن خود کو بعد میں شرمندگی ہوتی ہے۔ بعض ہمعصروں کی چپقلش کے سلسلے میں مَیں ذاتی طور پر کوشاں ہوں کہ نہ صرف ان کے درمیان سیز فائر ہو جائے بلکہ ان کی رنجشیں بھی دور ہوسکیں۔

میری گزارش ہے کہ اگر مہم چلانی ہے تو منشی گیری کرنے والے غیر جینوئن لکھنے والوں کے خلاف چلائیے۔ جعلی شاعروں اور چور افسانہ نگاروں کے خلاف مہم چلائیے۔ بعض ہمعصروں کے جھگڑوں یا بعض سینیئرز کے خلاف چلائی گئی مہم سے ایک طرف ادبی فضا مکدر ہوگی تو دوسری طرف ان جعلی شاعروں اور ادیبوں کی بالواسطہ طور پر حوصلہ افزائی ہوگی جو محض ڈالرز، پاؤنڈز اور یورو کے بل پر شاعر اور ادیب بن بیٹھے ہیں۔ کیا ہم دنیا کو یہی بتانا چاہتے ہیں کہ ہر شعبہ میں ہم اصل ہیروز کی تذلیل اور جعلی لوگوں کی تکریم کرتے ہیں؟

حیدر قریشی

حضرت علی المرتضیٰؑ

مناجاۃ الربّ

(اللہ رب العزت سے راز و نیاز)

لَبّیکَ لبّیکَ أنتَ مَولاہُ فَارحَم عُبیداً إلَیکَ مَلجَاہُ

(میں حاضر ہوں۔ میں حاضر ہوں! تُو ہی میرا مولا ہے۔ اپنے بندہ حقیر پر رحم کر کیونکہ تُو ہی میری پناہ گاہ ہے)

یَا ذَالمَعَالي عَلَیکَ مُعتَمَدي طُوبیٰ لِمَن کُنتَ أنتَ مَولاہُ

(اے بلند مقام والے! تُو ہی میرا سہارا ہے۔ اور جس کا تُو مولا ہے، وہ حالتِ طوبیٰ میں ہے۔)

طُوبیٰ لِمَن کَانَ نَادِ ماً أَرِقاً یَشکُو إلِیٰ ذِي الْجَلَالِ بَلوَاہُ

(وہ شخص جو اپنے کئے پر نادم ہے، جو راتوں کو جاگتا ہے اور شکوہ کرتا ہے بڑی شان والے سے۔)

وَمَا بِهِ عِلَّةٌ وَ لَا سَقَمٌ أَکثَرُ مِن حُبِّهِ لِمَولَاہُ

(رنج و غم کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ اس کی نظر میں حبِّ مولا سے بڑھ کر کچھ نہیں۔)

إِذَا خَلا في الْظّلامِ مُبتَهِلاً أَجَابَهُ اللّٰهُ ثُمَّ لَبَّاہُ

(جب وہ تنہائی میں گریہ زاری کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا جواب اس کی حاجات کو قبول کر کے دیتا ہے)

سَأَلتَ عَبدي وَ أَنتَ في کَنَفي وَ کُلُّ مَا قُلتَ قَد سَمِعنَاہُ

(اے میرے بندے تو نے مجھ سے سوال کیا تو تُو میری پناہ میں ہے۔ اور جو کچھ تُو نے کہا ہے، میں نے سنا ہے۔)

صَوتُکَ تَشتَاقُهُ مَلا ئِکَتي فَذَنبُکَ الْآنَ قَد غَفَر نَاہُ

(میرے فرشتے تیری فریاد کے مشتاق ہیں اور میں نے تیرے گناہوں کی مغفرت کر دی ہے۔)

في جَنَّةِ الْخُلدِ مَا تَمَنَّا ہُ طُوبَا ہُ طُوبَاہُ ثُمَّ طُوباہُ

(جس چیز کی تم نے تمنا کی ہے وہ بہشت میں موجود ہے۔ وہ حالتِ طوبیٰ میں ہے، طوبیٰ میں ہے، طوبیٰ میں ہے۔)

سَلني بِلا حِشمَةٍ وَلَا رَهَب وَلَا تَخَف إِنَّني أَنَا اللّٰہ

(مجھ سے سوال کرو بغیر کسی جھجک کے۔ کیونکہ مجھ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔ یقیناً میں تمہارا اللہ ہوں!)

مناجات

صادق باجوہ (امریکہ)

پھر خطائیں معاف کر دیجے
رحمتوں سے قلوب بھر دیجے
ہیں مناجات کے لئے حاضر
اب دعائیں قبول کر لیجے
منتظر کب سے دید کے ترسے
جلوۂ خاص عام کر دیجے
احمدِ مجتبیٰؐ کی امت کو
پھر سے خیرالانام کر دیجے
سب گناہوں کو بھول کر مالک
ایک بخشش ہی دان کر دیجے
خانۂ دل میں رحمتوں کا نزول
اپنی شانِ غنا سے کر دیجے
ساقیا! تشنہ کام صادق کا
مئے عرفاں سے جام بھر دیجے

نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

صادق باجوہ

باعثِ خلقتِ حیات ہوا
وجہِ تخلیقِ کائنات ہوا
احمدِ مجتبیٰؐ کی شان تو دیکھ!
مظہرِ جامع الصفات ہوا
شفقتوں کا اسی کی فیض رواں
مہرِ انوارِ کائنات ہوا
نوعِ انساں کا ملجا و ماوا
فخرِ انسانیت صفات ہوا
عفو و احسان و دستگیری میں
پُر عزیمت تھا پُرثبات ہوا
اک یہی دل ہوا تھا عرش نشیں
مہبطِ نُور تجلیات ہوا
اک وسیلۂ ہادیٔ کاملؐ
اپنا سرمایۂ حیات ہوا
پیروی کیوں نہ فرض ہو اسکی
جس کا اسوہ رہِ نجات ہوا

نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

صادق باجوہ

نعت گوئی کا ہمیں یارا کہاں
اس کا در اور معصیت مارا کہاں
وہ شہِ لولاکؐ ہم دنیا پرست
اپنے دھندوں سے ہے چھٹکارا کہاں
جو ترے پاس آیا تیرا ہو گیا
زیدؓ پھر ماں باپ کا پیارا کہاں
دشمنوں کو دوست کہنا آ گیا
کون دیکھے ایسا نظّارا کہاں
ساقیا! رحمت کنند بر عاصیاں
ڈوبتی ناؤ کا پتوارا کہاں
دامنِ امید پھیلائے ہوئے
جائے گا اب ہجر کا مارا کہاں
ملتجی صادق ہے آقاؐ دیکھئے
روزِ محشر اور کچھ چارا کہاں

نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

سیما عابدی (امریکہ)

خدائی اور خودی کا آئینہ ہے
محمدؐ زندگی کا آئنہ ہے
محمدؐ مصطفیٰ کی ذاتِ اقدس
مرے رب کی خوشی کا آئنہ ہے
اسی کے دَم سے پہچانا خدا کو
وہی تو آگہی کا آئنہ ہے
محمدؐ مصطفیٰ کا سجدہ سجدہ
خدا کی بندگی کا آئنہ ہے
نظر وہ چوم لینے کے ہے قابل
جو دیدارِ نبیؐ کا آئینہ ہے
ہنر اس کے برتنے کا تو سیکھو
یہ دل عشقِ نبیؐ کا آئنہ ہے
انہی کی ذاتِ اقدس و مقدس
عرب کی دلکشی کا آئنہ ہے

نعتیہ ماہیے

امین خیال (جاپان)

الطاف محمدؐ کے
لکھ نہ سکا کوئی
اوصاف محمدؐ کے

ہمدرد غریبوں کے
پاک نبیؐ میرے
غمخوار یتیموں کے

مسجد کا کونا ہے
لوہا مدینے کا
میرے لئے سونا ہے

کملی کا سایا ہے
مشفق ان جیسا
جگ میں نہیں آیا ہے

چاند آپ کا ہالہ ہے
نامِ محمدؐ سے
گھر گھر میں اجالا ہے

بدلی کا سایا ہے
نور عیاں ہوکر
بَن احمدؐ آیا ہے

نعتیہ ماہیے

سجاد مرزا

(گوجرانوالہ)

آنکھوں میں مدینہ ہے
نوری جلوے سے
روشن مرا سینہ ہے

آجائے پیام اُنؐ کا
جلد مدینے میں
پہنچے گا غلام اُنؐ کا

طیبہ میں چلا آؤں
اذنِ حضوریؐ ہو
سرکارؐ سکوں پاؤں

مستی میں سدا جھوموں
شہرِ مدینے کے
ذروں کو اگر چوموں

بلواؤ مدینے میں
لطف نہیں آقاؐ!
ملتا مجھے جینے میں

دکھ دور ہوں سب میرے
شرط ہے یہ مولاؐ!
طیبہ میں لگیں ڈیرے

نعتیہ ماہیے

اعجاز عبید

(حیدرآباد۔دکن)

کیا خوشبو سوندھی ہے
بارش رحمت کی
یثرب کی مٹّی ہے

کیسا یہ سرور آیا
خاکِ مدینہ سے
مری آنکھوں میں نور آیا

اک نام کو چوما تھا
طیبہ پہنچے تو
ہر نفس مہکتا تھا

جو ہیں وہ پیشِ رسولؐ
کچھ نہیں صحرا میں
بس ناگ پھنی کے پھول

میں پیر کہاں رکھوں
گزرے ہوں گے نبیؐ
بس مٹّی کو چوموں

ڈاکٹر جمیل جالبی (کراچی)

حیاتِ فیض کا ایک گم شدہ ورق

ہمارے نامور، عالمی شہرت یافتہ شاعر اور ترقی پسند دانشور فیض احمد فیض کی زندگی کا یہ پہلوان جانا ہے کہ دوسری جنگِ عظیم (۱۹۴۵ء۔۱۹۳۹ء) کے دوران وہ کیوں اور کیسے برطانیہ کی سامراجی حکومت کی فوج میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر فائز ہوئے اور برطانوی حکومت نے فوج جیسے حساس ادارے میں انہیں کیوں قبول کیا؟ اسی زمانے میں نہ صرف فیض احمد فیض بلکہ چراغ حسن حسرت اور مجید ملک بھی فوجی وردی پہن چکے تھے اور خان بہادر ابوالاثر حفیظ جالندھری کا یہ گیت آل انڈیا ریڈیو سے بار بار پیش کیا جا رہا تھا:

''اڑوسن پڑوسن چاہے کچھ کہے، میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی رے
اٹلی، جرمنی اور جاپان، میں تو تینوں کا بھُرتا بنا آئی رے
میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی رے''

کیوں اور کیسے کی تلاش میں جب ہم اُس دور کی تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انقلابِ روس ۱۹۱۷ء کے بعد سویت روس' سامراج اور سرمایہ داری کے دشمن کے طور پر نمایاں ہوا اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی قومیں اپنی آزادی اور فلاح کے لیے روس کی طرف دیکھنے لگیں۔ برصغیر اس وقت برطانوی سامراج کی زنجیروں میں جکڑا ہوا آزادی کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ساری دنیا میں بائیں بازو کی جماعتیں وجود میں آ رہی تھیں اور کمیونسٹ پارٹی کم و بیش ہر ملک میں منظّم ہو رہی تھی۔ ۱۹۲۶ء میں جب لندن پولیس نے برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی کے دفتر پر چھاپا مارا تو جو کاغذات ہاتھ لگے ان سے یہ بات سامنے آئی کہ برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی آکسفورڈ اور کیمبرج کے ان ہندوستانی طلبہ کو متاثر اور ملانے کی کوشش کر رہی ہے جو وہاں اعلیٰ تعلیم کے لیے آئے ہیں۔ اس زمانے میں مالدار گھرانوں کے نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لیے عام طور پر آکسفورڈ یا پھر کیمبرج جاتے تھے۔ یہی وہ دور ہے جب ہندوستان میں بھی تیس کے ابتدائی عشرے میں کمیونسٹ پارٹی کی تنظیمِ نو کی جا رہی تھی اور برطانوی حکومت کے خلاف ان کی سرگرمیاں اتنی بڑھ چکی تھیں کہ ۱۹۳۳ء میں برطانوی حکومتِ ہند نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کو غیر قانونی جماعت قرار دے دیا تھا اور اسی کے ساتھ پنجاب' مدراس اور بمبئی کی صوبائی حکومتوں نے بھی احکام جاری کر دیئے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں برصغیر میں ''کانگرس سوشلسٹ

پارٹی'' کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ جماعت ایک طرح سے کانگرس ہی کا ایک حصہ تھی۔ ۱۹۳۵ء میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کی ساتویں عالمی کانگرس ماسکو میں منعقد ہوئی جس میں یہ طے پایا کہ ۱۹۲۸ء کی حکمتِ عملی غلط تھی اور اب انڈین کمیونسٹوں کو چاہئے کہ وہ دو کام کریں۔ ایک یہ کہ ادبی انجمنیں بنائی جائیں اور انہیں اپنی نئی حکمتِ عملی کے لیے پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کیا جائے تا کہ مارکسزم کے فلسفے کو نئی نسلوں میں مقبول بنایا جا سکے۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان کے کمیونسٹ زیادہ سے زیادہ تعداد میں نیشنل کانگرس اور کانگرس سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہوں اور وہاں اپنا کام انجام دیں۔ ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' اسی حکمتِ عملی کے تحت اسی زمانے میں وجود میں آئی اور اسی زمانے میں جے پرکاش نرائن کی حمایت و مدد سے متعدد سرکردہ کمیونسٹ نوجوان کانگرس اور کانگرس سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اس طرح نئی حکمتِ عملی کے تحت ایک ''متحدہ محاذ'' وجود میں آ گیا۔ جس کا بظاہر مقصد یہ تھا کہ کمیونسٹ اور کانگرس مل کر سامراجی قوت سے نجات حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کریں گے۔ ۱۹۳۶ء میں جب ترقی پسند مصنفین کا پہلا اجلاس ہوا اور اس کا مینی فیسٹو پیش کیا گیا تو ''متحدہ محاذ'' کی وجہ ہی سے پنڈت جواہر لعل نہرو، رابندر ناتھ ٹیگور، مولانا حسرت موہانی، منشی پریم چند، مولوی عبدالحق وغیرہ کی حمایت انہیں حاصل ہوئی۔ اسی متحدہ محاذ کی وجہ سے ۳۸۔۱۹۳۷ء تک کانگرس سوشلسٹ پارٹی کی مجلسِ منتظمہ میں دو کمیونسٹ بطور رکن اور دو جوائنٹ سیکرٹری منتخب ہو چکے تھے۔ ان میں سید سجاد ظہیر عرف بنے بھائی آل انڈیا کانگرس سوشلسٹ پارٹی کے جوائنٹ سیکرٹری اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے رکن مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر زیڈ اے احمد اور ڈاکٹر محمد اشرف آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے صدر دفتر میں اہم عہدوں پر فائز ہوئے۔ اسی طرح نمبودری پد، پی سندرایا اور گوپالن کانگرس سوشلسٹ پارٹی کے کلیدی عہدوں پر فائز ہوئے، میاں افتخارالدین پنجاب صوبائی کانگرس کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ یہاں رہ کر کمیونسٹوں نے اس حکمتِ عملی پر عمل کیا جو ۱۹۳۵ء کی کمیونسٹ انٹرنیشنل ماسکو میں طے ہوئی تھی۔ انہوں نے کانگرس اور سوشلسٹ پارٹی کے پلیٹ فارم کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اتنا کھلم کھلا استعمال کیا کہ ۱۹۳۷ء میں پٹنہ کے اجلاس میں کمیونسٹ اراکین نے یہ بیان پڑھ کر سنایا کہ کانگرس سوشلسٹ پارٹی دراصل کوئی سوشلسٹ پارٹی ہی نہیں ہے اور کمیونسٹ اسے صرف پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔

اس بیان سے دونوں فریقین میں اختلاف شدید تر ہو گئے اور کانگرس اور سوشلسٹ پارٹی نے محسوس کیا کہ کمیونسٹ دراصل کانگرس اور سوشلسٹ پارٹی پر قبضہ جمانا چاہتے ہیں یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچے کہ ۱۹۴۰ء میں کانگرس سوشلسٹ پارٹی نے سارے کمیونسٹ ممبروں کو پارٹی سے خارج کر دیا۔ اس عرصے میں کمیونسٹ طلبہ تنظیموں، ٹریڈ یونینوں اور دوسرے محاذوں پر قدم جما چکے تھے اور یہی ان کی بنیادی حکمتِ عملی تھی۔

جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ جب ۱۹۳۳ء میں سوویٹ روس ''لیگ اوف نیشنز'' کا رکن بنا تھا تو اس نے نازیوں اور فسطائی قوتوں کے خلاف اپنی حکمتِ عملی کا اعلان کیا تھا۔ لیکن اگست ۱۹۳۹ء میں ایک نئی صورتِ

حال یہ پیدا ہوئی کہ ہٹلراوراسٹالن کے درمیان تعاون ودوستی کا معاہدہ ہوگیااوراسی کے ساتھ ۳ستمبر ۱۹۳۹ء کودوسری جنگِ عظیم چھڑگئی۔اس معاہدے نے نازی دشمنی کونازی دوستی میں بدل دیااوراس معاہدے کے مطابق ساری دنیا کی کمیونسٹ پارٹیوں نے بھی نازی دوستی کی حکمتِ عملی کواختیار کرلیا۔اب برطانیہ وفرانس سامراجی جنگ پسند قرار پائے اور جرمن ہٹلر دوست اور امن پسند ٹھہرے۔۱۹۴۰ء میں کمیونسٹوں نے گاندھی اورنہروکوآزادئ ہند کا دشمن اور برطانوی سامراج کا پٹھوقرار دیا۔اس نئ حکمتِ عملی کے تحت ۱۲اکتوبر ۱۹۴۰ء کوبمبئ میں زبردست ہڑتال کرائی گئی جس کی وجہ سے چالیس کے قریب کپڑا بنانے کے کارخانے بند ہوگئے۔اس ہڑتال کا مقصد یہ تھا کہ جرمنی کے خلاف برطانیہ کی جنگی تیاریوں کونقصان پہنچایا جائے۔مزدوروں کوکم سے کم کام کرنے یانہ کرنے اور کسانوں کوکم غلّہ اگانے کی تلقین کی گئی۔۱۹۴۰ء میں ڈیفنس اوف انڈیا آرڈیننس کے تحت کمیونسٹوں کی گرفتاریاں شروع ہوگئیں اور کانگرس سوشلسٹ پارٹی کے سب اراکین ،جن میں جے پرکاش نرائن بھی شامل تھے،گرفتار کرکے دیولی کی جیل میں بند کردیئے گئے۔

ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو یہ خبر آئی کہ اسٹالن، ہٹلر معاہدے کے باوجود ہٹلر نے سوویٹ روس پرحملہ کردیا ہے۔اوراس کی فوجیں تیزی سے پیش قدمی کررہی ہیں۔اس صورتِ حال میں سوویٹ روس اوراسٹالن کے لیے کوئی اورراستہ نہیں تھا کہ وہ اتحادی بن کر برطانیہ وفرانس کے ساتھ شامل ہوجائے اور یہی ہوا۔اسی کے ساتھ نازی جرمنی، جواَب تک دوست تھا، دشمن بن گیا۔اور برطانوی سامراج جودشمن تھا، دوست بن گیا۔اسی زمانے میں برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری کا خط، برطانوی ہند کے ہوم سیکرٹری کے توسط سے کمیونسٹوں کوبھیجا گیااوراسی کے ساتھ برطانیہ کی سامراجی جنگ عوامی جنگ (People's War) بن گئی۔اتحادیوں کے ساتھ سوویٹ روس کے معاہدے اورنئ حکمتِ عملی کے تحت کمیونسٹ جیلوں سے رہا کیے جانے لگے۔۲۴جولائی ۱۹۴۲ء کوکمیونسٹ پارٹی اوف انڈیا پر سے پابندی ہٹالی گئی اورتقریباً دس سال بعد کمیونسٹ پارٹی دوبارہ ایک باقاعدہ قانونی جماعت کے طور پر کام کرنے لگی۔اب کمیونسٹ برطانوی سامراج کے دوست بن چکے تھے اور کانگرس سوشلسٹ پارٹی کے خلاف اور برطانیہ کی حمایت میں کام کررہے تھے۔کمیونسٹوں کو اپنے اخبارات نکالنے اور انجمنیں بنانے کی بھی اجازت مل گئی۔اسی زمانے میں ''دی پیپلز وار'' (عوامی جنگ) کے نام سے ایک اخبار بھی نکالا گیا۔اس نئ حکمتِ عملی نے ہندوستان کی جنگِ آزادی کونقصان پہنچایا۔

جولائی ۱۹۴۲ء میں عوامی سطح پر برصغیر کی فضا نفرت وغصہ کے جذبات سے معمور تھی۔کرپس مشن ناکام ہوچکا تھا۔۸۔اگست ۱۹۴۲ء کو کانگرس نے بمبئ کے اجلاس میں سول نافرمانی کی تحریک چلانے کا اعلان کردیا۔۹۔اگست کو کانگرس کے سارے لیڈر گرفتار کرلیے گئے۔عوام سڑکوں پرنکل آئے اور ''ہندوستان چھوڑ دو'' (QUIT INDIA) کا نعرہ گلی کوچوں میں گونجنے لگا۔میں اس وقت دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔کلاس ہورہی

تھی کہ اچانک سکول پرایک بڑے جلوس نے ہلّہ بول دیا۔بہت دیر تک پتھراؤ ہوتا رہا۔ایک پتھر میرے ماتھے پرلگا اور میں خون میں لت پت ہوگیا۔پولیس کی بھاری نفری مشکل سے اس جلوس کو وہاں سے ہٹانے میں کامیاب ہوئی۔اس واقعہ کا اثر آج تک میرے ذہن پرنقش ہے۔اس دن وہ شعور میرے اندر جاگا کہ مجھے بھی آزادی کے لیے جدوجہداورانگریز کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

اس وقت کمیونسٹ پارٹی پوری طرح برطانوی سامراج کا ساتھ دے رہی تھی۔ایم آرمسانی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ کمیونسٹ ،قومی وعوامی بغاوت کے خلاف ،برطانیہ کی حمایت کررہے تھے۔مزاحمت کرنے والے روپوش لیڈروں کوففتھ کالمسٹ کا نام دے رہے تھےاور جاسوسی کرکے انہیں گرفتار کرارہے تھے---------وہ پولیس کے مخبر بن گئے تھے۔اب کمیونسٹ ہڑتالوں کی بجائے مزدوروں سے زیادہ کام کرنے اور کسانوں سے زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے کہہ رہے تھے۔مسانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس وقت کمیونسٹ پارٹی ملک کے اندر کام کرنے والی سیاسی جماعتوں کے درمیان اختلافات پیدا کرنے کی کوششوں میں مصروف تھی بالخصوص کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان۔تحریکِ پاکستان کی بھی وہ اسی لیے مصلحتاً حمایت کررہے تھے۔اسرارالحق مجاز کا ترانۂ پاکستان بھی اسی زمانے میں لکھا گیا تھا۔کمیونسٹوں نے اس بات کا برملا اعلان کیا کہ سوویٹ روس کی طرح ہندوستان میں بھی ہرلسانی قومیت کوالگ ملک بنانے کا حق ہونا چاہئے۔

۱۹۴۲ء--۱۹۴۵ءتک کمیونسٹوں کی یہی حکمتِ عملی رہی اور برطانوی سامراج کی مدد وحمایت سے وہ ساری سیاسی فضا پرچھائے رہے۔انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن (IPTA) اسی زمانے میں وجود میں آئی۔جو پہلے سے موجود ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کے ساتھ مل کر کام کرنے لگی۔اس عرصے میں کمیونسٹ پارٹی برصغیر کے عوام سے کٹ چکے تھے۔قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے اس امر کے باوجود کہ کمیونسٹ تحریکِ پاکستان کی حمایت کررہے تھے،انہیں اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیا۔پاکستان ٹائمز کے نام سے اخبار نکالنے کا خیال بھی میاں افتخارالدین کواسی زمانے میں آیا۔اس وقت کمیونسٹ پارٹی کوصرف اعلیٰ طبقے کے ان دانشوروں کی حمایت حاصل تھی جن کے لیے خود کوکمیونسٹ کہلوانا ایک نئے فیشن کا درجہ رکھتا تھا۔اخلاق احمد دہلویؔ نے ''یادوں کا سفر'' میں لکھا ہے کہ:

''اس زمانے میں سجاد ظہیر عرف بنّے بھائی نے قائدِ اعظم سے انٹرویو حاصل کیا اور سننے میں آیا کہ سجاد ظہیر صاحب نے قائدِ اعظمؒ سے پاکستان کے اقتصادی مسائل پرگفتگو کی۔گفت وشنید اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ کہا جاتا ہے کہ قائدِ اعظمؒ نے فرمایا کہ ''میں نے آپ کووقت آپ کا نقطۂ نظر سننے کے لیے دیا تھا سووہ میں نے سُن لیا۔'' یہی وہ زمانہ تھا کہ جب فیض احمد فیض برطانوی سامراج کی فوج میں داخل ہوئے اور فوجی وردی میں دلّی کی سڑکوں پرنظر آئے اور یہی وہ زمانہ تھا جب حفیظؔ جالندھری کا یہ گیت سارے برصغیر کی فضاؤں میں گونج رہا تھا:۔

اڑوسن پڑوسن چاہے کچھ کہے، میں تو چھورے کوبھرتی کرا آئی رے ☆☆☆

ڈاکٹر قاضی عابد (ملتان)

قرۃ العین حیدر سے منسوب ایک کتاب

(تحقیقی وتنقیدی جائزہ)

علامہ اقبال کے لائق اور اپنے والد کے بارے میں معروضی اندازِ نظر رکھنے والے فرزند کو اپنے والد کے مداحوں، مجاوروں، پرستاروں حتیٰ کہ عام لوگوں سے بھی گلہ ہے کہ وہ انہیں محض فرزندِ اقبال ہی سمجھتے ہیں اور ان کے شخصی/ ذاتی اوصاف، لیاقت، اہلیت اور علم وفضل کو لائقِ اعتنا نہیں گردانتے۔ یہ سچ ہے کہ کسی بڑے درخت کے نیچے اُگنے والے پودے اس درخت کے حوالے سے ہی پہچانے جاتے ہیں لیکن زندگی کے دیگر مظاہر کی طرح اس کلیے میں بھی استثنائی مثالیں موجود ہیں۔ اُردو ادب میں امتیاز علی تاج اور قرۃ العین حیدر اسی ذیل میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ محمدی بیگم اور مولوی ممتاز علی کے لائق فرزند امتیاز علی تاج نے اُردو ادب میں اپنے کام کی وجہ سے علیحدہ شناخت قائم کی۔ نذر سجاد اور سجاد حیدر کی ہونہار بیٹی قرۃ العین حیدر نے بھی اپنے ادبی کارناموں کی وجہ سے نام کمایا۔

قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول ''کارِ جہاں دراز ہے'' میں اپنے کُنْم قبیلے کی ثقافتی روداد لکھ کر اپنے خاندان کا حق ادا کیا ہے۔ یہ ادبی کارنامہ کسی بھی عالمی فن پارے کے مقابل رکھا جاسکتا ہے (۱)۔ مظفر علی سیّد اور وارث علوی (۲) کو چھوڑ کر اُردو کے تمام ناقدین نے قرۃ العین حیدر کی ادبی خدمات کو اعتبار نقد عطا کیا ہے۔ جب کوئی ادبی شخصیت شہرت عام کے نصف النہار پر ہوتی ہے تو اس سے عجیب وغریب باتیں اور روایتوں منسوب ہوجاتی ہیں۔ لوگ اس کی تخلیقات کے ساتھ کچھ الحاقی چیزیں بھی شامل کر لیتے ہیں یا پھر عام قاری کچھ تخلیقات کو اس بڑے تخلیق کار سے منسوب کر دیتے ہیں۔ اُردو کی شعری روایت میں اس طرح کے دلچسپ قصے بہت زیادہ اور عام ہیں۔ بابا فرید اور امیر خسرو سے بہت کچھ ایسا منسوب ہے جس کے بارے میں ہماری تحقیق کے واضح فیصلے بھی ان چیزوں کے انتساب کو بابا فرید اور امیر خسرو سے دُور نہیں کر سکے۔ عام قاری انہیں ہی ان تخلیقات کا خالق مانتا ہے۔ ولی دکنی سے ایک ایسا سفرِ دلی منسوب ہے جس کے بارے میں ہماری تحقیق ابھی تک گومگو کی کیفیت میں ہے۔ میر تقی میر کے نام کے ساتھ بھی اس معروف غزل کا انتساب ملتا ہے

آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد ـــ نہ رہی دشت میں خالی کوئی جا میرے بعد

تیز رکھیو سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں ـــ شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

غالب کی سوانح میں بھی اس طرح کا ایک واقعہ موجود ہے جو ان کے تخلص کی تبدیلی کا باعث اور محرک بنا۔ کچھ لوگوں نے جان بوجھ کر ان سے کسی اور اسد نامی شاعر کے شعر منسوب کرنے شروع کر دیئے جو بہت لایعنی تھے اور غالب کے مشکل کلام کی طرف طنزیہ رویے کی تشکیل کا باعث بن رہے تھے۔ غالب نے یہ شعر سن کر اپنا تخلص اسد سے غالب کرلیا۔ ذیل کی سطور میں بھی ایک ایسی ہی صورت حال کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

۱۹۸۵ء میں ڈاکٹر ثریا حسین نے ہندوستان سے سجاد حیدر یلدرم کے تراجم اور طبع زاد تحریروں کا ایک انتخاب شائع کیا۔ یہ انتخاب اُتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اس انتخاب کا پیش لفظ پروفیسر محمود الٰہی، صدر شعبۂ اُردو گورکھ پور یونیورسٹی نے لکھا جب کہ ڈاکٹر ثریا حسین نے ''یلدرم اور اُردو افسانہ'' اور قرۃ العین حیدر نے ''داستانِ عہدِ گل'' کے عنوان سے اس انتخاب کے لیے مضمون اور مقدمہ تحریر کیا۔ پروفیسر محمود الٰہی (جو اس وقت اتر پردیش اکادمی کے چیئرمین تھے) نے اس کے پیش لفظ میں تحریر کیا:

> ''پروفیسر ثریا حسین صاحبہ نے بڑی محنت سے یلدرم کی نایاب تحریروں کی جمع آوری کی اور ان کا نمائندہ انتخاب مرتب کیا۔ محترمہ قرۃ العین حیدر نے اس پر مقدمہ کیا لکھا، عہدِ یلدرم اور اس کے پس منظر کو آئینہ کر دیا۔ یہ مقدمہ اپنی جگہ پر خود ایک بڑا کارنامہ ہے جو آج یلدرم کی تفہیم میں اور کل خود مصنفہ کی تعبیر وتفسیر میں معاون ثابت ہوگا۔ اکادمی ان دونوں خواتین کا شکریہ ادا کرتی ہے۔'' (۳)

یہی کتاب ۱۹۹۰ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کی تو اس کے مرتب کے طور پر قرۃ العین حیدر کا نام بیرونی اور اندرونی سرورق پر دیا اور اس امر کا ذکر ہی سرے سے غائب کر دیا گیا کہ یہ کتاب ڈاکٹر ثریا حسین (سابق صدر شعبۂ اُردو، علی گڑھ یونیورسٹی) کی مرتبہ ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا سہواً ہوا ہو لیکن غالب گمان یہی ہے کہ کتاب کے مرتب کے طور پر قرۃ العین حیدر کا نام ان کی ادبی وعلمی شہرت کی وجہ سے دیا گیا ہے۔ پاکستان میں اس کتاب کی اشاعت کے چودہ برس بعد تک بھی کسی محقق نے اس طرف توجہ مبذول نہیں کرائی۔ پاکستان کی ادبی دُنیا یا تو اس معاملے سے لاعلم ہے یا پھر نہ معلوم وجوہات کی بنیاد پر خاموش ہے۔ اس کتاب کا قرۃ العین حیدر سے منسوب ہونا اس حد تک درست تسلیم کرلیا گیا ہے کہ قرۃ العین حیدر کی شخصیت اور فن پر ملتان سے شائع ہونے والی شاندار کتاب ''قرۃ العین حیدر۔ خصوصی مطالعہ'' میں محترمہ زرغونہ کنول نے قرۃ العین حیدر کے کوائف نامے میں

اس کتاب کوانہی کی تصنیفات میں شمار کیا ہے۔(۴)

سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کے کارپردازان کی ذمہ داری ہے کہ اگلے ایڈیشن میں ڈاکٹر ثریا حسین کا نام ہی بطور مرتب کے شائع کریں۔قرۃ العین حیدر بلا شبہ ایک اعلیٰ درجے کی تخلیق کار ہیں۔انہوں نے انگریزی سے اُردو، اُردو سے انگریزی اور فارسی سے انگریزی میں تراجم بھی کیے ہیں لیکن انہوں نے زندگی میں کبھی بھی تحقیق وتدوین کا کام اس طور پر نہیں کیا جس طرح سے یہ کتاب پاکستان میں ان کے نام سے شائع کردی گئی ہے۔

اب آیئے ذرا دو ایک باتیں اس کتاب کی اہمیت کے حوالے سے کرتے ہیں۔اس کتاب کی سب سے بڑی اہمیت تو یہ ہے کہ ''خیالستان'' اور ''حکایات واحتساسات'' کے علاوہ یلدرم کی چیزیں عام قاری تو ایک طرف محققین کی رسائی سے بھی دُور تھیں۔ڈاکٹر ثریا حسین کے اس انتخاب سے یلدرم کی کچھ چیزیں مدون ہوکر منظرِ عام پر آگئیں یوں ہماری تنقید اب یلدرم، ان کی تخلیقات،فکر اور اُسلوب کے حوالے سے بہتر طور پر محاکمہ کرسکنے کی اہل ہوگی۔

کتاب کی فاضل مرتب نے اپنے مقدمے ''یلدرم اور اُردو افسانہ'' کا آغاز جس گلہ مندی سے کیا ہے (''سید سجاد حیدر یلدرم،ص۷) یہ کتاب اس کا کفارہ قرار دی جاسکتی ہے۔ڈاکٹر ثریا حسین نے یلدرم کی کل ۶۲ طبع زاد تخلیقات اور تراجم کا تذکرہ کیا ہے لیکن اس انتخاب میں انہوں نے ۱۴ افسانے،مضامین اور تراجم شامل کیے ہیں جب کہ دوترکی ڈراموں ایک ناولٹ کے تراجم کو ان صفحات میں جگہ دی ہے۔

ڈاکٹر ثریا حسین نے اپنے فاضلانہ مضمون میں یلدرم کے حوالے سے بے حد اہم باتیں کی ہیں۔ ہمارے ہاں رومانویت کو محض محبت کے نغموں اور ایک خاص جمالیاتی لے کے حامل اُسلوب تک محدود سمجھا جاتا ہے اور رومانوی ادیبوں کو زندگی سے دُوری رکھنے والے عینیت پسند لیکھک قرار دیا جاتا ہے۔رومانوی تخلیق کار کے موجود سے غیر مطمئن رویے اور تبدیلی کی خواہش کی عینی تشکیل کو فراموش کردیا جاتا ہے جو بنیادی طور پر باغیانہ رویے کی حامل ہوتی ہے۔یلدرم جس نئی سماجی تشکیل اور نئے عمرانی معاہدے کے خواب دیکھتا اور دکھاتا ہے وہ برصغیر کے معاشرے میں مرد اور عورت کے رشتہ کی اس صورت حال کے خلاف احتجاج ہے جس میں ستی کی رسم کی انتہا اور پردے کی وہ شکل بگاڑ کے سبب کے طور پر موجود تھی جسے سید سلیمان ندوی نے مذہبی نہیں بلکہ رواجی قرار دیا ہے۔جس معاشرے میں عورت کو ایک مرد کے لیے جل مرنے یا پھر ایک مرد کی خاطر ساری زندگی اپنے آپ کو تین گز کپڑے میں چھپا کر رکھنے کو مذہب کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہو وہاں تخلیق کار کا کسی عینی دنیا کو تخلیق کرنا بلا جواز نہیں ہوتا۔یلدرم کی کہانیوں کی یہ مثالی ترکیب ہماری عملی زندگی سے ضرور دُور ہے لیکن ہماری ذہنی زندگی اور خوابوں سے دُور نہیں ہے، ڈاکٹر ثریا حسین نے بجا طور پر کہا ہے کہ

''یلدرم کو مکمل طور پر رومانی ادیب اور ''فن برائے فن''

کے نظریے کا پرستار بھی نہیں کہا جاسکتا۔ان کے سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں لکھے ہوئے مقالوں سے ان کے حیرت انگیز طور پر وسیع مطالعے اور وسیع النظری کا اندازہ ہوتا ہے اور دورِ طالب علمی کے فوراً بعد کے تخلیقی تراجم طبع زاد انشائیوں، افسانوں اور نظموں میں ایک ترقی پسند سیاسی اور سماجی شعور واضح طور پر نظر آتا ہے۔وہ جاپان کی فتح پر اپنی نظم (مخزن ۱۹۰۵ء) پر خوشی کے شادیانے بجاتے ہیں۔''نوجوان ترکوں'' اور ہندوستان کی سیاسی تحریکوں سے ذہنی اور درپردہ عملی وابستگی، پردے کی شدید مخالفت تعلیم نسواں کی پُرجوش عملی حمایت، مسلم معاشرے میں انقلابی قسم کی سماجی اور دینی اصلاحات، اُردو ٹائپ کی ترویج، نظم و نثر میں نئے تجربات کے لیے بذریعہ تقریر و تحریر مسلسل جدوجہد یلدرم کو کسی طرح بھی ایک فرار پرست رومینٹک ثابت نہیں کرتے۔یلدرم علی گڑھ کے شیدائی تھے لیکن حسرت موہانی کی گرفتاری کے متعلق مضمون میں جو اُنہوں نے ''خانی خان'' کے فرضی نام سے لکھا (اور جو زمانہ کانپور دسمبر ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا) انہوں نے علی گڑھ کو ''وفاداری کا گوسالہ'' قرار دیا۔''

(۵)

یلدرم کی بعض تخلیقات (خاص طور پر خیالستان اور حکایات واحتساسات) کے حوالے سے ہماری تحقیق ابھی تک اس بات کا جواب نہیں دے پائی کہ آیا یہ محض تراجم ہیں یا یہ ان کی طبع زاد تخلیقات ہیں یا پھر ان کے کچھ حصے ترجمہ ہیں اور کچھ حصے طبع زاد۔ڈاکٹر ایرکن ترکمان کی فاضلانہ مساعی کے باوجود ابھی بہت کچھ ایسا ہے کہ جس کے بارے میں فیصلہ ہونا باقی ہے۔ڈاکٹر ثریا حسین نے اپنے اس مضمون میں داخلی شہادتوں کو بنیاد بناتے ہوئے یلدرم کے ہاں طبع زاد تخلیق اور ترجمے کے فرق کو سمجھنے کی ایک کسوٹی بنائی ہے۔یہ یلدرم کی تخلیقات کی تفہیم کا ایک انوکھا اور نادر زاویہ قرار دیا جاسکتا ہے:

''چڑیا چڑے کی کہانی تمثیلی اور حکایۂ لیلیٰ و مجنوں سماجی

طنزیے ''احمد۔ علی گڑھ کا قصہ'' سمیت ان تمام طبع زاد افسانوں کا اسٹائل رومانی ادب لطیف سے قطعاً مختلف ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یلدرم دو طرح کی نثر لکھ رہے تھے۔ سیدھی سادی بیانیہ جوان کی طبع زاد کہانیوں میں ملتی ہے اور رومانی جذبات نگاری جو انہوں نے عصری ترکی ادب سے حاصل کی تھی۔''(۶)

ڈاکٹر ثریا حسین نے اس فکر انگیز لیکن مختصر مضمون میں ایک اور تحقیقی فروگذاشت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور تحقیقی دیانت کے ساتھ:

''رپورتاژ ایک فرانسیسی لفظ ہے اور چند سال سے اُردو میں مستعمل ہو چکا ہے۔ رپورتاژ میں رپورٹر بیرونی حقائق کے ساتھ ساتھ ادبی رنگ میں اپنے ذاتی تاثرات بھی پیش کرتا ہے جب کہ رپورٹ یا سفرنامہ محض حقائق پر مشتمل ہوتا ہے۔ چند سال قبل ایک اُردو روزنامے میں شعبۂ اُردو الٰہ آباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر رفیق حسین نے لکھا تھا کہ گو کرشن چندر کے ''پودے'' کو اُردو کا پہلا رپورتاژ کہا جاتا ہے لیکن یلدرم کے ''سفرِ بغداد'' کو جو ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا اُردو کا اولین رپورتاژ کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ ''زیارت قاہرہ و قسطنطنیہ'' (۱۹۱۱ء) یلدرم کا دوسرا ''رپورتاژ'' تھا۔''(۷)

یوں ہم سجاد حیدر یلدرم کے ایک اور ادبی امتیاز سے آشنا ہوتے ہیں۔ ہمیں اس تحقیقی پیش رفت کے لیے ڈاکٹر ثریا حسین کا ممنون ہونا چاہیے۔

اس انتخاب کی دوسری اہم بات قرۃ العین حیدر کا مقدمہ بعنوان ''داستانِ عہدِ گل'' ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے باپ پر بہت لکھا ہے اور بڑی محبت لیکن تنقیدی دیانت کے ساتھ۔ یہ مقدمہ پانچ حوالوں سے اہم ہے۔

(الف) اُردو افسانے کے آغاز کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ اپنے والد کے حوالے سے جذباتی نہیں ہوئیں بلکہ انہوں نے اُردو ادب کی تاریخ کے ایک دور اور ایک صنف کے حوالے سے پھیلی ہوئی دھند کو صاف کرنے کی کوشش

کی ہے۔

''اواخر انیسویں صدی سے ''ایسے'' اور ''اسکیچ'' اُردو میں مقبول ہو چکے تھے۔ منشی سجاد حسین، منشی جوالا پرشاد برق، مرزا مچھو بیگ ظریف، نواب سید محمد آزاد اور علی محمود شمسی کے خاکوں نے مختصر افسانے کا بیج بو دیا تھا۔ اُردوئے معلّٰی ۱۹۰۳ء میں ''سلسلہ افسانہ ہائے مختصر و مکمل'' از ''شاہد''، ''حرماں نصیب'' از ''شاہد'' اور ''غریب الوطن'' از ''مانی'' موجود ہیں۔ نہ معلوم یہ کون صاحبان تھے۔ مخزن دسمبر ۱۹۰۳ء میں راشد الخیری (جو اس وقت تک منازل السائرہ لکھ چکے تھے) کا ''نصیر اور خدیجہ'' شائع ہوا جس میں دلّی کی بیگماتی زبان میں خدیجہ اپنے بھائی نصیر سے ایک بے ساختہ سے خط کے ذریعے بھائی کی کنبے کی طرف سے لاپروائی کا گلہ شکوہ کرتی ہے ''نصیر اور خدیجہ'' میں یقیناً مختصر افسانے کی جھلک موجود ہے۔''(۸)

(ب) ہماری تحقیق و تنقید چند استثنائی مثالوں کو چھوڑ کر سرسید احمد خان اور ان کی تحریک کے حوالے سے توازن کی حامل نہیں ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اس دیباچے میں کچھ ایسے اشارے کیے ہیں جو سرسید تحریک کی متوازن تفہیم میں ہماری معاونت کر سکتے ہیں۔ ہم ایک ایسے معاشرے کا حصہ ہیں جہاں اکیسویں صدی کے آغاز میں بھی اس طرح کے مضامین لکھے جا رہے ہیں کہ سرسید غدار تھے یا محبّ وطن۔ ایسی صورت حال میں ان تنقیدی اشاروں کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اقتباسات طویل ہیں لیکن اوپر دیئے گئے موقف کی وضاحت کے لیے ناگزیر ہیں۔

''۱۸۵۷ء ہمارے لیے ہر لحاظ سے ایک زبردست واٹرشیڈ ہے اس ہنگامے کے متعلق ڈپٹی نذیر احمد گواہ ہیں کہ جنگ آزادی کے ایک قائد نواب بہادر خاں سیروں زیورات سے لدے دولہا بنے گھوڑے پر سوار دلّی کی دوکانیں لوٹتے پھر رہے تھے۔

ہم سرسیّد کی بے پناہ وفاداری اور

انگریز پرستی سے ذرا جھینپتے ہیں مگر ایام غدر میں ''باغیوں''
کی افراتفری، نفاق، پسماندگی خود غرضی اور جہالت کے
جو نظارے انہوں نے دیکھے تھے ان کے مقابلے میں صف
آرا صاحبان فرنگ کی فتح سے سرسید کا متاثر ہونا لازمی تھا۔
۱۲۲۴ء میں فریڈرک دوئم نے یونیورسٹی
آف نیپلز اس لیے قائم کی تھی کہ عرب سائنس و فلسفہ
اطالیہ میں پھیل سکے۔
۱۸۷۷ء میں سرسید احمد خاں نے اوکسفرڈ
کے نمونے پر (جہاں سے طلباء چھ سو سال قبل بغرض اعلیٰ
تعلیم اندلس جایا کرتے تے) ایم اے او کالج قائم کیا
تا کہ مغربی سائنس و فلسفہ ہندی مسلمانوں میں پھیل
سکے۔ انگلش لنگویج اینڈ لٹریچر کے نمونے پر سلیس اُردو اور
''نیچرل'' شاعری، توہمات اور بدعتوں میں مبتلا قوم کے
لیے اسلام کی نئی سائنٹفک توجیہہ اور نئی مسلم مڈل کلاس
کے لیے اخلاقی و اصلاحی ''ناول'' ''آرٹیکل'' اور ''ایسے''
(لفظ ''شارٹ اسٹوری'' ابھی مستعمل نہ ہوا تھا۔)
اب مرزا غالبؔ کی عظمت یہ ہے کہ
انگریزی سے نابلد ہوتے ہوئے بھی وہ ہمارے پہلے
Modern Man ہیں اور سرسید ہمارے Renaissance
Man مصلح، صحافی، ادیب، عالم دین، انسان دوست کرم
یوگی۔'' (۹)

''انگریز سارے ایشیائیوں سارے مسلمانوں کو وحشی
اور کمتر سمجھتا تھا۔ اب دیکھئے کہ سرسید کس شدید جذباتی
اور ذہنی کشمکش سے دوچار رہے ہوں گے۔ وہی انگریز
جس کے وہ اتنے مداح ہیں وہ اُٹھتے بیٹھتے ہندوستانیوں

کی تحقیر کرتا ہے۔ انگریز مشنری اور مورخ اسلام اور
پیغمبر اسلام کے خلاف زہر افشانی میں مصروف ہے۔
سرسید لندن سے اپنے گھر خط لکھتے ہیں میرے برتن
فروخت کر کے روپیہ بھیجو تا کہ لندن میں مزید قیام کر کے
ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھ سکوں۔ اس وقت ساری
دنیا میں محض ایک مسلم قوم باقی رہ گئی ہے۔ سر بلند آزاد۔
ایک وسیع سلطنت کی مالک۔ جو پانچ سو سال سے ان
کمینی گوری اقوام پر حکومت کر رہی ہے۔ عثمانی ترک!
چنانچہ سرسیّد کے سامنے اب دو آئیڈیل ہیں۔ برطانیہ اور
ترکی۔'' (۱۰)

(ج) یلدرم کا زمانہ ادبی حوالے سے ہماری نئی روایت کا تشکیلی دَور ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب پیرویٔ مغرب اور مشرق کی بازیافت کے درمیان ایک عجیب وغریب کش مکش موجود تھی۔ یہ ایک ایسا زمانہ تھا جہاں ایک طرف مغرب کی طرف سے عقلیت پسندی اور رومانویت ادبی رجحانات کے طور ہماری ادبی روایت کو متاثر کر رہی تھی تو دوسری طرف رینالڈ وغیرہ کے ناول کے تراجم ہو رہے تھے جنہوں نے آگے بڑھ کر عبدالحلیم شرر، قیسی رام پوری، رئیس احمد جعفری اور نسیم حجازی پیدا کرنے تھے۔ یوں ناول کی صنف اور تاریخ دونوں پر اپنے منفی اثرات یوں مرتب کرنے تھے کہ ایک طرف تو اُردو میں کوئی بڑا تاریخی ناول نہ لکھا جا سکا اور دوسری طرف خود تاریخ کو ایک علم کے طور پر مسخ کرنے کا عمل بھی ہمارے معاشرے میں رواج پانے لگا۔ قرۃ العین حیدر نے اس تشکیلی دَور کا تجزیہ معروضی انداز میں کیا ہے۔

''وہ تشکیلی دَور اُردو ادب کا عہد گل تھا، جب نوجوان اہل
قلم، شاعر، افسانہ نویس، مضمون نگار اور ادبی رسالوں
کے مدیر اُردو لٹریچر کی ترقی کی مساعی کو قومی اور تہذیبی
فریضہ جانتے تھے۔ نئے اسالیب ادب سرسید اور
مولانا حالی کے مشن کی توسیع بھی تھے اور مغرب کی نت نئی
ایجادوں کی طرح تازہ اور انوکھے انکشاف بھی نئے ادبی
تجربے وہ خود بھی کر رہے تھے اور مغرب سے بھی اخذ
کرنے میں مصروف تھے۔ گویا اپنے گپتا، ایرانی، مغل

راجپوت مجسموں، تصویروں اور ظروف کے گرد آلود گودام
میں موجود مغرب کی سمت دریچے وا کر کے تازہ دم ہونے
کے بعد اپنے ذخیرے کی جھاڑ پونچھ کر رہے تھے اور
ولایتی فن پاروں کو بھی اپنے سامنے رکھنے میں مصروف
تھے۔'' (ص۲۳) (۱۱)

''اُردو میں سراج الدولہ یا ٹیپو یا حافظ رحمت خاں یا نواب
حضرت محل یا بہادر شاہ ظفر کے متعلق ناول لکھنے کی کس
میں ہمت تھی۔ چنانچہ شرر نے ایسے اسلامی تاریخی ناول
لکھے جن کا اپنے عہد کی تاریخ سے کوئی واسطہ نہ تھا۔
رومینٹک آئیڈیلزم قومی احیاء کا ایک لازمی عنصر ہے
کولونیل مشرق میں یہ رومانویت آئرش نیشنلزم کی طرح
قوم پرستی کے محرکات میں شامل ہوئی لیکن ادب میں بھی
ہندو اور مسلم احیاء کا باہم تصادم ناگزیر تھا۔ چنانچہ ایک
طرف شرر کے ناول تھے دوسری طرف بنکم چندر چٹر جی کا
''آنند مٹھ'' جو بنگالی قوم پرستوں کی بائبل بنا، مسلمان اس
سے اتنی ہی خفا ہوئے۔ سرکار انگلیشیہ سے وفاداری کی
صورت حال یہ تھی سرشار کے ہیرو آزاد پاشا ترکوں کی
حمایت میں روسیوں سے لڑ کر آتے ہیں تو بطور ایک
''لائل'' جانباز افغانوں سے لڑنے چل دیتے ہیں۔
''آنند مٹھ'' کے خالق بنگال میں ڈپٹی مجسٹریٹ کا عہدہ
سنبھالے رہے۔ اسی دَور میں محمد حسین آزاد، شرر، ریاض
خیر آبادی اور میر ناصر علی نے رنگین نثر اور تخیلی انشا پردازی
کو فروغ دیا۔'' (۱۲)

(د) اُردو فکشن کی روایت میں سجاد حیدر یلدرم کا کیا مقام ہے، اُردو تنقید اس حوالے سے کوئی خاطر خواہ فیصلہ نہیں کر سکی، وہ ابھی تک یہ طے کرنے میں مصروف ہے کہ آیا یلدرم نے طبع زاد افسانے لکھے بھی ہیں یا وہ محض

ایک مترجم ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پطرس بخاری، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر سید معین الرحمان اور ڈاکٹر انوار احمد کے مضامین/ کتب اور مبارز الدین رفعت کی مرتب کردہ کتاب اور پگڈنڈی یلدرم نمبر یلدرم کی افسانہ نگاری کے حوالے سے اہم ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شمس الرحمان فاروقی اور محمد حسن عسکری جیسے ناقدین نے اپنے مضامین میں یلدرم سے انصاف نہیں کیا۔ قرۃ العین حیدر نے اُردو ادب میں یلدرم کے مقام کے حوالے سے کارآمد بحث کی ہے اور ان پر ترکی ادیبوں کے اثرات کے ساتھ ساتھ انہوں نے یلدرم کی رومانویت سے وابستگی کے اسباب کا تعین بھی کیا ہے، ایک مختصر اقتباس دیکھئے:

''اُردو والے Superlatives استعمال کرنے کے بے حد
عادی ہیں۔ یلدرم یا کسی اور قابل ذکر ادیب کو اُردو کا
''عظیم ترین مضمون نگار'' یا کسی افسانہ نگار کو ''عظیم ترین
افسانہ نگار'' یا ناول نویس قرار دینے میں مجھے تامل ہوگا
لیکن یقیناً سر سیّد کے خشک عقلیت پرستی کے ردعمل کے طور
پر ہی رومانیت ظہور پذیر ہوئی۔'' (۱۳)

(ہ) قرۃ العین حیدر نے اپنے اس مقدمے میں مغرب اور مشرق کے تہذیبی لین دین کے حوالے سے بصیرت افروز نکتے اُٹھائے ہیں۔ ایڈورڈ سعید اور ہومی۔ کے۔ بھابھا کے زیر اثر اُردو تنقید میں مابعد نوآبادیاتی رویے کو فروغ حاصل ہوا۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی اور ڈاکٹر سید محمد عقیل نے اس تناظر میں اہم کام کیا لیکن اس سے پہلے محمد حسن عسکری، سلیم احمد، فتح محمد ملک وغیرہ مغرب کے زیر اثر تخلیق ہونے والے ذہنی اور ادبی رویوں پر سوالیہ نشان قائم کر چکے تھے۔ قرۃ العین حیدر کے ہاں وہ شدت پسندی اور ردعمل نہیں ہے جو کہ محمد حسن عسکری، سلیم احمد کی تحریروں کا طرۂ امتیاز ہے بلکہ انہوں نے نسبتاً معروضی انداز میں مغرب اور مشرق کے تہذیبی اور ادبی رشتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ نہ تو بے جا طور پر مغرب سے مرعوب ہوئی ہیں اور نہ ہی انہوں نے مشرق کے نام نہاد تفوق کی بات کی ہے، انہوں نے واضح کیا ہے کہ جدید ہندی تہذیب مغربی تہذیب اور ہندوستان کی تہذیبی تجدیدیت کا امتزاجی روپ ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ مغرب مشرق کی طرف دیکھتا تھا لیکن مشرق کی تہذیب کے زوال کے بعد یہ صورت حال تبدیل ہوگئی۔ نئی صورت حال کے تقاضے اور طرح کے تھے جس سے نبرد آزما ہونے کے لیے نئی حکمت عملی کی ضرورت تھی۔

''آج جب کہ ہماری طرز رہائش، ادبیات بول چال کی
زبان افکار و خیالات، حرکات و سکنات تک پر مغرب کی
اتنی گہری چھاپ پڑ چکی ہے کہ ہم کو فرزندانِ تثلیث کے

اس عمیق نفسیاتی تصرف کا اس وقت بھی اندازہ یا احساس
نہیں ہوتا جب ہم نیشنلزم یا حالیہ ''اسلامی تجدیدیت اور
بنیاد پرستی'' کے زیر اثر مغربیت سے خود کو آزاد کرانے کی
سعی میں جدید علوم و اصطلاحات اور ذرائع ابلاغ بھی
مغربی ہی استعمال کرتے ہیں۔'' (۱۴)

''کیا مشرقی ذہن واقعی اوریجنل نہیں رہا تھا؟ یہاں
اُردو ادب کی بات کی جا رہی ہے اور اس سلسلے میں چند
تاریخی حقائق پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ قوموں کے
عروج و زوال کا اثر مجموعی طور پر ان کے شعر و ادب پر
منعکس ہوتا ہے۔ سب رس ۱۶۳۸ء میں لکھی گئی تھی
پلگرمز پروگریس ۱۶۷۸ء میں لیکن پادری جان بنین نے
بے چارے ملّا وجہی کو مار گرایا لہٰذا دیکھئے انگریزی فکشن
وہاں جا پہنچا جہاں وہ ہے اور اُردو جہاں وہ ہے۔ فارسی
شاعری چاسر سے بہت قبل عروج پر پہنچ چکی تھی لیکن جدید
عالمی ادبی اٹیلس پر چاسر کے ہم قوم وہم زبان چھائے
ہوئے ہیں۔'' (۱۵)

مشرق آخر زوال کے اس لمحے کی گرفت میں کیوں کر آیا، قرۃ العین نے اس سوال کا بھی سنجیدگی کے ساتھ تجزیہ کرنے کی سعی کی ہے۔

''ہم لوگ انیسویں صدی میں برطانیہ کی سیاسی تہذیبی اور
ذہنی یلغار کا مقابلہ نہ کر سکے کیونکہ ہمارے ہاں آٹھ سو
سال قبل باب اجتہاد بند کیا جا چکا تھا۔ حالانکہ عالم اسلام
ہی۔۔۔ ذہنی اقتصادی اشتراکی تصورات و نظریات کا
اولین گہوارہ رہ چکا تھا۔ یورپ کے سیاسی اور ذہنی
انقلابات سے صدیوں قبل عراق و ایران میں وہ حیرت
انگیز اشتراکی اور علمی تحریکیں ابھریں جن کو ''مزدکی'' اور

''زندیقی'' اور ''مرتدانہ'' قرار دے کر کچلا گیا۔ صوفیائے
کرام نے ایک طرف Establishment کے خلاف آواز
بلند کی دوسری طرف انہوں نے فرائیڈ اور ینگ سے
سینکڑوں برس قبل نفسیات کے رموز آشکار کیے۔ فارسی
شاعری میں ''رندو میخانہ'' آزادی و افکار کے اور ''شیخ و
محتسب'' تنگ نظری کے سمبل بنے لیکن تنگ نظری کے
خلاف اصل اور دُوررَس جیت اہل یورپ کی
ہوئی۔'' (۱۶)

انہوں نے ان اُصولوں کا ادبی صورت حال پر بھی انطباق کیا ہے اور خوب کیا ہے۔

''بات پھر وہیں قوموں کے عروج و زوال تک پہنچتی
ہے۔ شیکسپیئر کو انگلستان کا کالی داس کیوں نہ کہا گیا۔
شیکسپیئرین ڈراموں کو دیسی جامہ پہنانے والے آغا حشر
کاشمیری نہایت فخر سے ''انڈین شیکسپیئر'' کیوں کہلائے۔
سنسکرت ناٹک کی جنم بھومی میں آج ڈرامہ نگاری اس
قدر کمزور اور پھسپھسی کیوں ہے؟ مہابھارت، جاتک،
پُرانوں، الف لیلہ فارسی حکایات داستانوں اور ''گنجی کی
کہانی'' وغیرہ وغیرہ کی سرزمین مشرق میں ''ناول'' اور
''افسانہ'' مغرب سے کیوں آیا۔ یہیں سے کیوں نہ اُگا؟
جب کہ اطالوی نوویلا کے اصل جنم داتا مُورش اسپین کے
قصے تھے۔'' (۱۷)

اب کچھ باتیں خود اس انتخاب کے حوالے سے بھی ضروری ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر ثریا حسین نے یلدرم کی کل ۶۴ طبع زاد تخلیقات (افسانے، مضامین اور تقاریر) اور تراجم کی فہرست دی ہے۔ اس فہرست میں ان کے افسانوی مجموعے ''خیالستان'' اور ''حکایات واحتساسات'' بھی شامل ہیں جنہوں نے ان تخلیقات و تراجم میں سے ۳۸ کو اپنے اندر سمویا ہوا ہے۔ خیالستان میں کل ۱۳ افسانے اور مضامین جب کہ حکایات واحتساسات میں تیرہ افسانے اور بارہ مضامین شامل ہیں۔ ''مرزا پھویا کی یاد میں'' کا ذکر فاضل مرتب نے نہیں کیا۔ ممکن ہے کہ سجاد حیدر یلدرم کی کچھ اور منظومات بھی ہوں لیکن وہ سامنے نہ آ سکی ہوں۔ یہ ایک عمدہ انتخاب ہے اور

سجاد حیدر یلدرم کی اُن تخلیقات کو ہمارے سامنے لاتا ہے جو زیادہ تر ان کے دو افسانوی مجموعوں میں شامل نہیں ہیں۔
یہ انتخاب دو حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصے میں کل چودہ مضامین، افسانے، رپورتاژ اور تراجم شامل ہیں۔

دوسرے حصے میں دو ترکی ڈراموں اور ایک ناولٹ (آسیب الفت) کا ترجمہ شامل ہے۔ جلال الدین خوارزم شاہ، نامق کمال کا طویل ڈرامہ ہے جب کہ ''پرانا خواب'' کے مصنف کے بارے میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اسی طرح آسیب الفت کے اصل مصنف کے بارے میں یلدرم نے کچھ نہیں بتایا۔ ڈاکٹر ثریا حسین نے اس ضمن میں لکھا ہے کہ

> ''آسیب الفت (۱۹۱۹ء) پر مصنف کا نام درج نہیں مختصر پیش لفظ میں بھی یلدرم نے اصل مصنف کا کوئی ذکر نہیں کیا۔''
>
> ''بیسویں صدی کے تذکرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دبستان ثروت وفنون کے کسی ادیب کی تصنیف بھی نہیں شعبۂ ویسٹ ایشین اسٹڈیز (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے کتب خانے میں باوجود تلاش بسیار اس پلاٹ کے کسی ناولٹ یا اس کے مصنف کا کچھ اتہ پتہ نہ مل سکا۔''(۱۸)

''جلال الدین خوارزم شاہ'' کے حوالے سے ڈاکٹر ثریا حسین لکھتی ہیں:

> ''جدید ترکی ادب کے باوا آدم نامق کمال نے یہ ڈرامہ ۱۸۷۵ء میں اس وقت لکھا تھا جب طاقت ور روس انحطاط پذیر دولت عثمانیہ کے صوبجات پر قبضہ کرتا جا رہا تھا۔ عالم اسلام پر چنگیز خاں کے حملے اور مسلمان فرمانرواؤں کے باہم نفاق سے پیدا کردہ حالات کی اس خوں چکاں داستان میں نامق کمال کا ہیرو جلال الدین خوارزم شاہ ایک Colossus کی طرح اسٹیج پر نمودار ہوتا ہے اور جواں مردی سے تاتاریوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک مسلمان کے ہاتھوں ہی شہید ہوتا ہے۔ انیسویں صدی میں مشرق بالخصوص ترکی کا جو حال زار تھا اس میں اور سات سو سال قبل کی اس حالت میں زیادہ فرق نہ تھا۔

> مرّوجہ وکٹورین میلوڈرامہ سے مختلف اور یونانی اور شیکسپیرین المیے کی سطح کے اس ڈرامے نے ترکوں میں وطن پرستی کی نئی روح پھونکی اور مصطفےٰ کمال اور ان کے ساتھیوں کو نیا عزم وولولہ بخشا۔''(۱۹)

''آسیبِ اُلفت'' ایک علامتی ناولٹ ہے جسے پڑھ کر گمان ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں کا اُردو کا علامت نگار یہ ناولٹ لکھ رہا ہے۔ کچھ حصے دیکھیے

> ''ہوا پتوں کو ڈرا کر پریشان کر رہی ہے۔ میدان کے درختوں میں، ایک وہم انگیز حرکت پیدا ہوتی ہے۔ سفید لباس والی عورت، اپنا سوکھا ہاتھ، اپنے چمکدار، شعلہ بار بالوں پر پھراتی ہے اس کی آنکھوں کی چمک، اس لیے مدہم تھی کہ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں لیکن اس کے دانت بات کرنے میں بجلیاں گرا رہے تھے اور وہ گہری آواز سے، جو بہت دُور سے آتی معلوم ہوتی تھی، اپنی سرگزشت کہہ رہی تھی۔''(۲۰)
>
> ''سفید لباس والی عورت، تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاتی ہے۔ ہوا میں زور پیدا ہوتا جاتا ہے۔ رات کی مبہم و غیر معین ہلکی ہلکی آوازیں آتی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے رات ہونٹ بند کیے کراہ رہی ہے۔ پتوں میں حرکت بند ہے۔ سفید لباس والی عورت ایک ایسی آواز ہے جو اس رات کے شایان ہے، جو اس رات کی وحشت کو پورا کرتی ہے، تاریکیوں میں سے کہہ رہی ہے۔'' (ص ۴۸۵)
> (۲۱)

یہ انتخاب جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے صرف اسی وجہ سے ممتاز نہیں کہ اس میں یلدرم کی بعض بھولی بسری تحریریں یک جا کر دی گئی ہیں بلکہ اسے قرۃ العین کے مقدمے اور فاضل مرتب کے تفصیلی تحقیقی وتنقیدی مقدمے نے بامعنی بنا دیا ہے۔ یہ دو مضامین تفہیم یلدرم کے حوالے سے بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے پاکستان میں اس کتاب کی جب بھی مکرر اشاعت ہو اس پر مرتب کے طور پر ڈاکٹر ثریا حسین کا نام درج ہونا

ضروری ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ قرۃ العین حیدر کے اکثر ناقدین اس امر پر متفق ہیں۔خود انہوں نے اپنے اس ناول کے دیباچے میں اس ناول کی تخلیق کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''اس نوع کی درجنوں تازہ ترین کتابیں ہر مہینے انگلستان اور امریکہ میں چھپ رہی ہیں۔اجتماعی ناول رائٹرز نوٹ بک اور فیملی ساگا ان کے علاوہ ہمارے ہاں ان اصنافِ ادب پر بہت کم توجہ دی گئی ہے، بالخصوص فیملی ساگا آج کل انگلستان میں ازحد مقبول ہیں کیونکہ وہاں فیملی ختم ہوچکی ہے۔ہان سویان انقلاب سے پہلے کے اپنے چینی مشترکہ خاندان کا نقشہ کھینچ چکیں۔امریکہ میں اشکنازی یہودی کنبوں کے قصوں کا زور ہے۔اشکنازی یہودی اور اینگلوسیکسن مسیحی دونوں متوازی سماج اپنی اپنی کھوج میں مصروف ہیں۔ بازیافت کی یہ کوشش جب معاشرہ متزلزل ہو زیادہ تندہی سے کی جاتی ہے۔

ذاتی طور پر میرا بیشتر ادب پروستین Re Cherche Du Temps Perdu گمشدہ زمانوں کی تلاش پر مبنی ہے۔

جوں جوں یہ کہانی آگے بڑھتی گئی اس نے میرے لیے ایک ادبی ایڈونچر کی صورت اختیار کرلی۔ عرصہ ہوا جب رالف رسل نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے ایک ''لائف اینڈ ٹائمز''قسم کی چیز لکھنا چاہیے۔اس وقت اس کتاب کا کوئی تصور میرے ذہن میں نہ آیا تھا۔لیکن جب لکھنے بیٹھئے تو تکنیک اور صنفِ ادب آپ سے آپ بن جاتی ہے اور حقیقت افسانے سے عجیب تر ہے۔ چنانچہ ایک ''سوانحی ناول''۔''

(کارِ جہاں دراز ہے،
دیباچہ،ص۳۷،مکتبہ اُردوادب،لاہور)

۲۔ دیکھئے تنقید کی آزادی از مظفر علی سید اور کچھ بچایا لایا ہوں از وارث علوی۔

۳۔ محمود الٰہی، پیش لفظ، مشمولہ انتخاب سجاد حیدر یلدرم، مرتبہ ڈاکٹر ثریا حسین، لکھنؤ، اترپردیش اُردو اکیڈمی اکادمی، ۱۹۸۵ء، ص۶۔

۴۔ زرغونہ کنول، قرۃ العین حیدر (کوائف نامہ)، مشمولہ قرۃ العین حیدر-خصوصی مطالعہ، مرتبہ سید عامر سہیل ودیگر، ملتان، بیکن بکس،۲۰۰۳ء، ص۱۶۔

۵۔ ڈاکٹر ثریا حسین، ص۸۔

۶۔ ایضاً ص۱۵،۱۶۔ ۷۔ ایضاً ص۲۰،۲۱۔

۸۔ ایضاً ص۵۵۔ ۹۔ ایضاً ص۳۲،۳۳۔

۱۰۔ ایضاً ص۳۶،۳۵۔ ۱۱۔ ایضاً ص۲۳۔

۱۲۔ ایضاً ص۴۵،۴۶۔ ۱۳۔ ایضاً ص۵۷۔

۱۴۔ ایضاً ص۲۴۔ ۱۵۔ ایضاً ص۲۵۔

۱۶۔ ایضاً ص۲۶۔ ۱۷۔ ایضاً ص۲۷،۲۸۔

۱۸۔ ایضاً ص۱۸۔ ۱۹۔ ایضاً ص۱۷۔

۲۰۔ ایضاً ص۴۸۲،۴۸۳۔ ۲۱۔ ایضاً ص۴۸۵۔

''خواجہ حسن نظامی نے اردو میں انشائیہ کو رائج کرنے کی ایک بلیغ کوشش کی لیکن ان کی نظر خارجی عوامل پر رہی اور وہ اپنی ذات پر سے دبیز پرتوں کو اتار نہ سکے۔ چنانچہ اردو انشائیہ سطح پر آتے آتے رہ گیا۔البتہ سجاد حیدر یلدرم نے اس چیلنج کو قبول کیا اور بعض غیر ملکی انشائیوں کی رُوح کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کی بھرپور کوشش کی۔اس ضمن میں ان کے مشہور مضمون ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ'' کا ذکر ضروری ہے لیکن یلدرم نے کوئی ایسا طبع زاد انشائیہ پیش نہیں کیا جس سے اردو میں انشائیہ نویسی کی روایت قائم ہو جاتی۔''

(ڈاکٹر وزیر آغا بحوالہ ''انشائیہ کے خدوخال''۔ص۱۹)

پروفیسر سید زوار حسین شاہ (بہاول پور)

آغا سکندر مہدی کی مرثیہ گوئی

سانحہ کربلا کے زیرِ اثر جس قدر ادب دنیا کی مختلف زبانوں میں تخلیق ہوا ہے۔، تاریخِ انسانیت میں ایسی مثال شاید مشکل سے ملے گی۔ اور اردو زبان وادب کی تو ابتداء ہی واقعہ کربلا کے ذکر سے ہوتی ہے۔ یوں تو واقعہ کربلا کے اثرات تمام اردو اصنافِ سخن پر نمایاں نظر آتے ہیں مگر مرثیہ، نوحہ اور سلام جیسی اصنافِ سخن کا تو تمام تر تعلق ہی واقعہ کربلا سے بنتا ہے۔ اگرچہ اردو میں شخصی اور قومی مرثیہ بھی لکھا گیا ہے مگر مذہبی مرثیہ، جس کا تعلق واقعہ کربلا ہے، اس قدر تواتر اور کثرت سے لکھا گیا ہے کہ اردو ادب میں مرثیے کا اطلاق واقعاتِ کربلا سے ہونے لگا ہے۔ ابتداء میں مرثیہ شہدائے کربلا سے اظہارِ عقیدت کے لیے لکھا جاتا تھا مگر جلد ہی مرثیہ گو شعرائے نے مرثیے کو عقیدت کے نہاں خانے سے نکال کر وقیع علمی وادبی صنف کے درجے پر فائز کر دیا۔ میر خلیق اور ضمیر نے فنی اجتہاد سے کام لے کر مرثیے میں عناصرِ ترکیبی کا اضافہ کیا تو انیس و دبیر نے مرثیے کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ کشورِ سخن کے شہنشاہ کو یہ کہنا پڑا کہ مرثیہ انیس و دبیر کی قلم رو ہے ان جیسا مرثیہ کہنے کے لیے اک عمر چاہیے۔

چنانچہ اب مرثیہ غزل کی طرح نو آموزوں کا تختہ مشق نہیں، مثنوی کی طرح ترتیب و تنظیم وواقعات کا نام نہیں، جدید نظم کی طرح آزاد خیالی کا نام نہیں، حمد کی طرح مرثیے میں عجز اور انکسار نمائی سے کام نہیں چلتا، مرثیہ میں نعت کی طرح صرف عقیدت وارادت کافی نہیں؛ مرثیہ قصیدے کی طرح شکوہ الفاظ اور علوئے تخیل کا نام نہیں۔ بلکہ مرثیے میں حمد کی طرح عجز ذات، نعت کی طرح اظہارِ عقیدت، قصیدے کا سا شکوہ، مثنوی کی سی ترتیب و تنظیم اور غزل کے سے سوز وگداز کی ضرورت ہے۔ ان سب کے قوام سے مرثیے کی تخلیق و تکمیل ہوتی ہے۔ اس پر مستزاد تاریخِ اسلام وحدیثِ نبویؐ اور تعلیماتِ اسلام وقرآن کا وافر علم رکھنے والا ہی کامل مرثیہ گو کہلا سکتا ہے۔

ادب سمیت ہر شے دھیمی رفتار کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھی کہ بیسویں صدی کے انقلابات نے تمام پرانے معیارات واقدار میں ترمیم وتوسیع کے در وا کر دیئے۔ انقلابِ روس، جنگِ عظیم اول ودوم کے اثرات نے تمام پرانی سوچوں اور سانچوں کو بدل ڈالا۔ ادب اور ادیب کا ان حالات سے متاثر ہونا قدرتی امر تھا۔ چنانچہ دیگر اصناف شعروادب کی طرح مرثیے نے بھی جدید اثرات قبول کیے۔ مرثیہ جو واقعاتِ کربلا کے فنکارانہ اظہار کا نام تھا۔ واقعاتِ کربلا کے بیان تک محدود نہ رہا بلکہ مولانا محمد علی جوہر کی انقلابی شاعری اور اقبال کے حیات

آفریں پیغام کی بدولت مرثیہ گو شعراء نے شہادتِ حسینؑ اور سانحہ کربلا کے اسباب واثرات کو مرثیے میں جگہ دی۔ جدید مرثیے میں واقعاتِ کربلا کے ساتھ ساتھ امامؑ کے پیام کو اولیت دی جانے لگی۔ اس طرح ادب میں جدید مرثیے کو روایتی مرثیے سے الگ دیکھا جانے لگا۔

جدید مرثیہ گوئی کے ابتدائی نقوش پہلے مرزا دبیر کے فرزند اوج لکھنوی اور پھر شاد عظیم آبادی کے ہاں مل جاتے ہیں مگر جن شعراء نے حقیقی معنوں میں جدید مرثیے کی بلند وبالا عمارت تعمیر کی ان میں جوشؔ، آل رضا، علامہ جمیل مظہری، نسیم امروہی اور نجم آفریدی کے نام سرِفہرست ہیں۔ جدید مرثیے کے ان عظیم شعرأ کے اتباع میں جن شعرأ نے جدید مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی ہے ان میں آغا سکندر مہدی کا نام قابلِ احترام ہے۔

آغا سکندر مہدی کی شاعری کی آغاز اس وقت ہوا جب وہ نویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ان کے اس دور کی نظمیں ''آج کل'' دہلی اور ''افکار'' بھوپال میں شائع ہوئیں۔(۱) آغا ابھی بارہویں جماعت کے طالب علم تھے کہ ان کے والد سید ظفر مہدی کا رضوی کا اچانک انتقال ہو گیا تو انہوں نے بڑے بھائی کے کہنے پر شاعری ترک کر دی (۲) اور تعلیم کی تکمیل میں منہمک ہو گئے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازمت کر لی اور بہاول پور میں سکونت اختیار کی۔ دورانِ ملازمت انہوں نے خطابت کا شغل بھی جاری رکھا۔ اسی دوران بھائی کے کہنے پر دوبارہ شاعری شروع کر دی۔ ۱۹۶۷ء تک آغا غزلیں اور نظمیں کہتے رہے۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے موقع پر انہوں نے جوشیلی قومی نظمیں بھی کہیں۔ ان کے اس دور کی شاعری بھی طبعی مناسبت اور گھر کی تربیت کے زیرِ اثر شہدائے کربلا کے ذکر سے کبھی خالی نہیں رہی۔ ماجد قریشی کہتے ہیں:۔

''آغا صاحب شہیدِ کربلا، فخرِ عالم حضرت امام حسین علیہ السلام کے شیدائیوں میں سے ہیں اور اکثر اپنی غزلوں اور نظموں میں شہیدِ کربلا اور دوسرے شہیدوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ان کے ایسے اشعار میں گہری مذہبی اور جذباتی عقیدت کارفرما ہوتی ہے۔''(۳)

آغا سکندر مہدی، شہدائے کربلا اور اہل بیت رسولؐ سے یک گونہ عقیدت وارادت تو پہلے بھی رکھتے تھے کہ ۱۹۶۷ء میں شہاب دہلوی کے دولت کدے پر ایک نعتیہ محفلِ مقاصدہ میں آغا سکندر مہدی کے قصیدے کو حاصلِ مشاعرہ قرار دیا گیا تو انصار حسین نفیس فتح پوری نے آغا کو مشورہ دیا کہ آپ مرثیہ کہیے، مرثیہ تو آپ میں چھلک رہا ہے(۴) یہ پہلا موقع تھا جب آغا مرثیہ گوئی کی طرف مائل ہوئے۔ سید مسعود حسین شہاب دہلوی کہتے ہیں:۔

''انہوں نے بہاول پور میں مرثیہ نگاری کی طرح ڈالی۔ خود بھی مرثیے لکھے اور دوسروں سے بھی لکھوائے۔''(۵)

۱۹۶۷ء سے اپنی وفات ۱۹۷۶ء تک آغا مرثیہ گوئی کی طرف متوجہ رہے۔ اس دوران میں انہوں نے سولہ مرثیے تصنیف کیے۔ ان کے مرثیوں کے مطلع اور بندوں کی تعداد درج ذیل ہے:

مرثیہ	صفحہ
۱۔اسم اللہ سے آغاز بیاں کرتا ہوں	۵۰
۲۔مطلعِ فکر ہے ایماں کی ضیا سے روشن	۵۹
۳۔فکر کی ارض وسماوات میں جولانی ہے	۶۰
۴۔ہے آج پھر قلم نکتہ رس وقارِ سخن	۵۲
۵۔آج پھر کاوشِ آرائشِ فن کرتا ہوں	۴۹
۶۔آتش بدوش نغمہ سازِ سخن ہے آج	۵۴
۷۔مجلس میں ذکرِ عظمت نوعِ بشر ہے آج	۵۵
۸۔مجلس میں آج روشنیٔ صبحِ یقیں ہے	۵۴
۹۔عالم کی ابتری پہ قلم اشک بار ہے	۵۲
۱۰۔فرشِ عزا پہ مجمعِ اہلِ نظر ہے آج	۵۱
۱۱۔آج پھر مائلِ پرواز ہے شہبازِ قلم	۵۷
۱۲۔ہے گرفتارِ انا روزِ ازل سے انساں	۴۶
۱۳۔انساں کو آج امن وسکوں کی تلاش ہے	۴۷
۱۴۔ایماں کی ضیأ مطلعِ انوارِ سخن ہے	۵۳
۱۵۔بزمِ جہاں میں آج عجب خلفشار ہے	۴۷
۱۶۔اوجِ فلک پہ آج قلم کی نگاہ ہے	۴۶

آغا کے یہ تمام مرثیے مرثیہ معلیٰ جلد اول ،دوم اور سوم کے نام سے شائع ہو چکے ہیں ۔ان کے مراثی کی پہلی دو جلدیں ان کی زندگی میں شائع ہوئیں ۔مرثیہ معلیٰ جلد سوم آغا کی وفات (اپریل ۱۹۷۶ء) کے تقریباً سات ماہ بعد شائع ہوئی ۔ان کی مرثیہ گوئی کے حوالے سے اب تک لکھے گئے تعارفی وتعریفی مضامین میں عقیدت کا پہلو زیادہ کار فرما رہا ہے،جس کے سبب سے آغا کی مرثیہ گوئی کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں ۔اس کا باعث آغا کا اپنا بیان بھی ہے وہ مرثیہ معلیٰ جلد اول میں لکھتے ہیں :۔

’’میرے پیشِ نظر انیس ودبیر کے شاہکار تھے ۔اس لیے میں نے اس گلزارِ فکر وسخن سے ہٹ کر ایک الگ راستہ اختیار کیا اور روایتی اجزائے ترکیبی یعنی چہرہ ،سراپا،آمد ،رجز ،جنگ ،شہادت اور بین کو ان کی قلمرو پاتے ہوئے اپنی راہ الگ متعین کی ۔اجزائے ترکیبی میں توحید ،عدل ،نبوت ،امامت اور شہادت کو پیشِ نظر رکھا اور خدا نے کامیابی عطا کی ۔‘‘(۶)

اکثر ناقدین نے آغا کی رائے کو بلا سوچے سمجھے من وعن تسلیم کر لیا ہے ۔مثلاً عاصی کرنالی کہتے ہیں :۔

’’آغا صاحب نے مرثیہ نویسی کی روایت میں بعض خوشگوار اضافے بھی کیے ہیں ۔مرثیے کے روایتی اجزائے ترکیبی یہ ہیں :چہرہ ،سراپا،آمد ،رجز ،جنگ ،شہادت اور بین ۔آغا صاحب نے الگ راہ نکالی ۔ان کے یہاں توحید ،عدل ،نبوت ،امامت اور شہادت کے اجزائے ترکیبی ملتے ہیں ۔‘‘(۷)

ان کے علاوہ دیگر ناقدین جن میں ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی (۸) سید عاشور کاظمی (۹) پروفیسر سیدہ حشمت جہاں (۱۰) علی اختر زیدی (۱۱)،سید اسلام حسین زیدی (۱۳) اور صدیق طاہر (۱۳) شامل ہیں ۔ان تمام ناقدین کے خیال میں آغا سکندر مہدی نے اپنے مرثیوں میں روایتی مرثیے کے اجزائے ترکیبی کو یکسر ترک کر دیا ہے ۔البتہ ڈاکٹر اسد اریب نے ان تمام ناقدین کی رائے کے برخلاف مرثیہ معلیٰ جلد اول کے چوتھے مرثیے کے بارے میں لکھتے ہوئے کہا ہے :۔

’’آغا کے چاروں مرثیے میں نے دیکھے ہیں ،باقی تینوں مرثیوں اور اس مرثیے کے اجزائے ترکیبی نہایت درجہ کمال خوبی سے آراستہ وپیراستہ ہیں ۔اس مرثیے کے سراپا میں بھی ایک عمدگی ہے کہ وہ مختصر ہے اور مکمل ہے............البتہ رجز کے مقام پر شاعر خاموش رہا ہے ۔یہ خاموشی بے سبب معلوم ہوتی ہے ۔‘‘(۱۴)

آغا کے مرثیوں کے مطلعوں پر نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ انہوں نے اپنے مرثیوں کے چہرے نہایت اہتمام سے لکھے ہیں ۔تقریباً نصف سے زائد مرثیوں کے مطلعوں میں آج کا لفظ یہ بتلا رہا ہے کہ شاعر عصری مسائل میں گہری دلچسپی رکھتا اور آج کے مسائل کو واقعہ کربلا کے تناظر میں دیکھ رہا ہے ۔دوسری اہم بات جو ایک حقیقت بھی ہے کہ آغا کے مرثیوں میں روایتی اجزائے ترکیبی سے یکسر انحراف نہیں کیا گیا ۔البتہ ان کے مرثیوں میں آمد اور رجز کے مضامین کم ملتے ہیں مگر دیگر اجزائے مرثیہ کی ان کے ہاں پوری پابندی ملتی ہے ۔

آغا سکندر مہدی نے مختصر مرثیے کہے ہیں ان کا کوئی مرثیہ ساٹھ بند سے متجاوز نہیں ہے ۔لہٰذا انہوں نے مرثیے کے عناصر ترکیبی میں سے ہر ایک پر بیسیوں بند نہیں لکھے ۔ایک اور بات کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ توحید ،عدل ،نبوت ،امامت اور شہادت کی ترتیب واقعاتِ کربلا کے حوالے سے نئی نہیں اس لیے کہ اکثر علماء وذاکرین مجلس عزاء سے خطاب کرتے ہوئے اسی ترتیب کو سامنے رکھتے ہیں ۔آغا سکندر مہدی مرثیہ گوئی شروع کرنے سے پہلے خطابت سے وابستہ رہ چکے ہیں چنانچہ ان کے ابتدائی مرثیوں پر مذکورہ ترتیب اور خطابت کی چھاپ صاف دکھائی دیتی ہے ،مگر اس کے باوجود مرثیہ معلیٰ کی جلد اول کے پانچوں مرثیوں میں حمد ،نعت ،منقبت اور شاعرانہ تعلّی (جو جزو مراثی ہوگئی ہے) کے ساتھ ساتھ جنگ ،شہادت اور بین کے اجزائے ترکیبی کا خاص خیال رکھا گیا ہے ۔

مرثیہ معلیٰ جلد اول کے مراثی کو شعوری طور پر خطیبانہ انداز کے مطابق ڈھالنے کے باوجود وہ روایتی مرثیے کی عظیم روایت سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکے مرثیہ معلیٰ جلد اول کے دوسرے مرثیے میں امام عالی مقامؑ کا رجز

،تیسرے مرثیے میں شہادت حضرت عباسؑ کا بیان رقم کرنے سے پہلے علم کی تعریف، حضرت عباسؑ کی جنگ کے لیے اجازت، شمر سے مکالمہ، ابتریٔ فوج شام اور جنگ جیسے اجزاء جو خالصتاً روایتی مرثیے کی چیز ہیں، شامل مرثیہ ہیں۔اسی جلد کے چوتھے مرثیے کا چہرہ اکیس بند تک پھیلا ہوا ہے پھر حضرت علی اکبرؑ کا سراپا، رخصت، جنگ اور بین کے روایتی اجزائے مرثیہ پوری توانائی کے ساتھ موجود ہیں۔اسی جلد کا پانچواں مرثیہ جو حضرت حُر کے حال میں ہے اس میں بھی شاعرانہ تعلّی، عظمت فن کی باتوں اور حمد ونعت کے بیان سے آگے بڑھ کر شاعر مرثیے کی روایت کے زیرِ اثر آجاتا ہے۔حضرتِ حُر کے ضمیر کی بیداری، فوج عمر ابن سعد سے حُر کا امام حسینؑ کی طرف آنا، تقصیر معاف کرانا، تلوار کی تعریف اور آمد کے بند بدیہی طور پر مرثیے کی روایت سے جڑے ہوئے ہیں۔یہ تمام شواہد بتاتے ہیں آغا خواہش اور کوشش کے باوجود مرثیے کے لیے اپنے بنا کردہ اجزائے ترکیبی پر قائم نہیں رہ سکے۔

جلد دوم کے مراثی کے مطالعہ سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ شاعر خطابت کے جوش وسرمستی کی خمار آگیں کیفیت سے نکل آیا ہے۔اب وہ خطیب کی بجائے مرثیہ گو کے انداز میں سوچتا ہے۔یہی سبب ہے کہ اس جلد کے ہر مرثیے کے چہرے میں آغا نے فکر بلند اور علوئے تخیل سے ایسے مضامین نکالے ہیں جو شاعر کی فن مرثیہ سے آگاہی اور زبان پر قدرت کے شاہد ہیں۔انہوں نے شعوری کوشش سے مرثیوں کے چہرے کو عہدِ حاضر کے مسائل کے بیان سے مزین کیا ہے۔۔آغا کے عہد کا انسان ہوسِ زرگری، انانیت وانتشار اور خلفشار کا شکار ہے۔بغض وعناد وفتنہ وفساد اور مردہ ضمیری کے شعلوں نے اس سے زندگی کا گوہرِ مقصود چھین لیا ہے۔حرص وآز نے انسان کو شمر کا مزاج اور ابلیس کی خودسری تفویض کردی ہے۔عصرِ حاضر کے اس المیے کو آغا نے کچھ یوں بیان کیا ہے:۔

حرص وہوس کی لاش پہ زندہ ہے آدمی   حمزہ کا دل چبائے وہ ہندہ ہے آدمی
صحرائے زندگی میں درندہ ہے آدمی   ہے شیش ناگ مارگزندہ ہے آدمی
انسانیت کا خون ہے منہ کو لگا ہوا
لیتا نہیں ہے لہر بھی اس کا ڈسا ہوا   (۱۵)

یا پھر یہ بند دیکھئے:۔

ہے اسلحے کی دوڑ زمانے میں چار سُو   آفاق پر ہے سب کو تسلط کی آرزو
پھرتے ہیں شہرِ زیست میں قزاق کُو بہ کو   عنقا ہر ایک چیز ہے ارزاں فقط لہو
تقسیم جام کرتے ہیں بغض وعناد کے
ہر گلستاں میں بوتے ہیں کانٹے فساد کے   (۱۶)

مرثیہ معلیٰ جلد دوم کے مراثی میں دوسری خوشگوار بات یہ نظر آتی ہے کہ مرثیہ نگار نے کردار نگاری، منظر نگاری، واقعہ نگاری اور مکالمہ نگاری کے فنی پہلوؤں کی طرف بھرپور توجہ کی ہے۔ان خوبیوں سے مرثیہ معلیٰ جلد اول

خالی ہے۔آغا بطور مرثیہ گو اب اس مقام پر آپہنچے ہیں کہ وہ بدیہی طور پر جدید مرثیے کا پختہ کار شاعر نظر آتا ہے۔جس کا مرثیہ مصائب پر رلاتا بھی ہے اور تاسی حسینؑ پر ابھارتا بھی ہے۔وہ نفسیاتی گرہ کشائی کے فن سے بھی بخوبی آگاہ ہے اور ایجاز واختصار کی منزل سے بھی بہ آسانی گزر سکتا ہے۔قدرتِ کلام اس بات کی متقاضی ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفہوم اور بڑے سے بڑے موضوع کو مختصر سے مختصر الفاظ میں بیان کیا جائے۔آغا کے مراثی میں یہ خوبی بہت نمایاں ہے۔ایجاز واختصار زبان پر قدرت کی بدولت ان کے مراثی کے بعض حصے اپنی اثر انگیزی اور بلاغت میں درجہ کمال پر نظر آتے ہیں۔وہ بلیغ اشاروں سے مضمون ومفہوم کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں۔جب دس محرم کی ڈھلتی عصر کو آلِ نبیؐ کا باغ اجڑ چکا، خیام لُٹ چکے، شامِ غریباں آچکی، چاند اپنا داغ داغ چہرہ لیے آیا تو آغا نے اس مصیبت کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:۔

حیرت زدہ ہے دشتِ بلا کی اجاڑ رات   زینبؑ نے کس طرح سے گزاری پہاڑ رات   (۱۷)

اہلِ کوفہ کی مکاری اور دھوکہ دہی کی عادت کا اس انداز میں ذکر کیا ہے۔

شبیر جانتے تھے حقیقت پیام کی   بھیجا جوان کو شاہ نے حجت تمام کی   (۱۸)

حضرت علیؑ کے عہد کے بعض تکلیف دہ واقعات کی طرف یوں اشارہ کیا ہے۔

صفین کا میدان ہو یا جنگِ جمل ہو   مولا کا یہ مقصد تھا کہ قرآں پہ عمل ہو   (۱۹)

مرثیہ معلیٰ جلد دوم کا پہلا مرثیہ عون ومحمد کے حال میں ہے اسمیں حضرت زینبؑ کی سیرت، سراپا، اذنِ جنگ، مکالمہ، جنگ، ابتریٔ فوجِ شام، شہادت اور بین سبھی کچھ مرثیے کی روایت سے جڑا ہوا ہے۔دوسرے مرثیے میں حضرت زینبؑ کی سیرت وکردار کی تفسیر مفکرانہ انداز میں بیان ہوئی ہے۔کوفہ وشام کے درباروں میں علیؑ کی جلالت مآب بیٹی کے خطبات مرثیے کی روایت بھی ہے اور امام حسینؑ کے اقدام سے بحث بھی۔تیسرا مرثیہ حضرت علی اصغرؑ کے حال میں ہے اس میں بھی تمام روایتی اجزائے مرثیہ موجود ہیں۔چوتھا مرثیہ حضرت علی قاسمؑ کے حال میں ہے۔اس مرثیے میں حضرت قاسم کے سراپا سمیت اذنِ جنگ مادر قاسمؑ کا حضرت قاسمؑ سے مکالمہ، جنگ، شہادت اور بین روایت کا اتباع ہے۔پانچواں مرثیہ حضرت مسلم بن عقیلؑ کے حال میں ہے، روایتی اندازِ بیان کا حامل ہے۔اس جلد کے پانچوں مرثیوں میں جدید مرثیے کے تمام لوازم کی پابندی کے باوجود روایتی مرثیے کی بھی تمام خوبیاں موجود ہیں سوا اس کے کہ شاعر نے تلوار ورہوار کی تعریف کی طرف توجہ نہیں کی۔اس جلد کے مراثی میں حضرت امام حسینؑ کے پیغام اور اقدام سے بحث کی گئی ہے جو تفکر آفریں ہے۔ڈاکٹر اسلم فرخی نے کہا ہے۔

’’آغا سکندر مہدی نے شہادت کے مقاصد عظیم کو ہر جگہ مدِ نظر رکھا ہے اور وہ محض ایک عقیدت مند اور مداح نہیں۔صاحب فکر ونظر بھی ہیں جو اپنی بصیرت کو دوسروں تک پہنچانے میں کامیاب رہے ہیں‘‘ (۲۰)

آغا سکندر مہدی نے جدید مرثیہ نگار ہوتے ہوئے روایتی اجزاء مرثیہ کی پابندی سے دامن نہیں چھڑایا۔مرثیہ معلیٰ

جلد سوم کے مراثی سے معلوم ہوتا ہے کہ آغا نے خطیبانہ انداز بیان سے تو مکمل طور پر دوری اختیار کر لی ہے لیکن شاعرانہ تعلّی سے گلوخلاصی نہیں ہوسکی بلکہ نرگسیت کی لے کچھ اور تیز ہوگئی ہے۔شاعر سانحہ کربلا کے واقعات کو مفکرانہ انداز میں بیان کرنے لگا ہے۔مرثیے کے چہرے کے موضوعات،واقعات مرثیہ کے لیے پس منظر کا م دیتے ہیں۔اس جلد کے مراثی میں واقعاتِ کربلا کا بیان ہو یا اہلبیت کی اسیری ءشام کا تذکرہ،شاعر نے مقاصد ِ قربانی اور امامؑ کے پیام کو مرثیے میں اولیت دی ہے۔وہ واضح کرتے ہیں کہ اگر شرافت کی قبا تار تار ہے اور محبت ومروت کا چمن اجڑ گیا ہے تو اس کا سبب انسان کی نافہمی،بد اعمالی اور دینِ اسلام کی سچی محبت سے منہ موڑنا ہے۔ایسے میں امام حسینؑ اور آپؑ کے جانثاروں کا کردار وعمل ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔وہ کہتے ہیں:

انگلی نہ اٹھے دشمنِ اسلام کی ہم پر
گر آج مسلمان چلیں ان کے قدم پر (۲۱)

اسی طرح ایک اور جگہ پر امامؑ عالی مقام کے رفقاء کے کردار وعمل کا ذکر یوں کرتے ہیں:

فخرِ اسلام ہے عالم میں حسینی لشکر
جن کے کردار پہ نازاں تھے شہ جن و بشر
نصرتِ حق کے لیے باندھی تھی ہر اک نے کمر
اس کا شاہد ہے حبیب ابن مظاہر کا سفر
نہ تو دولت کے لیے اور نہ حکومت کے لیے
یہ فقط آئے تھے شبیر کی نصرت کے لیے (۲۲)

آغا سکندر مہدی جدید مرثیہ نگار ہیں ان کے مرثیے ہر لحاظ سے جدید مرثیے کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ان کے اکثر مراثی جذبات خیز ہونے کی بجائے فکر انگیز ہیں۔اسی لیے سید عاشور کاظمی کہتے ہیں۔

’آغا سکندر مہدی وہ تیشہ بدست شاعر ہیں جنھوں نے روایت کے چراغ کو ماضی سے لیا اور اس میں اپنے شعور وادراک کا تیل ڈال کر اس کے اجالے کو زیادہ منور کر کے نئی نسل کے حوالے کر دیا۔‘‘

مگر اس تمام جدت پسندی کے باوجود ان کے مراثی میں روایت کا اتباع اور احترام ملتا ہے۔قدیم مرثیے کے روایتی اجزاء سے شعوری طور پر اجتناب کرنے کے باوجود وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکے۔جس کے شاہد آغا کے مرثیے ہیں۔جن کا تجزیہ اس مقالے کے پہلے حصے میں پیش کیا جا چکا ہے۔اسی لیے سجاد باقر رضوی کہتے ہیں:۔

’’آغا سکندر مہدی صاحب کے مرثیے کے مؤثر اور نسبتاً زیادہ جاندار حصے وہی ہیں جہاں مرثیے کی عظیم روایت پوری قوت کے ساتھ اپنا پورا لوہا منواتی ہے۔‘‘ (۲۴)

اب آغا کے مرثیوں سے روایتی اجزاء مرثیہ کے کچھ بند پیشِ خدمت ہیں تا کہ ثبوت مہیا ہوسکے:۔

حضرت قاسم کا سراپا:

زلفیں ہیں یا کہ سایہ شمشیر حیدری مثل گل شگفتہ ہیں رخسار نقرئی
آنکھیں ہیں یا کہ نور کی کلیاں کھلی ہوئی صبح یقیں ہے چہرہ اقدس کی تازگی
باغِ حسن کے حسن کا آئینہ دار ہے
سر سے قدم تلک یہ سراپا بہار ہے۔ (۲۵)

حضرت علیؑ اکبر کی میدانِ جنگ میں آمد:

برائے جنگ جو وہ صاحب کمال بڑھا اُٹھا یہ شور کہ خیبر کشا کا لال بڑھا
مثال نور مبیں،حسن لازوال بڑھا جلال آیا تو کچھ اور بھی جمال بڑھا
اُٹھا یہ غل کہ ہٹو قلعہ گیر آتے ہیں
قیامت آئی جناب امیر آتے ہیں
فرس سے اڑ کے جو اکبر چلے سُوئے مقتل در آیا فوجِ عدو میں سوار رخشِ اجل
سمند کانپے،سواروں میں مچ گئی ہلچل لرز کے رہ گئے آگے نہ بڑھ سکے پیدل
سموں میں گھوڑوں کے جیسے نشان شاہی تھے
قدم جو تھک گئے ،ملک عدم کے راہی تھے (۲۶)

امام حسینؑ کا رجز:

یاد تو ہوگا تمھیں بدر و احد کا میداں زعم میں طاقت وکثرت کے تم آئے تھے جہاں
جب چلی حیدرؑ کرار کی تیغِ براں ایسے بھاگے تھے کہ ملتا نہ تھا قدموں کا نشاں
پھر وہی زور یداللہ دکھاتا ہے حسینؑ
لو! چلو! آؤ کہ میدان میں آتا ہے حسینؑ (۲۷)

ابتریٔ فوجِ شام:

حملہ ءحُر سے ہراساں تھا یزیدی لشکر موت سے ڈھونڈتا پھرتا تھا ہر اک راہِ مفر
وہ تلاطم تھا،نہ تھی باپ کو بیٹے کی خبر نفسا نفسی تھی ہر اک سمت ، بپا تھا محشر
میمنہ قلب سے لشکر کے جو ٹکراتا تھا
میسرہ فرطِ ندامت سے گڑا جاتا تھا (۲۸)

عون ومحمد کا امام حسینؑ سے اذنِ جنگ:

بولے ادب سے سر کو جھکا کر وہ نیک خو　　ہم کو بھی ہے جہاد کی دنیا میں آرزو
مل جائے اذنِ جنگ تو ہم بھی ہوں سرخرو　　کام آئے راہِ حق میں ہمارا بھی یہ لہو
دیں گے رضا حضور تو لڑنے کو جائیں گے
ہم دشمنوں کے خون کی ندی بہائیں گے　　(۲۹)

حضرت مسلم بن عقیلؑ کی جنگ:

مسلم نے تیغِ تیز کے جوہر دکھا دیئے　　بد بخت اشقیا کے پر نچے اڑا دیئے
بڑھتے ہوئے لعین زمیں پر گرا دیئے　　لاشیں گرائیں، کشتوں کے پشتے لگا دیئے
مسلم بن عقیل کے حملے شدید تھے
آئے جو سامنے وہ جہنم رسید تھے　　(۳۰)

بین :

رخصت کے وقت خیمے میں کہرام تھا بپا　　اہلِ حرم میں شور تھا ہائے حسینؑ کا
غفلت میں تھا مگر اُٹھا بیمار کربلا　　بے چین ہو کے حضرت فضہ سے یہ کہا
کہرام کیوں بپا ہے یہ کیا شور شین ہے
فضہ کہو کہاں میرا بابا حسینؑ ہے　　(۳۱)

شہادت حضرت علی اصغر:

بے جاں جو ہوا گود میں آغوش کا پالا　　کہتے ہیں کہ ہونے لگا عالم تہہ و بالا
ہوتا نہیں اندازہ صبر شہِ والا　　کس طرح سے شبیر نے وہ تیر نکالا
آئی نہ قیامت تو یہ حضرت کا کرم تھا
اصغر کا لہو ناقہ صالح سے نہ کم تھا　　(۳۲)

بین :

مولا گئے تو کہنے لگی سوگوار ماں　　اے بیبیو! بتاؤ میرے لال ہیں کہاں
لاشیں دکھاؤ تا کہ تصدق ہو نیم جاں　　چھایا ہوا ہے آنکھوں کے آگے مرا دھواں
سورج تو اتنا جلد کبھی ڈوبتا نہیں
کیا رات ہوگئی ہے مجھے سوجھتا نہیں
بتلاؤ بیبیو! مرے خورشید ہیں کہاں　　مجھ کو بٹھا دو دونوں کی لاشوں کے درمیاں
اماں سے سرخ رو کیا قربان جائے ماں　　ان پر زمیں بھی روئے گی روئے گا آسماں

میدان کارزار میں کیا نام کر کے آئے
میں جیسا چاہتی تھی وہی کام کر کے آئے　　(۳۳)

آغا نے مراثی میں روائت کے احترام کے باوجود مرثیے کے مزاج کو بدلنے کی سعی کی۔ جہاں وہ مرثیے میں حزنیہ کیفیات کو اجاگر کرتے ہیں مگر کرداروں سے بین نہیں کراتے۔ ان کے مراثی میں کرداروں کو بین کرتے ہوئے کم دکھایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے جہ آغا کے مرثیوں میں سامعین کو رلانے کے لیے کرداروں کو مسخ نہیں کیا گیا۔

جدید مرثیہ گوئی میں آغا سکندر مہدی کو یقیناً ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ مگر سید عاشور کاظمی کی طرف سے انہیں جدید مرثیے کے ارکانِ خمسہ میں شامل کرنا کسی قدر وضاحت طلب ہے (۳۴) میرے خیال میں اس غلط فہمی کا سبب آغا کی شاعرانہ تعلیاں ہیں۔ چنانچہ اکثر ناقدینِ مرثیہ نے کہیں مصلحت پسندی کے زیرِ اثر اور کہیں دوست نوازی کے شوق میں آغا کے دعوے کو تسلیم کر لیا ہے۔ جدید اردو مرثیے کے نامور شعرا جنہوں نے جدید مرثیے کی تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کیا ہے اس کا ذکر سید ضمیر اختر نقوی نے اپنی تصنیف ''اردو مرثیہ پاکستان میں'' میں کیا ہے۔ انہوں نے جدید مرثیے کے معماروں میں جوش ملیح آبادی، سید آل رضا، نسیم امروہی، راجہ محمود آباد اور نجم آفندی کو شامل کیا ہے۔ (۳۵)

ڈاکٹر ہلال نقوی نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے میں جدید مرثیے کے عناصر اربعہ جوش، نسیم امروہی، جمیل مظہری اور سید آل رضا کو قرار دیا ہے (۳۶) ڈاکٹر ہلال نقوی کے بعد ڈاکٹر سید طاہر حسین کاظمی نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے ''مرثیہ میر انیس کے بعد'' میں جدید مرثیے کی تعداد سات تک پہنچا دی ہے انہوں نے نجم آفندی، امن لکھنوی اور دلو رام کوثری کو بھی شامل کیا ہے۔ (۳۷) ان محققین و ناقدین میں سے کسی نے بھی آغا سکندر مہدی کو ان شعرا کی فہرست میں جگہ نہیں دی۔ پھر جدید مرثیے کی ابتدا بیسیویں صدی کے ربع اول میں جوش، نسیم امروہی اور جمیل مظہری کے ہاتھوں ہو چکی تھی۔ آغا سکندر مہدی کی مرثیہ گوئی کا آغاز کوئی نصف صدی بعد ۱۹۶۷ء میں ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کو جدید مرثیے کے عناصر اربعہ میں شامل کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ البتہ آغا سکندر مہدی اس لحاظ سے لائق احترام و تحسین ہیں کہ انہوں نے بہاول پور جیسے چھوٹے سے شہر میں اردو مرثیہ گوئی کے لیے فضا تیار کی۔ شہاب دہلوی لکھتے ہیں:۔

''مجالس سے بہاول پور میں مرثیہ خوانی اور مرثیہ گوئی کی ایک خاص فضا تو قائم ہو ہی گئی تھی۔ چنانچہ آغا سکندر مہدی صاحب نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مختلف لوگوں کو مرثیہ لکھنے کی دعوت دی'' (۳۸)

جدید مرثیے کے لیے آغا کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر اسد اریب کہتے ہیں:۔

''جناب آغا کا اردو ادب پر یہ بڑا کرم ہے کہ مرثیے کی حیاتِ نو میں بقدر ہمت و کمال حصہ لیا اور بہاول پور کو کراچی، پنڈی اور لاہور کے مماثل بنا دیا۔'' (۳۹)

آغا سکندر مہدی بلاشبہ زبان پر قدرت اور فن مرثیہ گوئی میں کمال رکھتے تھے لیکن کہیں کہیں سے ان سے لفظی و معنوی سطح پر کچھ تسامحات ہوئے ہیں جن کا ذکر کرنا ادبی دیانتداری کا تقاضا ہے۔مثلاً! آغا اپنے پہلے مرثیے میں جو حضرت علیؓ کی شہادت سے متعلق ہے۔حضرت علیؓ کے حسنِ اخلاق کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں:

حسنِ اخلاق زمانے کو دکھا دو بیٹا　　　جام شربت کا پیاسے کو پلا دو بیٹا　　(۴۰)

یہ تقریر کسی صورت مقتضائے حال نہیں اور امام علیؓ کے شایان شان نہیں ۔ یہ درجہ بلاغت سے گری ہوئی بات ہے۔اسی طرح ایک اور مرثیے میں آغا نے لفظ 'مشتری' کو مؤنث باندھا ہے۔ کہتے ہیں

ع　　مشتری چاند کے پہلو میں چھپی جاتی ہے　　(۴۱)

مشتری کا لفظ ہر لحاظ سے مذکر ہے ۔ایک اور مرثیہ جو حضرت وہبؓ کی شہادت سے متعلق ہے۔ حضرت وہبؓ میدان کی طرف جاتے ہوئے بیوی کے خیمے میں رخصت ہونے کے لیے آتے ہیں۔اس موقع پر آغا کہتے ہیں

بات کہتے ہوئے رخصت کی مگر شرمائے　　(۴۲)

شرمانے کا سبب معلوم نہیں ہوتا۔ ماں حضرت وہبؓ کو جلد میدانِ جنگ میں دیکھنا چاہتی ہیں ۔حضرت وہبؓ اپنی ماں کے سامنے آتے ہیں تو منظر ملاحظہ ہو!

ع　　ماں کو افسردہ جو دیکھا تو بہت شرمائے　　(۴۳)

دونوں باتیں مقتضائے حال نہیں۔اسی مرثیے میں جب حضرت وہبؓ شہید ہو جاتے ہیں تو ظالم حضرت وہبؓ کا سر کاٹ کر ماں کی طرف پھینک دیتے ہیں۔ اس مرحلے پر آغا کہتے ہیں؛

ع لشکرِ ظلم نے انساں کا شرف پھینک دیا　　　کاٹ کے بیٹے کا سر ماں کی طرف پھینک دیا　(۴۴)

شرف پھینکنا نہ روزمرہ ہے نہ محاورہ۔اسی مرثیے کے اگلے بند میں کہتے ہیں؛

ع ماماتا بھڑک لیا گود میں بیٹے کا سر　　　دل جو بھر آیا تو جی بھر کے اسے پیار کیا
پھر سُوئے فوجِ لعیں کہہ کے اسے پھینک دیا　　　میں نہیں لیتی یہ سر جس کا کیا ہے صدقہ　　(۴۵)

آغا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اُمِ وہبؓ اپنے بیٹے کو حضرت امام حسینؑ پر قربان کرنے کو سعادت سمجھتی ہیں اس لیے انہیں بیٹے سے اب سروکار نہیں مگر پیرایہء اظہار ٹھیک نہیں ۔ زبان و بیان کے کچھ اور تسامحات بھی ہیں مگر ان سے درگزر کیا جا سکتا ہے۔ بحیثیتِ مجموعی آغا سکندر مہدی کی مرثیہ گوئی کے لیے خدمات قابلِ قدر ہیں۔ جن کے ہاں قدیم و جدید کا حسین امتزاج ملتا ہے۔انہوں نے مراثی کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ان کے بارے میں ڈاکٹر ہلال نقوی کہتے ہیں:

''سکندر مہدی کی مرثیہ گوئی کا آغاز جذبے کی سرشاری میں ہوا۔انہوں نے اپنی عقیدت کو ایسے مرثیے کی زبان دینا چاہی جس میں احترام تو ہو اُس کی نقالی نہ ہو'' (۴۶)

بہاول پور میں مرثیہ نگاری کے حوالے سے ان کا نام بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ان کے مرثیوں میں خطابت کی دھوم دھام کے باوجود سانحہء کربلا کے تاریخی اور فکری گوشے نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتے۔ اگرچہ انہوں نے مرثیے کے بیانیہ اور بینیہ حصے پر کم نوحہ کی ہے جو اختصار پسندی کے سبب سے ہے۔اس کے باوجود جب وہ بین نگاری پر آتے ہیں تو بے ساختہ آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے ہیں ۔ان کے مرثیے فکری سطح پر انسان کے ذہن و شعور کو جھنجھوڑتے ہیں اور نتیجے کے طور ان کے مرثیوں کا قاری ابلیس اور یزیدی نظام سے متنفر ہو کر امام حسینؓ ابنِ علیؓ کے اخلاقی اور فکری نظام سے محبت کرنے لگتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات کی تفصیل

۱۔آغا صاحب مشمولہ مرثیہ معلیٰ جلد اول آغا سکندر مہدی　از پروفیسر سیدہ حشمت جہاں
حقی آفسٹ پریس، کراچی، ص ۸

۲۔مرثیہ نظم کی اصناف میں　جدید مرثیہ اور سکندر مہدی از سید عاشور کاظمی
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی اشاعت اول ۱۹۹۶ء ص ۸

۳۔دبستانِ بہاول پور　از ماجد قریشی　ادارہ مطبوعات آفتاب شرق بہاول پور　۱۹۶۴ء ص۔۴۲۷

۴۔مرثیہ نور کے سانچے میں ڈھلا جاتا ہے　مشمولہ مرثیہ معلیٰ جلد اول آغا سکندر مہدی
از سید انصار حسین نفیس فتح پوری　حقی آفسٹ پریس کراچی، ص ۲۱

۵۔آہ　سکندر مہدی　از سید مسعود حسن شہاب دہلوی　ہفت روزہ الہام۔ بہاول پور　۱۴ اپریل، ۱۹۷۶ء

۶۔جو ملا مجھ کو وہ توفیقِ الٰہی سے ملا　مشمولہ مرثیہ معلیٰ جلد اول　از آغا سکندر مہدی
حقی آفسٹ پریس کراچی　　ص ۱۴

۷۔مرثیہ معلیٰ دانشوروں کی نظر میں　مشمولہ مرثیہ معلیٰ جلد دوم　از عاصی کرنالی
آغا سکندر مہدی　مکتبہ اشاعتِ ادب لاہور، بارِ اول　مئی ۱۹۷۶ء　　ص ۱۹

۸۔مرثیہ نظم کی اصناف میں سب سے افضل　　مشمولہ مرثیہ معلیٰ جلد اول
تبصرہ از ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی　حقی آفسٹ پریس کراچی، ص ۸۱

۹۔مرثیہ نظم کی اصناف میں سب سے افضل　　جدید مرثیہ اور سکندر مہدی
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی　　۱۹۹۶ء　　ص ۱۸

۱۰۔اردو مرثیے کے ارتقاء میں ''مرثیہ معلیٰ'' کا مقام　مشمولہ مرثیہ معلیٰ جلد دوم
از پروفیسر حشمت جہاں ناز　مکتبہ اشاعتِ ادب لاہور، بارِ اول　مئی ۱۹۷۶ء　　ص ۴۱

۱۱۔حامل رائیت اقلیم وفا ہیں عباس (مرثیہ)مشمولہ مرثیہ معلیٰ جلداول
تبصرہ ازسید علی اختر زیدی حقی آفسٹ پریس کراچی، ص۱۴۴
۱۲۔ ''مرثیہ معلیٰ''، دانشوروں کی نظر میں مشمولہ مرثیہ معلیٰ جلد دوم ازسید اسلام حسین زیدی
مکتبہ اشاعتِ ادب لاہور، بارِاول ۱۹۷۲ء ص۲۲
۱۳۔مختصر مرثیے کی تحریک اور آغا سکندر مہدی مشمولہ مرثیہ معلیٰ جلد دوم ازصدیق طاہر
مکتبہ اشاعتِ ادب لاہور، بارِاول ۱۹۷۲ء ص۴۷
۱۴۔سخن حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسین مشمولہ مرثیہ معلیٰ جلداول ازڈاکٹر اسد اریب
حقی آفسٹ پریس کراچی، ص۲۱۷۔۲۱۸
۱۵۔مرثیہ معلیٰ جلد دوم آغا سکندر مہدی مکتبہ اشاعتِ ادب لاہور، بارِاول مئی ۱۹۷۲ء ص۶۲
۱۶۔ایضاً ص۲۵۸
۱۷۔ایضاً ص۱۶۲
۱۸۔ایضاً ص۳۴۳
۲۰۔''مرثیہ معلیٰ''، دانشوروں کی نظر میں مشمولہ مرثیہ معلیٰ جلد دوم ازڈاکٹر اسلم فرخی مئی ۱۹۷۲ء ص۱۷
۲۔ ''مرثیہ معلیٰ جلد سوم'' آغا سکندر مہدی ادارہ پاک پبلشرز، کراچی ستمبر ۱۹۷۶ء
ص۲۲۱
۲۲۔ ''مرثیہ معلیٰ جلد سوم'' آغا سکندر مہدی ادارہ پاک پبلشرز، کراچی ستمبر ۱۹۷۶ء
ص۱۹۹
۲۳۔مرثیہ نظم کی اصناف میں سب سے افضل جدید مرثیہ اور آغا سکندر مہدی
سید عاشور کاظمی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۶ء ص۳۳
۲۴۔نوشاہ فکر حسن عروس سخن ہوا مشمولہ مرثیہ معلیٰ جلد دوم تبصرہ ازباقر رضوی
مکتبہ اشاعتِ ادب لاہور، بارِاول مئی ۱۹۷۲ء ص۲۴۸
۲۵۔ ''مرثیہ معلیٰ جلد دوم'' آغا سکندر مہدی مکتبہ اشاعتِ ادب لاہور، بارِاول
مئی ۱۹۷۲ ص۲۷۰
۲۶۔مرثیہ معلیٰ جلداول آغا سکندر مہدی حقی آفسٹ پریس کراچی ص۲۵۹
۲۷۔ایضاً ص۱۳۱
۲۸۔ایضاً ص۳۱۹

۲۹۔''مرثیہ معلیٰ جلد دوم'' آغا سکندر مہدی مکتبہ اشاعت ادب لاہور، بارِاول
مئی ۱۹۷۲ء ص۸۷
۳۰۔ایضاً ص۳۵۰
۳۱۔ ''مرثیہ معلیٰ جلد سوم'' آغا سکندر مہدی ادارہ پاک پبلشرز، کراچی
ستمبر ۱۹۷۶ء ص۳۵۱
۳۲۔''مرثیہ معلیٰ جلد دوم'' آغا سکندر مہدی مکتبہ اشاعتِ ادب لاہور، بارِاول
مئی ۱۹۷۲ء ص۲۲۶
۳۳۔ایضاً ص۱۰۹۔۱۱۰
۳۴۔مرثیہ نظم کی اصناف میں سب سے افضل جدید مرثیہ اور آغا سکندر مہدی
سید عاشور کاظمی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۶ء ص۸۲
۳۵۔اردو مرثیہ پاکستان میں سید ضمیر اختر نقوی سید اینڈ سید کراچی ۱۹۸۲ء، ص۲۳
۳۶۔بیسویں صدی اور مرثیہ ڈاکٹر ہلال نقوی محمدی ٹرسٹ لندن کراچی ۱۹۹۴ء
ص۲۳
۳۷۔اردو مرثیہ میر انیسؔ کے بعد ڈاکٹر سید طاہر حسین کاظمی ۱۹۹۷ء
۳۸۔بہاول پور میں مرثیہ گوئی کی ابتداً ازشہاب دہلوی ہفت روزہ الہام بہاول پور۔
۱۰مئی ۱۹۶۷ء
۳۹۔سخن حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسین مشمولہ مرثیہ معلیٰ جلداول ازڈاکٹر اسد اریب
حقی آفسٹ پریس کراچی ص۲۱۴
۴۰۔مرثیہ معلیٰ جلداول آغا سکندر مہدی حقی آفسٹ پریس کراچی ص۴۷
۴۱۔ایضاً ص۱۰۲
۴۲۔''مرثیہ معلیٰ جلد سوم'' آغا سکندر مہدی ادارہ پاک پبلشرز، کراچی
ستمبر ۱۹۷۶ء ص۶۷
۴۳۔ایضاً ص۷۱ ۴۴۔ایضاً ص۷۹
۴۵۔ایضاً ص۸۰

☆☆☆☆☆☆

محمد حمید شاہد (اسلام آباد)

فیض احمد فیض اور تنقید

اقبال کے بعد عوامی سطح پر سب سے زیادہ توقیر پانے والے فیض احمد فیض کے بارے میں اگر میں یہ کہہ دوں کہ وہ بہت بڑے تنقید نگار بھی تھے تو خدا لگتی کہوں کہ یہ بات قرین انصاف نہ ہوگی۔ میں بڑی حد تک خود فیض صاحب کی اُس بات سے متفق ہوں جو انہوں نے ''میزان'' کا دیباچہ تحریر کرتے وقت لکھ دی تھی، یہی کہ:

''ادبی مسائل پر سیر حاصل بحث کے لیے نہ کبھی فرصت میسر تھی نہ دماغ۔ ریڈیو پر اور مختلف محفلوں میں ان مسائل پر باتیں کرنے کے مواقع ملتے رہے، یہ مضامین ان ہی باتوں کا مجموعہ ہیں، اس لیے ان میں سخن علماء سے نہیں، عام پڑھنے لکھنے والوں سے ہے۔ جو ادب کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں۔''

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: ''بہت سی باتیں جو اس وقت (یعنی جوانی کے دنوں میں) بالکل نئی تھیں اب پامال نظر آتی ہیں اور بہت سے مسائل جو ان دنوں سادہ معلوم ہوتے تھے اب کافی پیچیدہ دکھائی دیتے ہیں۔''

یاد رہے فیض نے یہ سب کچھ اپنے مضامین کے مجموعے ''میزان'' کی پہلی اشاعت کے موقع پر یعنی 1960ء میں لکھا تھا اور لکھتے ہوئے پچیس سال پہلے والی جوانی کو یاد کیا تھا۔ اس بیان کو دیکھیں تو ''میزان'' میں چھپنے والے بیشتر مضامین کا دورانیہ 1935ء کے آس پاس کا بننا چاہیے۔ 1911ء میں پیدا ہونے والے فیض 1935ء میں عمر کے چوبیسویں سال میں تھے اور انگریزی کے استاد کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کرنے والے تھے۔ تب تک وہ جو کام کر چکے تھے اسے یوں گنوایا جا سکتا ہے:

☆ حفظ قرآن کی کوشش، اور مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی سے عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم، جس نے بقول فتح محمد ملک فیض کی شاعری کا لہجہ مارکسی جدلیات پر ایمان لانے کے باوصف مسلمان رکھا۔

☆ شمس العلماء میر حسن ناز سے عربی فارسی میں دست گاہ، ایم اے انگریزی کرتے ہوئے ان کے اپنے بیان کے مطابق انگریزی ادب کے ساتھ ساتھ باقی یورپی ادب اور روس کے کلاسیکی ادب کا مطالعہ۔ اور اس قدر ڈوب کر مطالعہ کہ نظروں کے سامنے روس کی پوری دنیا گھوم گئی۔

1935ء ہی وہ سال بنتا ہے جب استاد فیض نے اپنے ایک ساتھی سے کیمونسٹ مینی فیسٹو لے کر پڑھا تھا اور اتنا پسند آیا تھا کہ وہ اسے پلٹ پلٹ کر پڑھتے رہے اور ہزار جان سے اس پر فدا ہوتے رہے۔ ''مہ و سال

آشنائی'' میں لکھتے ہیں: ''انسان اور فطرت' فرد اور معاشرہ' معاشرہ اور طبقات' طبقے اور ذرائع پیداوار کی تقسیم' ذرائع پیداوار اور پیداواری رشتے' معاشرے کا ارتقاء' انسانوں کی دنیا کے پیچ در پیچ اور تہ بہ تہ رشتے ناطے' قدریں' عقیدے' فکر و عمل وغیرہ وغیرہ کے بارے میں یوں محسوس ہوا کہ کسی نے اس پورے خزینہء اسرار کی کنجی ہاتھ میں تھما دی ہے''

فیض کے ''مہ و سال آشنائی'' والے اس بیان کو سامنے رکھا جائے تو ''میزان'' کے دیباچے والی جوانی میں کچھ اور سال جمع کرنے پڑتے ہیں۔ ''میزان'' کے بعض مضامین کے آخر میں درج تاریخیں ان اضافی سالوں کا تعین کر دیتی ہیں اس ضمن کا آخری سال 1961 بنتا ہے۔ گویا فیض نے یہ مضامین پچیس سے پچاس سال کے عرصے میں لکھے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ فیض کی شاعری کی جوانی کا یہی دورانیہ بنتا ہے۔ یاد رہے اس بیچ وہ 1936ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام میں بھرپور حصہ لے چکے تھے فوج کے محکمہ تعلقات عامہ میں کپتان بننے اور میجر کے عہدے تک پہنچنے کے بعد 1947ء میں مستعفی ہو چکے تھے اور پھر اِن تحریروں سے واضح ہونے والے آخری سال کے قریبی عرصے میں پاکستان آرٹس کونسل لاہور کے سیکرٹری ہو گئے تھے۔ تاہم اسے بھی دھیان میں رکھنا ہوگا کہ اسی دورانئے میں ان کا شعری مجموعہ ''دست صبا'' شائع ہو چکا تھا ''مشہور مقدمہ سازش'' اسیری اور اس کے تذکرے ''زنداں نامہ'' کے سبب وہ بہت شہرت بھی پا چکے تھے۔

یہ سارا پس منظر نگاہ میں رکھیں گے تو ان مضامین کی تفہیم بہت سہل ہو جائے گی۔ سہل ہونے کی بات میں نے فیض کے اپنے شخصی ہیجانات اور ترجیحات کو سمجھنے کے حوالے سے کی ہے ورنہ فیض نے اپنے سارے تنقیدی مضامین اور دیباچوں کو حد درجہ سادہ رہنے دیا ہے' اتنا سادہ کہ انہیں پڑھتے ہوئے تخلیقی عمل کی اِسراریت پر جما جمایا ایمان کہیں کہیں سے اُچٹنے لگتا ہے۔ اسے جملہ معترضہ ہرگز نہ جانیے گا کہ یہ کھٹکا وہاں وہاں ہوتا ہی رہتا ہے جہاں جہاں فیض اس طرح کے بیان دیتے ہیں: ''............ ترقی پسند ادب کا پہلا اور آخری مقصد بنیادی سماجی مسائل کی طرف توجہ دلانا ہے (ان مسائل میں غالبا طبقاتی کشمکش اور دنیوی آسائشوں کی تقسیم سب سے زیادہ اہم ہیں) اور سماج میں ایسے فکری یا عملی رجحانات پیدا کرنا جن سے ان مسائل کا حل نسبتا آسان ہو جائے'' (ادب کا ترقی پسند نظریہ)

ایک ترقی پسندانہ فکر کے علم بردار کی حیثیت سے فیض کا بیان تسلیم کر بھی لیا جائے تو اس تخلیقی عمل کے کیا معنی بنتے ہیں جس میں امیجز ٹھوس نہیں رہتے سیال ہو جاتے ہیں' نورانی سی لکیریں یا پھر محض تصویری ہیولا بناتے ہیں۔ اور ان علامتوں کا کیا کرنا ہوگا جن کے ابعاد پھیلتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اندر ہی اندر ایک پیچیدہ معنیاتی نظام وضع ہونا شروع ہو جاتا ہے جو روح کے ساتھ جڑ کر باہر کے سارے مناظر کو ایسی تصویریں بنا دیتا ہے جن کی کوئی توجیح ان عمرانی مطالبات سے نہیں جڑتی جن کا فیض صاحب نے مطالبہ کیا ہے تو کیا ایسے میں باطن کے اس

ارفع تجربے کی بنیاد پر اپنے قاری کو جمالیاتی فرحت اور باطنی ارتفعاع سے ہمکنار کرنے کا سارا عمل تخلیقی سطح پر مردود ٹھہرے گا۔

ایسے میں فیض کی کئی خوب صورت نظمیں مجھے متوجہ کرنے لگی ہیں جو ترقی پسندانہ ادب کی فراہم کی گئی تشریح کو لائق اعتنا نہ جانتے ہوئے بھی اپنے قاری کو اُس کی داخلی اور حسی پس ماندگی سے نکال کر ایک ارفع درجے کی جمالیاتی فرحت سے ہمکنار کرتی ہیں۔ میں ایسی نظموں کو ادب کے اصل وظیفے کی رو سے اس ادب سے زیادہ ترقی پسندانہ سمجھتا ہوں جس میں قاری کو انگیخت کر کے ایک خاص علاقے کی طرف ہانکا جاتا ہے۔ فیض کی نظم ''شام'' ''تنہائی'' اور ''زنداں کی ایک صبح'' اس کی عمدہ ترین مثالیں ہیں۔ ایسی نظموں کے ساتھ ایسی غزلوں کی طرف بھی دھیان جاتا ہے جن کے ذریعے فیض غزل کے کلاسیکی اور رومانوی رنگ کو زندہ کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں ہر کہیں ان کی شخصیت کے سوز و گداز اور محسوساتی شدت نے تخلیقی عمل کو ایک لطیف جمالیاتی حسیت کا حصہ بنا دیا ہے۔

ادب کی جس تنقیدی تھیوری کا چلن فیض صاحب عام کرنے جا رہے تھے اس نے فراز تک آتے آتے بہت سے شاعروں کو گمراہ کیا اور اس نے خود فیض کی شاعری کو بیک وقت دو متضاد رویوں کے مقابل بھی کر دیا۔ میں دور نہیں جاتا صرف ایک مثال سامنے رکھتا ہوں اور یہ مثال پروفیسر فتح محمد ملک کی ہے جن کے دو مضامین میرے سامنے ہیں۔ ایک میں فیض کی شاعری سے دو آوازیں برآمد کی گئی ہیں اور یہاں تک کہہ دیا گیا کہ فیض مشق سخن کے دور میں ہی اپنی ذات کے بنیادی تقاضوں کو سمجھنے کی بجائے اپنے آپ کو شاعری کے رائج الوقت اشترا کی عقائد کے سانچہ میں ڈھالنا شروع کر دیا تھا۔ اور یہ کہ جوش کی طرح فیض کی بھی ایک نہیں دو شخصیتیں ہیں۔ اور بعدازاں جب یہی بات ''شام شہر یاراں'' کی اشاعت پر انیس ناگی نے اپنے مضمون ''بوڑھے شاعر کا المیہ'' میں کہی تو دفع شر کے لیے پروفیسر ملک کا جو مضمون ''فیض اور برہم نوجوان کا المیہ'' سامنے آیا اس میں ان دو آوازوں کو شاعر کی اپنی زندگی اور ذات سے گرہ لگا کر ایک کر دیا گیا۔

فیض ''شاعر کی قدریں'' میں کہتے ہیں کہ آرٹ کی قطعی اور واحد قدر صرف جمالیاتی قدر نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شعر سے جو ہم جمالیاتی فرحت محسوس کرتے ہیں وہ شاعری کی دوسری قدروں سے متاثر ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ شاعر کا تجربہ یعنی مضمون اور اس کا پیرائیہ اظہار ایک ہی پہلو کے دو مظہر ہیں۔ فیض کی اس بات سے اختلاف ممکن نہیں ہے تاہم جب وہ جمالیاتی قدر کو سماجی اقدار کا سا بنا کر افادی فعل جیسا قرار دیتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ اس افادیت سے جمالیاتی قیمت بڑھتی ہے تو لامحالہ اختلاف کی گنجائشیں نکل آتی ہیں۔

''ادب اور جمہور'' کے عنوان سے لکھتے ہوئے وہ ادیب کے ذہن کو ایسا آئینہ قرار دیتے ہیں جس میں سماجی حقیقت نگاری اور اس کا معاشرتی ماحول مجموعی طور پر منعکس ہوتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب

کے بیشتر محرکات خارج میں ہوتے ہیں لیکن وہ اپنا کیمیائی عمل تو انسان کے باطن میں کرتا ہے ایسے میں ادب کا تخلیقی وجود صرف آئینہ نہیں رہتا۔ فیض کی بات مان لی جائے تو اس دوسری عمل کی نفی ہو جاتی ہے جو خارج کو پہلے تلپٹ کرتا ہے نوچتا کھسوٹتا ہے' گالتا اور پیتا ہے اور پھر اس خام مواد سے ایک نئے منظرنامے کو تخلیق کرتا ہے۔

''ہماری تنقیدی اصطلاحات'' میں اپنے تنقیدی مسائل کی نشاندھی کی گئی ہے تشبیہ' استعارہ' سلاست روانی' بے ساختگی' شوخی' ظرافت' سوز و گداز' تصوف' مضمون آفرینی' معاملہ بندی' بندش' قافیہ' صنائع و بدائع یہ وہ تنقیدی اصطلاحات ہیں جو اس مضمون میں زیر بحث آئی ہیں۔ ''فنی تخلیق اور تخیل'' میں فیض نے یہ ثابت کیا ہے کہ تخیل بجائے خود ایک تخلیقی عمل ہے۔ ''خیالات کی شاعری'' والے مضمون میں وہ اطلاع دیتے ہیں کہ اردو شاعری میں بحیثیت مجموعی خیالات کا عنصر دن بدن زیادہ ہوتا جا رہا ہے اور وہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اس سے شاعر زیادہ سنجیدہ اور زیادہ ذمہ دار ہو چلے ہیں۔ انہیں جذبات کی صحت پر اعتماد نہیں رہا۔ بات جذبات اور خیالات کے متناسب امتزاج تک رہتی تو شاید نہ کھلتی۔ ''موضوع اور طرز ادا'' کے باب میں وہ لکھتے ہیں کہ اچھے ادب میں موضوع اور طرز ادا' اصل میں ایک ہی شے کے دو پہلو ہوتے ہیں اور ان میں دوئی کا تصور غلط ہے۔ جس امتزاج کی توقع ''جذبات اور خیالات'' کے باب میں کی جا رہی تھی وہ موضوع اور طرز ادا کے حوالے سے پوری طرح موجود ہے۔ فیض بجا طور پر کہتے ہیں کہ ''موضوع بغیر خوبیء اظہار کے ناقص اور اظہار خوبی موضوع کے بغیر بے معنی ہے۔''

فیض قومی تہذیب کی تشکیل کو بہت اہم گردانتے ہیں ''پاکستانی تہذیب کا مسئلہ'' ان کے نزدیک یہی ہے کہ قومی مقام کو پہچاننے میں کوتاہی ہو رہی ہے۔ ایک اور مضمون میں ہر عہد کے نئے ادب کے بابت وہ کہتے ہیں کہ سماجی عروج و زوال کے ساتھ ساتھ زبان اور ادب کو بھی نشیب و فراز کے مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ ان کا نقطہ نظر ہے کہ اچھے ادب کی تخلیق کے لیے اور لوازمات کی علاوہ انفرادی اور اجتماعی ہیجان کا وجود لازمی ہے۔ ایک اور جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ ہمارے بیشتر نئے شعراء کا بہترین کلام وہی ہے جو ان کے اوائل سخن میں سے ہے۔ یاد رہے یہ وہی الزام ہے جو بعدازاں وزیر آغا نے خود فیض پر لگایا تھا انہیں فیض کی ابتدائی شاعری میں تمثالوں کی تازگی' الفاظ' نیز لفظی تراکیب اور ان کا لہجہ منفرد لگا مگر بعد کی شاعری میں ان کے مطابق فیض نے کلاسیکی غزل کی امیجری اور لفظیات کا کلیشے کی صورت استعمال کیا۔

فیض کے بارے میں یہ متضاد آراء دراصل ان کی تنقیدی معتقدات کے وسیلے سے مسلسل سامنے لائی جاتی رہی ہیں۔ معاف کیجئے کہ میں ڈاکٹر آفتاب احمد کے اس کہے کو گمراہ کن سمجھتا ہوں کہ فیض کو مکمل سمجھنے کے لیے فیض کی شعری تخلیقات کے ساتھ ساتھ ان کے تنقیدی معتقدات کو پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ فی الاصل معاملہ یہ ہے کہ فیض کے یہ تنقیدی مضامین ان کی شاعری کے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ وہ اسرار جو خود فیض کی

شاعری کو بقول کسے زبان پر تیر جانے والی بادہ ءشیراز بنا دیا تھا وہ تو فیض کے ان مضامین میں کھلتا ہی نہیں ہے تاہم ان کی لفظیات اور تراکیب کو ہی کو سب کچھ سمجھ لینے والے فکری فقروں کی گمرہی کا سامان ان میں سے خوب خوب نکلتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ فیض کی شاعری کو پڑھتے ہوئے تو ان کے دولخت ہونے کا تاثر دھیما دھیما اُبھرتا ہے جب کہ ان کے نظریات اور ان کی تنقید پیش نگاہ ہو تو اس تاثر کو ان کی ساری شاعری پر پھیلا دینا پڑتا ہے۔

فیض کا اصل امتیاز اور ان کی بے پناہ مقبولیت کا سبب کچھ لوگوں کے قریب ان کی شخصیت کا گلیمر ہو تو ہو میرے نزدیک یہ ہے کہ فیض نے موضوع اور طرز ادا کا امتزاج تلاش کیا اور اپنے ادب کے ان تخلیقی وسائل کو بروئے کار لائے جن کا تذکرہ وہ ''ہماری تنقیدی اصطلاحات'' والے مضمون میں کرتے ہیں۔ انہوں نے قومی تہذیب کی تشکیل کی سعی بھی کی اور کلاسیکی غزل کی علامات کو اسی تہذیبی تشکیل کے لیے نئی معنویت دی یوں کہ وہ اپنی جڑوں اور روایات کے ساتھ جڑے رہے۔ فیض غالب کے طرف دار رہے اور اقبال کی روایت کو ایک سطح پر اپنایا بھی یوں دونوں کا ایک عجب امتزاج ان کے تخلیقی وجود کا حصہ ہو گیا جسے مارکسیت کا تڑکا بھی میسر تھا۔ انہوں نے مصرعوں کو کھردرا نہیں ہونے دیا' وہ بہاؤ میں خوب رواں رہے اور اثر انگیزی میں انتہائی لطیف۔ ان کے مزاج کے دھیمے پن اور ایک خاص قسم کی نرگسیت نے ان کی ترقی پسندی میں آمیز ہو کر قاری کو یوں متوجہ کیا کہ اسے اپنا دکھ اس میں جھلک دینے لگا اور ساتھ ہی ساتھ ایک لذت بھی اسے مسحور کرنے لگی۔ جہاں کہیں یہ امتزاج نہیں بنا بے شک وہاں دوئی کا احساس بھی ہوا مگر وہاں بھی اسلوبیاتی خصائص نے ان کے معنیاتی رخنوں کو پاٹ دیا اور فیض کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے خلق خدا کو اپنی شاعری میں یاد رکھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خلق خدا نے اپنی بے پناہ محبتیں ان پر نچھاور کیں۔ ☆☆☆

''فیض نے بچپن میں والدہ سے قرآن شریف پڑھا۔ کچھ حصہ قرآن شریف کا حفظ کیا۔ ایم اے انگریزی کیا۔ ایم اے عربی کیا۔ امرتسر کالج میں پڑھایا۔ برطانوی ہند کی فوج میں بھرتی ہوئے اور لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے تک پہنچے۔ پاکستان بننے سے پہلے قائداعظم کی منظوری سے پاکستان ٹائمز اور روزنامہ امروز کے چیف ایڈیٹر بنے۔ بیباکانہ صحافت کے جرم میں ۱۹۴۸ء میں پہلی بار گرفتار ہوئے، مشہور راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار ہوئے۔ مجموعی طور پر تین بار گرفتار ہوئے۔ فیض نے ادب کا لینن پرائز حاصل کیا جسے ''یارلوگوں'' نے ان کی شہرت سے زیادہ رسوائی کا موجب بنا دیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے اولین دورِ حکومت میں وزیراعظم کے مشیر برائے تعلیمی و ثقافتی امور بنے۔ اسی دوران بیوروکریسی سے اختلافات کے باعث مشیر کے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ مارشل لاء کا تیسرا دور آیا تو فیض کچھ عرصہ بعد ملک سے باہر چلے گئے۔ بیروت میں فلسطینی کاز کو تقویت پہنچانے کے لئے کام کیا۔ لوٹس کے مدیر بنے۔ وطن کی کشش پاکستان واپس لائی لیکن شاید یہ مٹی کا بلاوا تھا۔ پاکستان واپسی کے تھوڑے عرصہ بعد ۱۹۸۴ء میں فیض فوت ہو گئے۔ (**میری محبتیں** از حیدر قریشی ص ۱۰۰۔۱۰۱)

محمد عمر کیرانوی (دہلی)

''تزکِ جہانگیری''
سے صدیوں پرانی روایت کی تردید

قصبہ کیرانہ دہلی سے تقریباً ۱۰۰ کلومیٹر کی دوری پر ہے۔ جسے چھٹی صدی ہجری میں راجا کرن پال دت رانا نے بسایا تھا۔ کیرانہ کی سرزمین پر ہر دور میں ایسی عظیم شخصیتیں ہوئی ہیں جنھوں نے کیرانہ کو ہر میدان میں مشہور و معروف کر دیا۔ جیسے غدر کے دور میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی عیسائیت پر ''اظہار الحق'' اور ''ازالۃ الاوہام'' شاندار اور نایاب تصانیف میں شمار ہوتی ہیں۔ اُن جیسے عالموں کی محنت کا نتیجہ ہے کہ کیرانہ کے اطراف میں ۱۰۰۔۱۰۰ کلومیٹر تک عام آدمی عیسائی مذہب سے واقف ہی نہیں، آج تقریباً ۱۵۰ سال بعد بھی عیسائی مشنری نے اِس خطّہ کا رُخ نہیں کیا۔ غدر میں آپ سعودی عرب چلے گئے اور وہاں مدرسہ سولتیہ قائم کیا۔ جو سعودی عرب کا مشہور و معروف مدرسہ ہے۔ ان کی تصنیف ''اظہار الحق'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لندن ٹائمز نے لکھا تھا:

''اگر لوگ اس کتاب کو پڑھتے رہیں گے تو دنیا میں مذہب عیسوی کی ترقی بند بند ہو جائے گی۔''

عربی لغت میں وحیدالزماں کیرانوی کا کوئی غیر عرب ثانی نہیں۔ وحیدالزماں کیرانوی صاحب کی عربی میں تقریباً ۱۰ طرح کی لغت ہیں۔ اُردو ادب میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی کیرانوی کا تصانیف و تراجم کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ بقول مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی، علوی صاحب چلتی پھرتی لائبریری ہیں۔ شباب کیرانوی جو پاکستان کے مشہور فلمساز، ڈائرکٹر اور نغمہ نگار تھے، پاکستان کی فلمی تاریخ میں اُن کا قد بہت بلند ہے۔ خواجہ فریدؒ پر شہزادہ مرزا احمد اختر کیرانوی کی چھوٹی بڑی ۱۰ تصانیف بتائی جاتی ہیں۔ بقول ساجد جتوئی صاحب، (سکریٹری، خواجہ فرید فاؤنڈیشن) اُن میں سے کئی لائبریری، خواجہ فرید فاؤنڈیشن، خانپور، پاکستان میں موجود ہیں۔ مرزا احمد اختر تیمور کے اُنیسویں پوتے تھے۔ اُن کے دو شعر کافی مقبول ہیں:

احمد اختر نام ہے میرا یہ ہے میرا نسب
پوتا ہوں ۱۹واں میں حضرت تیمور کا

حیا آتی ہے یہ کہتے ہوئے ہم شا ہزادے ہیں
فلک نے اس طرح کی کچھ مصیبت ہم پہ ڈالی ہے

نواب مقرب خاں کیرانوی، وزیرِ جہانگیر بادشاہ کا نام کیرانہ میں آج بھی احترام سے لیا جاتا ہے۔ کیرانہ کی تاریخ میں جب بھی کوئی جھانکتا ہے اس کو مقرب خاں کیرانوی کی شخصیت مسحور کر لیتی ہے۔نواب صاحب بادشاہ جہانگیر کے ایّامِ شہزادگی کے وفادار ساتھی تھے۔مقرب خاں کیرانوی کو جہانگیر نے کئی مرتبہ خاص مہموں پر بھیجا اور جب بھی کسی ذمّہ داری میں معتمد وزیر کی ضرورت ہوتی وہ ذمّے داری مقرب خاں کیرانوی کو سونپی جاتی۔شاید اسی وفاداری کو دیکھتے ہوئے جہانگیر بادشاہ نے شیخ حسن کو ''مقرب خاں'' کا خطاب عطا کیا تھا۔

''تزکِ جہانگیری'' کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوئی کہ بادشاہ جہانگیر کیرانہ میں دوبار آیا تھا۔ ایک مرتبہ کیرانہ کے قرب میں پڑاؤ ڈالا تھا۔تب اطراف کیرانہ کے امراء نے بادشاہ جہانگیر کو نذرانے پیش کئے تھے۔ایک مرتبہ جہانگیر اہلِ حرم کے ساتھ کیرانہ میں دو دِن اور ایک رات مقرب خاں کیرانوی کے مہمان رہے تھے۔جس جگہ پر بادشاہ جہانگیر کا دربار لگا تھا وہاں آج بھی مسجد درباروالی موجود ہے۔

بادشاہ جہانگیر نے ''تزکِ جہانگیری'' میں اس سیر کی روداد یوں لکھی ہے:

''روز جمعہ بست ویکم بہ پرگنہ کرانہ نزول سعادت اتفاق افتاد پرگنہ مذکور وطن مالوف مقرب خان است آب وہوایش معتدل وزمینش قابل مقرب خان درانجا باغات وعمارات ساختہ چون مکرر تعریف باغ او بعرض رسیدہ بود خاطر را بسیر آں رغبت افزود روز شنبہ بیست ودوم با اہل حرم از سیر آن باغ محظوظ گشتم بے تکلف باغے است بغایت عالی و دلنشیں انچہ دیوار پختہ ودر آن برکشیدہ وخیابا منارا فرش بستہ یکصد وچہل بیگہہ است ودرمیان باغ حوضے ساختہ است طول دو بست وبیست درع عرض دو بیست درع ودرمیان حوض صفہ ماہتابی بیست ودو درع مربع وہیچ درخت گرم سیرے وسرد سیرے نیست کہ دران باغ نباشد از درختہاے میوہ دار کہ درولایت میشود حتٰی نہال پستہ سبز شدہ سروہاے خوش قد باندام دیدہ شد کہ تا حال باین خوبی و لطافت سرد بنظر در نیادہ باشد فرمودم کہ سروہا را بشمارند سیصد درخت بشمار درآمد دراطراف حوض عمارات مناسب اساس یافتہ ہنوز درکارند''

(''توزک جہانگیری'' فارسی، نورالدین جہانگیر، مرتبہ مرزا محمد ہادی، مطبع نولکشور، جلد۔۲، صفحہ ۲۸۶)

ترجمۂ انگریزی:

On, Sunday, the 16th, I marched from delhi, and on Friday the 21st, halted in the pargana of Kairana, This pargana is the native place of Muqarrab K. Its climate is equable and its soil good. . Muqarrab had made buildings and gardens there. As I had often heard

praise of his garden, I wished much to see it. On Saturday, the 22nd, I and my ladies were much pleased in going round it, Truly, it is a very fine and enjoyable garden. Within a masonry (pukhta, pucca) wall, flower-beds have been laid out to the extent of 140 bighas. In the middle of the garden he has constructed a pond, in length 220 yards, and in breadth 200 yards. In the middle of the pond is a mah-tab terrace (for use in moonlight) 22 yardssquare.There is no kind of tree belonging to a warm or cold climate that is not to be found in it. Of fruit-bearing trees belonging to Persia I saw green pistachio-trees, and .cypresses of graceful form, such as I have never seen before. I ordered the cypresses to be counted, and they came to 300. All round the pond suitable buildings have been begun and are in progress.

(Tuzuk-i-Jahangiri or memoirs of Jahangir,Translated by Alexander Rogers,Atlantic publisher, Drya ganj, New delhi-2, page112, v2)

ترجمہ:

''۲۱رتاریخ کو پرگنہ کیرانہ میں آنے کی سعادت مندی کا اتفاق پڑا۔ پرگنہ مذکورہ وطن مالوف مقرب خاں کا ہے۔اِس کی آب وہوا معتدل اور کیرانہ کی زمین اہلیت رکھنے والی ملی ہے۔مقرب خاں نے وہاں پر باغات اور عمارات بنائے ہیں جب دو مرتبہ تعریف باغ کی پیش کی گئی تو دل کو اس باغ کی سیر کرنے کی رغبت پیدا ہوئی شنبہ یعنی پیر کے روز جبکہ تاریخ ۲۲رہوگئی میں گھر والوں کے ساتھ اس باغ کی سیر سے خوش ہوگیا ہوں یہ باغ تکلفات سے خالی اور بلند مرتبہ و دل نشیں ہے ۔ پکی دیوار اس کی گھیر میں کھینچ دی گئی اور کیاریوں کو نکالا گیا ہے۔ ایک سو چالیس بیگہ زمین ہے اور بیچ باغ ایک حوض ہے لمبائی دو سو بیس گز ہے۔ درمیان حوض کے 'صفۂ ماہتابی' (چاند سے فیضیاب) نامی چبوترہ ہے جو کہ بائیس گز مربع ہے اور باغ میں کوئی بھی پیڑ ایسا کہ گرمی کی سیر اور سردی کی سیر کے لئے موزوں ہو وہاں باغ میں موجود۔میوہ دار درخت جو کہ ولایت میں ہوتے ہیں یہاں تک کہ پستہ کے پودے بھی سرسبزی کی شکل میں اور خوش قد اور خوش بدن سرو کے پیڑ اس قسم کے دیکھے کہ اب تک کہیں بھی ایسے خوبی اور لطافت والے سرو نہیں دیکھے گئے میں نے حکم دیا کہ سرو کے پیڑوں کو شمار کریں۔تین سو پیڑ شمار میں آئے اور حوض کے آس پاس مناسب عمارتوں کا پتہ بھی چل رہا ہے۔''

کیرانہ کے تاریخی نولکھا باغ اور حوض سے متعلق ایک روایت سینہ در سینہ چلی آ رہی ہے۔میرے والد ماسٹر حاجی شمس الاسلام مظاہری نے اس روایت کو مجھے یوں سنایا:

جہانگیر بادشاہ کی زوجہ جوکہ نور جہاں کے علاوہ تھیں، کے پیٹ میں درد ہوا تو علاج معالجہ کے لئے مختلف علاقوں سے وید حکیم بلائے گئے۔ انہوں نے مختلف علاج وتدابیر پیٹ کے درد کو دور کرنے کی کیں لیکن ناکام رہے۔ اسی علاج معالجہ کے دوران کسی درباری نے نواب مقرب علی خاں کے والد صاحب کا نام بتایا کہ کیرانہ میں ایک ہوشیار حکیم ہیں۔ حکیم صاحب اس مرتبہ پر کیسے آئے؟ ان کی داستان اس طرح ہے کہ حکیم صاحب ایک مقبول اورخدا کے پیارے بندے تھے۔ ان کو عملیات سے شغف تھا ایک دن انہوں نے ایک لکڑ ہارے کو دیکھا کہ لکڑیوں کا بڑا گٹھڑ سر پر اٹھائے لئے جارہا ہے مگر حالت یہ تھی کہ شیشہ کی طرح اُس کا اندرونی جسم دکھائی دے رہا تھا۔ حکیم صاحب نے دیکھا اور جانا کہ کیا عجوبہ ہے۔ انہوں نے سمجھا کہ یہ لکڑیاں کسی آسیب زدہ پیڑ سے لی گئی ہیں انہوں نے لکڑ ہارے کو آواز دی اور پوچھا یہ لکڑیاں کتنے کی ہیں۔ اس نے ''ہشت فلس'' کا جواب دیا یعنی آٹھ پیسے۔ حکیم صاحب نے اُس کی ایک ایک لکڑی کو اُس کے سر پر رکھوا کر دیکھا جب وہ لکڑی آئی جس میں خصوصی اثر آسیب کا تھا اور سر پر رکھی گئی تو لکڑ ہارے کا تمام جسم آئینہ کے مثل نظر آنے لگا۔ آنت، جگر، گردے، دل صاف نظر آنے لگے۔ حکیم صاحب نے وہ لکڑی اپنے پاس رکھ لی۔ باقی لکڑیاں لکڑ ہارے کو واپس کردی اور اُس کو آٹھ پیسے قیمت لکڑیوں کی بھی دیدی۔ حکیم صاحب نے وہ لکڑی رکھ لی اور جس مریض کو دیکھنے جاتے اس سے ذاتی حالات معلوم کرتے اور وہ لکڑی بھی سَر پر رکھ دیتے جس سے مرض کی پوری کیفیت سامنے آجاتی اور اُن کی دوا کارگر ہوتی ان کی شہرت دور دور پہونچی اور جب رانی کے پیٹ میں درد ہوا تو جہانگیر بادشاہ کو کیرانہ کے باشندے حکیم صاحب کا پتہ بتایا گیا۔ انہوں نے باعزت دربار میں طلب کیا اور رانی کے علاج کی تدابیر میں لگے اور ذاتی معاینہ کیا کہ درد کا سبب کیا ہے۔ حکیم صاحب نے جب رانی کے سر پر جب وہ کرشمہ ساز لکڑی رکھی تو پتہ چلا کہ رانی حاملہ ہے اور بچہ کا ایک ہاتھ بچہ دانی سے باہر نکلا ہوا ہے اور اُس نے آنت پکڑ رکھی ہے جس کے باعث یہ درد ہے۔ حکیم صاحب نے بادشاہ کے خادموں کو کہا کہ چالیس سیر راکھ لائی جائے اور ایک سیر گوکھرو کانٹے بھی لائے جائیں۔ پہلے پانچ گز زمین پر راکھ بچھائی جائے پھر اُس میں گوکھرو ملائے جائیں جوکہ دیکھنے میں نہ آئے۔ رانی کو اس کاروائی کی مطلق اطلاع نہ ہو۔ چالیس سیر راکھ منگا کر اُس میں گوکھرو چھپادئے گئے۔ پھر حکیم صاحب نے رانی کو بلوایا اور راکھ پر چلنے کو کہا جب وہ راکھ پر چلی تو گوکھرو نظر نہیں آئے۔ گوکھرو کے کانٹے جب اُس کے پیر میں چبھے اور وہ اچھلی تو راکھ سے باہر آنے لگی اسی ایک دو اچھل کود کے جھٹکے سے بچہ نے انتڑی کو چھوڑ دیا۔ کچھ دیر بعد حکیم صاحب نے رانی سے کہا کہ تمہاری طبیعت اب کیسی ہے۔ رانی نے کہا میں بالکل ٹھیک ہوگئی۔ یہ سب اطلاعات جہانگیر بادشاہ کو دی گئی اور اُس نے خوش ہوکر کہا بولئے حکیم صاحب کیا انعام چاہتے ہیں۔ حکیم صاحب نے کہا مجھے کچھ نہیں چاہئے اگر آپ دینا چاہتے ہیں تو میرے لڑکے مقرب علی خاں کو اپنا وزیر بنالیجئے اور اُس کو جاگیر خرچ کے لئے عطا کردیجئے۔ جہانگیر بادشاہ نے کرنال کیرانہ کی جاگیر نواب مقرب علی خاں کو دے دی۔ نواب مقرب علی خاں نے

اس جاگیر کو پا کر سوچا کہ یہ تو چٹیل میدان ہے۔ جہاں گنّا، گیہوں کی کاشت کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ انہوں نے کیرانہ میں محل بنایا جس کا نشان آج بھی نواب دروازہ کے نام سے مشہور اور موجود ہے۔ باپ سے عرض کیا کہ آپ اپنے خادم جنوں سے ایک تالاب بنوادیں جو چاروں طرف سے پٹڑی دار ہو۔ اس میں چاروں طرف سے اترنے کے راستے ہوں اور بیچ میں ایک چبوترہ ہو اور میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ آپ کے ماتحت جنات میرے محل سے تالاب کے چبوترے (صفۂ ماہتابی) تک بیگمات کے لئے باپردہ آنے جانے کو ایک سرنگ بھی بنادیں۔ چنانچہ جنوں نے بڑے بڑے پتھر ڈھو کر تالاب اور بیچ میں چبوترہ بنادیا اور چبوترہ سے محل تک سرنگ کا راستہ بھی بنا دیا تالاب میں پانی آنے کے لئے جمنا ندی سے پانی خاص جھیل میں آجاتا اور وہاں سے یوسف والے جوہڑ میں آجاتا اور وہاں سے بذریعہ کچا نالہ بابا مٹی جوہڑ میں آتا وہاں مٹکوں والی عمارت سے بذریعہ جھرنوں کے تالاب میں پانی آجاتا۔ جھرنے، مٹکے اور تالاب ابھی تک موجود ہیں۔ تالاب کے مغربی حصہ میں بھول بھلیاں کی شکل پر ایک گڑھی بنی ہوئی ہے جہاں نوابی زمانہ میں شکار اور تفریح کے لئے ملاح کشتیاں لئے ہروقت موجود رہتے تھے۔ اسی بیچ نواب صاحب کو سوجھی کہ ایک بہت بڑا باغ لگوایا جائے۔ جس میں کم از کم نولاکھ پیڑ ہوں اس کاروائی کے لئے انہوں نے اُس قاتل راجپوت پناہ گزیں سے کہا وہ راجستھانی راجپوت پیشہ سے مالی تھا اور وہ راجستھان میں کسی قتل میں ملوث تھا۔ نواب نے اس سے کہا کہ اگر تم ہماری خدمات قبول کرو اور ہمارا کہا مانو اور نولاکھ پیڑ لگاسکو جو ہمارا منصوبہ ہے تو ہم تم کو بادشاہ کی طرف سے قتل کیس سے بری کراسکتے ہیں۔ آنے والے راجپوت راجستھانی نے کہا میں اکیلا اس کام کو کیسے کرسکتا ہوں تو نواب صاحب نے کہا تم اپنا سبھی خاندان یہاں لے آؤ۔

نولکھا باغ کا کام شروع ہوا تو پانی کی فراہمی کا مسئلہ سامنے آیا۔ نواب صاحب نے پھر اپنے ابا حضور کے سامنے پانی کا مسئلہ رکھا کہا کہ نولاکھ پیڑوں کی سیچائی کے لئے کم از کم تین سو بڑے بڑے کنوئیں درکار ہوں گے چنانچہ حکیم صاحب نے جنّات کے ذریعہ بڑے بڑے دودھی پتھروں کے تین سو کنوئیں جانب مغرب کیرانہ میں بنوادئے جوکہ باغ کی سیچائی کا ذریعہ تھے۔ یہ تین سو کنوئیں آج بھی بذریعہ ملکیت یا موروثیت مالی اور راعین برادری کے قبضہ میں ہیں۔

جب ساجد جتوئی صاحب (خواجہ فریدؒ فاؤنڈیشن، خانپور، پاکستان) نے کیرانہ کے ایک شخص شہزادہ مرزا احمد اختر کی تصانیف کی تلاش میں مدد مانگی تو مرزا احمد اختر کے رشتے کے بھانجے سلیم اختر فاروقی اور میں نے کیرانہ کے بزرگوں سے بات چیت کی۔ کتب خانوں، ذاتی کتب خانوں میں تاریخی کتابوں میں مرزا احمد اختر تلاش کرنے لگے تو انکشاف ہوا کہ کیرانہ میں جو صدیوں سے روایت چلی آرہی ہے اس کا کوئی ثبوت تاریخ میں نہیں کہ یہ تعمیرات جنّات نے کی اور نواب مقرب خاں وزیرِ جہانگیر بادشاہ کا نام مقرب علی خاں نہیں ہے۔ ''تزکِ جہانگیری'' کے حوالوں سے اس روایت کی تردید ہوتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

’’شیخ بہا کا بیٹا شیخ حسن جو بچپن سے میری خدمت انجام دے رہا تھا اور جس کی خدمت سے خوش ہو کر میں نے ایّام میں شہزادگی میں ’’مقرب خاں‘‘ کا خطاب عطا کیا تھا ہمیشہ اپنے کام میں چست و چالاک ثابت ہوا اور جب میں شکار کھیلنے جاتا تھا تو میلوں میرے آگے آگے پیدل دوڑا کرتا تھا۔ وہ اور اس کے آباء اجداد تیر و کمان اور بندوق چلانے اور فن جراحت میں یکتائے روزگار تھے...‘‘

(’’تزک جہانگیری‘‘ اردو، تصنیف نورالدین جہانگیر بادشاہ، ترجمہ مولوی احمد علی صاحب رامپوری، نظرِ ثانی جمیل الدین احمد، ص۵۲)

’’ایک بیوہ عورت نے میرے حضور میں فریاد کی کہ مقرب خاں نے کھمبایت کی بندرگاہ میں میری لڑکی کو زبردستی اپنے گھر میں ڈال رکھا ہے۔ میں نے اُس سے طلب کیا تو اُس نہ کہہ دیا کہ وہ اپنی موت مرگئی میں نے اُس واقعہ کی تحقیقات کی تو اس ظلم کا ذمہ دار اس کا ایک ملازم تھا...‘‘

(’’تزک جہانگیری‘‘ اردو، تصنیف نورالدین جہانگیر، ترجمہ مولوی احمد علی صاحب رامپوری، نظرِ ثانی جمیل الدین احمد)

’’نور جہاں بیگم جو عرصہ دراز سے علیل تھی ہندو مسلمان شاہی اطبّا کے معالجے کے باوجود کوئی افاقہ نہ ہوتا تھا۔ اب انہوں نے بھی مزید علاج سے معذرت مانگ لی۔ لیکن کچھ دن ہوئے کہ حکیم روح اللہ نے آستان بوسی کی سعادت حاصل کی تھی اور اُس نے بیگم کا علاج اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کہ فضل و کرم سے روح اللہ کے دستِ شفا سے اُسے مکمل صحت ہوگئی اس لیے میں نے اِس خدمت کے صلے میں حکیم کو منصب عنایت کرتے ہوئے اُس کے آبائی وطن میں تین گاؤں بطور جاگیر عطا کئے۔ پھر اُس کو چاندی میں تول کر وہ چاندی اُسی کو عنایت کردی۔‘‘ (’’تزک جہانگیری‘‘ اردو، تصنیف نورالدین جہانگیر، ترجمہ مولوی احمد علی صاحب رامپوری، نظرِ ثانی جمیل الدین احمد، ص۳۰۰)

اِن حوالوں سے واضح ہوتا ہے کہ مقرب خاں کا نام شیخ حسن تھا اور ’’مقرب خاں‘‘ خطاب تھا۔ جبکہ اہلِ کیرانہ نواب مقرب علی خاں کہتے ہیں اُن کی دلیل ہوتی ہے کہ پانی پت میں نواب کے مزار پر نواب مقرب علی خاں کیرانوی لکھا ہے۔ مزار پر غلط نام کا لکھا جانا، اور خطاب کے بیچ میں ’علی‘ کا رائج ہونا ایک تحقیق طلب بات ہے۔ دوسری بات تعمیرات کا جنات کے ذریعہ تعمیر ہونے کا کوئی مستند ثبوت نہیں ہے، ہو بھی کیونکر تاج محل جیسا عظیم شاہکار انسانوں کا بنایا ہوا ہمارے سامنے ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مقدّس عمارتوں میں غیبی مدد تو رہی مگر یہ نہیں ہوا کہ ایک رات میں عمارت مکمل بنا کر سونپ دی جائے۔

ان حوالوں سے ایک بات اور واضح ہوتی ہے کہ نواب مقرب خاں کیرانوی کے والد وہ حکیم نہیں تھے جنہوں نے جہانگیر کی بیوی کا علاج کیا تھا اُن کے والد کا نام شیخ بہا تھا جبکہ یہ حکیم روح اللہ ہیں اور اِن کو کوئی غیر

معروف جاگیر انعام میں دی تھی جبکہ مقرب خاں تو جہانگیر بادشاہ کے بچپن کے وفادار تھے اور ان کے خالہ زاد بھائی نواب محمود علی جھنجھانہ میں پانصد سوار کے عہدہ و منصب سے ممتاز تھے۔

بادشاہ جہانگیر کی تصنیف ’’تذکرہ جہانگیری‘‘ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی کہ نواب کا نام مقرب خاں تھا اور اُن کو جاگیر بطور انعام نہیں ملی بلکہ وہ مغلیہ خاندان سے پہلے سے وابستہ تھے اور تعمیرات کیرانہ کا جنات کے ذریعہ تعمیر ہونے کی روایت میں کوئی سچائی نہیں۔☆☆☆

نذر خلیق (خانپور)

khaleeqkhanpur@yahoo.com

اردو کی اہم ادبی ویب سائٹس

www.kitaabghar.com اردو کی ایک بالکل نئی لیکن بہت اہم ویب سائٹ ہے۔اس پر اردو کی کتابیں مکمل طور پر آن لائن کی جارہی ہیں۔کئی اہم ادباء کی کتب یہاں دستیاب ہیں اور مزید ادباء کی کتب بھی آن لائن کی جارہی ہیں۔اس طرح سے یہ اردو کتابوں کی سب سے پہلی آن لائن لائبریری بن چکی ہے۔اس کے کرتا دھرتا کاشف الہدیٰ اور حسن علی ہیں۔ جبکہ حیدر قریشی کا تعاون بھی اس سائٹ کو حاصل ہے۔وہ تمام شاعر اور ادیب جو اپنی کتب اس ویب سائٹ پر دینا چاہیں براہِ راست ان تین ای میل ایڈریسز میں سے کسی ایک پر یا سب پر رابطہ کر کے انٹرنیٹ کی دنیا میں شامل ہو سکتے ہیں۔

کاشف الہدیٰ (امریکہ): webustaad@urdustan.net

حسن علی (لاہور): webeditor@urdustan.net

حیدر قریشی (جرمنی): HQG7860000@aol.com

www.urdupoint.com اردو پوائنٹ اردو کی جنرل ویب سائٹ ہے،اس کا زیادہ تر انداز صحافیانہ ہے لیکن اس میں جو شعری اور دوسرا ادبی حصہ ہے،اس کا ایک بڑا حصہ ادبی اعتبار کا حامل ہے۔ جہاں تک اردو پوائنٹ کے صحافتی پہلو کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ویب سائٹ پاکستان کی انٹرنیٹ صحافت میں اپنی منفرد خصوصیات کی حامل ہے۔لاہور کے علی چوہدری اس ویب سائٹ کے کرتا دھرتا ہیں۔

http://sherosukhan.tripod.com/ کینیڈا میں مقیم سردار علی کی یہ ویب سائٹ اپنی پیش کش کے عتبار سے بڑی جاذبِ نظر ہے۔کینیڈا کی مقامی ادبی رپورٹس سے لے کر اردو رائٹرز ایٹ یاہو گروپس کی سرگرمیوں تک کو اپنی سائٹ پر سردار علی بہت عمدگی سے پیش کرتے ہیں۔ادبی تحریروں کے انتخاب میں انہوں نے اپنے معیار کو بتدریج بہتر بنایا ہے۔اچھی تحریروں کو پیش کرنے میں وہ اتنا اچھا انداز اختیار کرتے ہیں کہ جن کی تحریریں وہاں سجائی جاتی ہیں،وہ بھی اپنی تحریروں کی پیش کش کے انداز کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔

http://urdu_adab.tripod.com کینیڈا سے فیصل فارانی نے ایک ویب سائٹ

اردو ادب کے نام سے قائم کی ہے۔اس کے لئے انہوں نے کسی خاص معیار یا طریق کار کا تعین نہیں کیا۔بس بیٹھ کر سوچا کہ اردو ادب کا ایک معیاری حصہ ویب سائٹ پر پیش کیا جائے۔اور پھر جو کچھ اپنے طور پر جمع کر پائے اسے سائٹ پر پیش کر دیا۔اس لحاظ سے یہ خالصتاً ادبی ویب سائٹ ہے۔ جتنا میٹر اس سائٹ پر پیش کیا گیا ہے بلا شبہ ادب کے ایک معیار پر پورا اترتا ہے۔

www.urdunet.com دہلی میں اصغر انصاری کی یہ ویب سائٹ اردو کی ایک بڑی جنرل ویب سائٹ ہے۔اس پر سیاست اور صحافت کا رنگ غالب ہے۔اس کا سیکشن **ادبی دنیا** اپنی جگہ اردو کی ایک ادبی دنیا بسائے ہوئے ہے۔ادبی دنیا میں شاعری کی کئی اصناف کو کھپایا گیا ہے۔نثر میں افسانوں کے ساتھ ناول،ڈرامہ اور دوسری اصناف کے لئے بھی جگہ بنائی گئی ہے۔ادیبوں کی ڈائریکٹری بھی زیرِ تکمیل ہے۔ابھی تک اس میں دو سو کے قریب شاعروں اور ادیبوں کے کوائف فراہم کئے جا چکے ہیں۔ ان دنوں ادبی دنیا کے ہوم پیج کا سیٹ اپ تبدیل کرنے کی وجہ سے ’Re-uploading‘ ہو رہی ہے۔

http://www.urdupages.com یہ اس لحاظ سے ادبی ویب سائٹ تو نہیں ہے کہ اسے ادبی ویب سائٹس کے ذکر میں شامل کیا جائے لیکن جیسے اردو لغت کی ویب سائٹ کو اس حصہ میں شمار کیا جا چکا ہے اسی طرح اس سائٹ کو بھی شمار کیا جانا چاہئے۔یہ خالص ٹیکنیکل نوعیت کی ویب سائٹ ہے جہاں شرکت کرنے والوں کو اردو پروگرام کے بارے میں تربیت دی جاتی ہے۔اردو پروگرام کو فروغ دینے والی کوئی بھی ویب سائٹ ایک رنگ میں ادبی خدمت ہی انجام دے رہی ہے۔انگلینڈ میں قائم عرفان نواز کی یہ ویب سائٹ اردو پروگرام سیکھنے والوں کے لئے ایک رہنما کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔اردو پروگرام سے منسلک اردو شاعر اور ادیب کسی ٹیکنیکل مسئلہ کی صورت میں اس ویب سائٹ **اردو پیجز** سے رجوع کر سکتے ہیں۔

http://groups.yahoo.com/group/urdu_writers/ یاہو گروپس میں خالصتاً اردو کا یہ پہلا گروپ قائم کیا گیا ہے۔اس کے اونر کاشف الہدیٰ اور ماڈریٹر حیدر قریشی ہیں۔اس پر دنیا بھر سے اردو شعرا اور ادیب حضرات اپنی اہم تخلیقات اور ادبی سرگرمیوں کی خبریں اور رپورٹس بھیجتے ہیں۔اس سائٹ سے ریلیز کئے جانے والے میٹر سے اس وقت تین اہم ویب سائٹس اردو دوست،اردوستان اور شعر و ادب براہِ راست استفادہ کر رہی ہیں۔یہاں ان پیج فائل سے اور گف فائل سے اردو میں خبریں اور رپورٹس جاری کی جاتی ہیں۔اس سائبر ادبی حلقہ کی رکنیت کے حصول کے لئے اس ایڈریس پر ایک سادہ ای میل بھیج کر رکنیت حاصل کی جا سکتی ہے۔

urdu_writers-subscribe@yahoogroups.com اگر کسی دوست کو رکنیت حاصل کرنے میں دقت پیش آئے تو مجھے ای میل کر دیں۔میں خود ان کی میل رکنیت کے لئے آگے بھیج دوں گا۔اور رکنیت مل جانے کے بعد آپ بھی اپنے علاقہ کی ادبی رپورٹس ساری دنیا کے سامنے پیش کر سکیں گے۔ (جاری ہے)

حیدرقریشی (جرمنی)

خورشیداقبال کی شاعری

خورشیداقبال کی شخصیت کے تین حوالے میرے لئے بہت اہم ہیں۔پہلاحوالہ اردودوست ڈاٹ کام کے کرتا دھرتا ہونے کا ہے۔میں ان کی ویب میکنگ کی صلاحیتوں سے واقف ہی نہیں ان سے فیضیاب بھی ہوتا رہتا ہوں۔سائنس کے طالب علم (اوراستاد) ہونے کے ناطے سائنس سے ان کی نصابی حد سے آگے کی دلچسپی زندگی اورکائنات کوسائنسی حوالے سے دیکھنے اور سمجھنے کا رویہ ہے جوعام طور پر ہمارے سائنس کے کئی پروفیسروں کوبھی اس حدتک نصیب نہیں ہوسکا۔خورشیداقبال کی شخصیت کا تیسرا اہم حوالہ ان کی شاعری ہے۔اس وقت ان کی یہی حیثیت میرے مدنظر ہے۔ان کی شاعری میں غزل کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔انہوں نے جونظمیں لکھی ہیں وہ زیادہ ترنظم کی پرانی اورترقی پسندروایت کے مطابق لکھی ہیں۔ایسی نظمیں تسلسلِ خیال کے ساتھ کسی حدتک غزل کے زیراثر رہتی ہیں۔

خورشیداقبال کی غزل میں ویسے تو موضوعات کی رنگارنگی ہے لیکن حالیہ برسوں میں 'سیکولر ہندوستان' میں مسلمان جتنا غیرمحفوظ اور بےتوقیر ہوا ہے اس کے شدید اثرات ان کی غزل کی نمایاں پہچان بنتے جارہے ہیں۔اور ایسے اشعارصرف ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی ہی نہیں کرتے بلکہ خورشیداقبال کی غزل کی پہچان بھی بنتے جارہے ہیں۔

سراپنے اعتبار کا خم کر کے رکھ دیا   جھوٹے قلم نے سچ کوقلم کر کے رکھ دیا

خورشیدؔ ہم نے آج غزل کی زبان میں   دل کا تمام کرب رقم کر کے رکھ دیا

کیا پڑھیں خورشیدؔ اب خبروں کو ہم تفصیل سے   خون کے آنسو رلانے کو بہت ہیں سرخیاں

قدموں میں پتھروں کے نہ سرکو جھکایئے   اب وقت آ گیا ہے کہ تیشہ اٹھایئے

کیسے لگی؟ کہاں سے لگی؟ سرغنہ ہے کون؟   تحقیق ہو گی ، آگ تو پہلے بجھایئے

دیوارِ احتیاط گری ، آگ لگ گئی   چنگاری اک ذراسی اڑی ،آگ لگ گئی

اک زندگی اوراتنے مسائل مرے خدا   سیلاب آ گیا ، تو کبھی آگ لگ گئی

موت کے خوف سے ہرآنکھ ہے پتھرائی ہوئی   منصفِ شہر کی قاتل سے شناسائی ہوئی

موت رقصاں رہی سڑکوں پہ گلی کوچوں میں   زندگی بھاگتی پھرتی رہی گھبرائی ہوئی

ایک راون سے لڑے تھے رام اوردی تھی شکست   آج تو ہم ہیں ہزاروں راونوں کے درمیاں

وقت سلجھاتا رہے گا مسئلوں پر مسئلے   زندگی کٹتی رہے گی الجھنوں کے درمیاں

ان اشعار کو اوران میں بیان کی گئی علامتوں اوراستعاروں پرغور کیا جائے تو ہندوستان میں مسلمانوں کی سماجی اور سیاسی حیثیت سے لے کرانسانی نفسیاتی کیفیات تک ،سارا منظر پوری طرح سامنے آجاتا ہے۔

جب اس قسم کے حالات کا سامنا ہواوراس انداز کی شاعری ہوتو اس پر ترقی پسندتحریک کے اثرات بھی آسانی سے دیکھے جاسکتے ہیں۔خورشیداقبال کے ہاں غربت کے پیداکردہ مسائل سے لے کرآج کے امریکہ کے پیداکردہ مسائل تک ترقی پسند لہجے کی چھاپ یوں بولتی ہے۔

گراں ہواس کے لئے کیوں نہ اپنی جان کابوجھ   وہ ہے اٹھائے ہوئے ایک خاندان کابوجھ

سبھی بناتے رہے گاؤں کا قلم سے نصیب   کوئی نہ بانٹنے آیا کسی کسان کا بوجھ

آگ برساکرفضا سے جیت لوگے تم زمیں   پرحکومت کے لئے تو آدمی بھی چاہیے

یہی اثرات ان کی نظموں میں درآئے ہیں۔''زندگی''۔''اک نیا تاج محل'' اور''مایوس لمحات کا مشورہ'' جیسی نظمیں تو براہ راست ترقی پسندافکار کی گونج محسوس ہوتی ہیں۔تاہم اسی پس منظر میں ان کے ہاں''مثلث'' جیسی عمدہ نظم بھی ملتی ہے جوان کا ایک سادہ مگر پرتاثیر شعری تجربہ بن جاتی ہے۔

شہر کی بھیڑمیں/بیچ بازارمیں/اک دھماکہ ہوا/۔۔۔اور واں سے بہت دور/اک گاؤں میں/ایک گوری کے ہاتھوں میں/چھن چھن چھنکتی ہوئی چوڑیاں/ریزہ ریزہ ہوئیں۔۔۔۔/اور واں سے بہت دور/اک دوسرے شہر کے/ایک کمرے میں/کچھ جام ٹکرائے تھے/قہقہے چند ہونٹوں پہ لہرائے تھے/۔۔۔اور یوں/تین بے ربط سے/زاویئے مل گئے/اک مثلث بنا/کرب کا !

ان کی ایک اورسادہ سی نظم''تم بِن'' موضوع کے لحاظ سے بالکل مختلف ہوکراپنے اندر سادگی اورجذبات کی سچائی کا معصومانہ انداز لئے سامنے آتی ہے۔نظم دیکھئے :

سات دن ہو گئے تھے تم کو گئے
سات دن سے عجیب عالم تھا
بکھرے بکھرے سے اپنے کمرے میں

سگرٹوں کے دھوئیں میں خاموشی
یوں گھلی تھی کہ دم گھٹے جس میں
فوم کے نرم نرم بستر میں
فصل جیسے اگی تھی کانٹوں کی
کتنی بوجھل فضا تھی مت پوچھو
دفعتاً فون کی بجی گھنٹی
''آپ کیسے ہیں؟'' تم نے پوچھا تھا
اور مجھ کو لگا تھا اک پل میں
سارا عالم بدل گیا جیسے
کرب خوشیوں میں ڈھل گیا جیسے!

یہاں آکر اندازہ ہوتا ہے کہ خورشید اقبال کے ہاں موضوعاتی وسعت کے امکانات موجود ہیں۔ یہ امکانات ان کی غزل کے ایسے اشعار میں بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔

دلربائی کے لئے تو دلکشی بھی چاہئے ۔۔۔ حسنِ سرکش میں مگر کچھ سادگی بھی چاہئے
زیست کیا ہے؟ گرمیٔ حالات کے درجات، بس ۔۔۔ صبح ٹھنڈی، گرم دن اور پھر اُمس کی رات، بس
وسعتیں مجھ کو خلاؤں کی بھلا روکیں گی کیا ۔۔۔ حوصلے بے انتہا اور آسماں ہیں سات، بس
بپھرتی خواہشیں دل میں سنبھال کر رکھنا ۔۔۔ بڑا کٹھن ہے درندوں کو پال کر رکھنا

اپنے اردگرد کے شعراء میں خورشید اقبال کو اپنی ادبی حیثیت کا اندازہ ہے لیکن وہ خود کو ادب کی کسی مقامی تقسیم کی بجائے ادب کے پورے منظر نامے میں دیکھنا پسند کرتے ہیں، اسی لئے وہ مقامی مشاعرہ بازی کی واہ واہ سے متاثر ہونے کے بجائے اپنے آپ کو تاکید کرنے لگتے ہیں۔

جو نہ پگھلا سکے لفظوں سے جگر پتھر کا ۔۔۔ شاعری وہ کہاں بس قافیہ پیمائی ہوئی
تو ابھی خود کو سخنور نہ سمجھ لے خورشیدؔ ۔۔۔ مانا دنیا ترے اشعار کی شیدائی ہوئی

جب انسان کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کے بجائے عرفان اور گیان کی اس سطح تک آجاتا ہے تو اس کے لئے تخلیقی طور پر زیادہ فعال ہونا ممکن ہو جاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ خورشید اقبال تخلیقی طور پر مزید فعال ہوں گے اور اسی گیان کی روشنی میں قدم آگے سے آگے بڑھاتے چلے جائیں گے۔ میں ان کے لئے دعا گو ہوں۔

؎ اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے!

منشا یاد (اسلام آباد)

ابتدائیہ

افسانہ: ایک صدی کا قصہ

(**نوٹ**: اسلام آباد میں اردو افسانہ کی ایک صدی پوری ہونے پر جو تقریب منعقد ہوئی تھی اس میں منشا یاد نے یہ ابتدائیہ پیش کیا تھا۔ حمید شاہد نے یہ ابتدائیہ اور افتخار عارف کا مضمون urdu_writers@yahoogroups.com پر دونوں بروقت ریلیز کئے۔ منشا یاد نے بعد میں اپنے ابتدائیہ کو اپ ڈیٹ کیا۔ امید ہے اس ابتدائیہ اور افتخار عارف کے خطاب سے افسانہ صدی کے سیمینار کو سمجھنے میں مثبت رنگ میں مدد ملے گی۔ **نذر خلیق**)

خواتین و حضرات!

سب سے پہلے میں آپ سب کو آج کی اس تقریب میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں اکادمی ادبیات پاکستان کا بھی شکر گزار ہوں۔ جس کی معاونت سے یہ سیمینار منعقد ہو رہا ہے۔ میں خاص طور پر جناب افتخار عارف کا ممنون ہوں جنہوں نے افسانے کے متعلق ہونے والے پروگراموں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی ہے۔ گذشتہ برس انہوں نے ہماری فرمائش پر سعادت حسن منٹو کے بارے میں تقریب کا انعقاد کیا۔ اور اب آج کی تقریب کا انتظام کیا ہے۔ میں ان احباب کا بھی شکر گزار ہوں جو دوسرے شہروں سے تشریف لائے۔ ہماری کوشش ہو گی جن لوگوں کو اس بار نہیں بلایا جا سکا انہیں آئندہ ایسے پروگراموں میں مدعو کیا جائے۔

بعض احباب کی طرف سے اس تقریب کے مقاصد کے بارے میں غلط فہمی پھیلائی جا رہی ہے لیکن اس سیمینار کے کوئی گروہی یا سیاسی محرکات اور مقاصد نہیں ہیں۔ اور جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ ذرا سی بات کا افسانہ کر دیا۔ تو آج کی یہ تقریب بھی اس کی ایک زندہ مثال ہے۔ یہ سیمینار کسی لمبی چوڑی منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں ہے۔ ہوا یوں کہ میں، حمید شاہد اور انور زاہدی میری لائبریری میں ایک اخبار کے ادبی صفحے کے لئے ۲۰۰۳ء کے فکشن پر گفتگو کر رہے تھے۔ مقبول گوہر انچارج ادبی صفحہ نوٹس لے رہے تھے اور فوٹو گرافر اظہر خان تصویریں بنا رہے تھے۔ اس دوران میں چائے آئی جس میں دو پونڈ کا ایک چھوٹا سا کیک بھی تھا۔ حمید شاہد کی گفتگو کی مشین ابھی چل رہی تھی کہنے لگے ایک روایت کے مطابق پہلا افسانہ ۱۹۰۳ء میں لکھا گیا۔ اس طرح افسانے کی عمر ایک سو برس ہو گئی ہے۔ اس پر انور زاہدی نے کہا پھر تو اسے منانا چاہئے۔ حمید شاہد نے کہا یہ کیک افسانے کی سو سالہ سالگرہ کا بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا اسے اسی سلسلے کا کیک سمجھئے۔ چھری حاضر ہے۔ چنانچہ فوٹو گرافر نے کیمرے کے بٹن پر انگلی

اور ہم نے چھری پر تین ہاتھ رکھے اور کیک کاٹا۔افسانے پر ہماری گفتگو تو بعد میں شائع ہوئی اور اس میں بذریعہ ٹیلی فون رشید امجد بھی شامل ہو گئے لیکن اگلے روز اخبار میں کیک کاٹنے کی تصویر اس عنوان کے ساتھ چھپ گئی۔

''اردو افسانہ: یہ ایک صدی کا قصہ ہے ۔اردو افسانے نے ۲۰۰۳ء میں ایک صدی کی عمر مکمل کر لی اس سلسلے میں شہرِ افسانہ اسلام آباد میں معروف افسانہ نگار منشایاد کی رہائش گاہ افسانہ منزل پر ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں منشایاد،حمید شاہد اور انور زاہدی نے کیک بھی کاٹا''۔میں نے اخبار کا تراشا حمید شاہد اور انور زاہدی کو بھجوانے کی خاطر سکین کیا اور ساتھ ہی حیدر قریشی،آصف فرخی ،رفعت مرتضیٰ اور چند ایک دوسرے دوستوں کو انٹرنیٹ پر بھجوا دیا۔حیدر قریشی انٹرنیٹ کے سمندر کے بہت بڑے تیراک ہیں اور ادبی خبروں کی مچھلیاں پکڑنے کے لئے ہمہ وقت کندھے پر جال اٹھائے رہتے ہیں۔انہوں نے یہ خبر طیور کی زبانی آگے پہنچا دی اور مجھ سے اس خبر کے فالو اپ کے بارے میں تقاضہ کیا جانے لگا۔امریکہ سے رفعت مرتضیٰ نے ای میل پیغام میں پوچھا

Just a few lines and "kek katnay per baat khatam?.I am sure there were some papers read,some kind of discussion,some articles in some news papers? If possible,either guide me where to look for the write up otherwise 'aap hee takleef kijiiae'

مجھ سے اور تو کچھ ہو نہ سکا میں نے اس خبر کی ایک کاپی ای میل کے ذریعے جناب افتخار عارف کو بھجوا دی ۔ان کا فون آ گیا کہ آجاؤ، بیٹھ جاتے اور کچھ کر لیتے ہیں۔اگلے روز ہم آ گئے اور بیٹھ گئے اور کچھ کر کے اٹھے۔میں نے حمید شاہد کے علاوہ رشید امجد اور نیلوفر اقبال کو بھی فون کیا افتخار عارف نے ہمارے سامنے رشید امجد کو ان کے گھر اور یونیورسٹی میں فون کیا۔اعجاز راہی ایک تقریب میں میرے ساتھ تھے میں نے ان سے بھی میٹنگ میں شرکت کے لئے کہا مگر انہوں نے معذرت کر لی۔اکادمی میں ہم رشید امجد کا انتظار کرتے رہے مگر وہ حسبِ معمول وعدہ کر کے نہیں آئے۔مگر ہم نے بعد میں ان سے اور اعجاز راہی سے پوچھ کر ان کے نام نمایاں مقام پر شامل کئے۔اکادمی میں نگہت سلیم بھی موجود تھیں۔چنانچہ ہم نے جلدی جلدی میں ایک پروگرام بنا ڈالا۔اسی جلدی کی وجہ سے بعد میں ضروری تبدیلیاں کرنا پڑیں۔نظر ثانی شدہ پروگرام میں وقار بن الٰہی ، یونس جاوید،احمد جاوید اور نیلوفر اقبال کے نام بھی شامل کر لئے گئے۔ اور احباب کو یو ایم ایس سے یا دستی یہ پروگرام پہنچا دیا گیا۔گوجرانوالہ سے محمود احمد قاضی اور اسلم سراج الدین کو میں نے فون پر سیمینار کے بارے میں بتایا تھا وہ اپنے طور پر آ گئے مگر جب بعض دوستوں نے بائیکاٹ کیا تو انہیں پروگرام میں شامل کر لیا گیا۔اگر ہمیں پہلے سے علم ہوتا کہ بعض دوست نہیں آئیں گے تو ہم بہت بہتر پروگرام بنا لیتے اور بہت سے دوستوں کو شکایت کا موقع نہ دیتے۔لیکن آپ خود دیکھ لیں گے کہ یہ سیمینار کسی کے خلاف نہیں اور نہ ہی اس سے کوئی گروہی ،سیاسی یا ذاتی مقاصد حاصل کئے جائیں گے۔ہم دوسرے دوستوں کو بھی ساتھ لے کر چلنا چاہتے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ اس سے بہتر پروگرام بنائیں گے۔آپ

سب اس امر کے گواہ رہیں۔

میں نے جناب احمد ندیم قاسمی ،ڈاکٹر وزیر آغا اور اشفاق احمد صاحب سے کو بھی فون کئے۔قاسمی صاحب علیل تھے۔ڈاکٹر وزیر آغا کی اہلیہ بیمار تھیں اور ایک روز پہلے اشفاق احمد صاحب کی ہمشیرہ فوت ہو گئی تھیں۔میں نے انہیں دو بار فون کیا مگر بانو آپا نے کہا کہ ان کو صدارت کے لئے کہنا مناسب نہ ہو گا۔انتظار حسین صاحب نے بھی کارڈ چھپنے کے بعد اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ ان کی اہلیہ بیمار ہیں اور وہ شائد انہیں اکیلا نہ چھوڑ سکیں۔مگر ایک موہوم سی امید تھی کہ شائد وہ آ جائیں۔مگر ۲۵ر جنوری کو ان کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا اور ان کے آنے کی رہی سہی امید بھی جاتی رہی۔ڈاکٹر انور سجاد بھی اپنی بیماری یا کسی اور وجہ سے نہ آ سکے۔میں نے جنابِ احمد ندیم قاسمی،ڈاکٹر وزیر آغا،اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کو اس موقع پر اپنے پیغامات بھیجنے کے لئے خطوط لکھے۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ،محمد عمر میمن اور شمس الرحمٰن فاروقی کو بھی پیغامات کی درخواست کے ساتھ ای میل کے ذریعے اطلاع دی گئی۔فاروقی صاحب اور مرزا حامد بیگ کو بھیجی گئی ای میل واپس آ گئیں۔شائد کوئی مل بھی گئی ہو جناب احمد ندیم قاسمی کا پیغام پرسوں ڈاک سے موصول ہو گیا تھا اور ڈاکٹر وزیر آغا نے گذشتہ رات کو اپنا پیغام مجھے ٹیلی فون پر لکھوا دیا۔ان دونوں پیغامات سے ہماری بہت حوصلہ افزائی ہوئی ہے اور یہ ہمارے پروگرام کا حصہ بنیں گے اور پڑھ کر سنائے جائیں گے۔

خواتین وحضرات ایک صدی کے قصے کی بات یہاں ختم نہیں ہو گئی۔اس دوران میں حمید شاہد کو اپنے سرکاری دورے پر کراچی جانا پڑا۔وہاں افسانے کی ایک صدی مکمل ہونے پر رسالہ مکالمہ کے دفتر میں ایک مذاکرہ ہوا جس میں مظہر جمیل،مبین مرزا،سحر انصاری،صبا اکرام اور حسن عابدی نے شرکت کی اور افسانے کے صد سالہ سفر کا جائزہ لیا۔یہ کاروائی مکالمہ کے آئندہ شمارے میں شائع ہو گی۔ڈاکٹر آصف فرخی بھی چست تخلیقی ذہن رکھتے ہیں ۔ادبی رابطوں اور سرگرمیوں میں بہت فعال ہیں اور انٹرنیٹ کے آسمان پر کمندیں ڈالتے رہتے ہیں۔مجھے سب سے پہلے انہی کی طرف سے Response ملا تھا۔حمید شاہد کراچی گئے تو ان دونوں کی تفصیلی ملاقات ہوئی اور انہوں نے پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن اور شہرزاد کے تعاون سے فروری میں ایک لٹریری فیسٹیول منانے کا پروگرام بنا لیا۔جس میں ''افسانہ: ایک صدی کا قصہ'' بھی پروگرام کا حصہ ہو گا۔ہماری خواہش ہے کہ اکادمی ادبیات ۲۰۰۴ء کو افسانے کا سال قرار دے اور اس کے چاروں صوبائی دفاتر بھی اس سلسلے کو آگے بڑھائیں اور دوسرے بہت سے اہم افسانہ نگاروں کو بھی شرکت کی دعوت دیں۔اگر پریم چند کو اردو کا پہلا افسانہ نگار ماننے والوں نے برا نہ مانا تو ہو سکتا ہے بھارت میں بھی اس سلسلے میں پروگرام منعقد کئے جائیں۔

خواتین وحضرات !اکثر احباب ہم سے پوچھتے ہیں کہ افسانے کی عمر ایک سو سال ہونے کا ہمارے پاس کیا ثبوت یا ماخذ ہے۔اس سلسلے میں عرض ہے کہ ۱۹۶۵ء میں پنجاب یونیورسٹی کے ایک سکالر ڈاکٹر آغا مسعود

رضا خاکی نے اپنے تحقیقی مقالے میں راشد الخیری کے افسانے ''نصیر اور خدیجہ'' کو اردو کا پہلا افسانہ قرار دیا تھا۔جس کا حوالہ اکادمی ادبیات پاکستان کی کتاب''اردو افسانے کی روایت (۱۹۰۳ء سے ۱۹۹۰ء)'' مرتبہ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ'' (مطبوعہ ۱۹۹۱ء) میں بھی دیا گیا ہے بلکہ یہ کتاب انہی کے نام معنون ہے''اردو کے پہلے افسانہ نگار راشد الخیری کے نام'' ہوسکتا ہے کسی کو اس سے ختلاف ہو اور وہ اس میں کوئی کمی یا بیشی کرنا چاہے تو بھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ہم راشد الخیری کا دن نہیں افسانے کی صدی منانا اور اس کی رفتار اور معیار کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے ایسی تقریبات میں سب کو بلانا اور مطمئن کرنا ممکن نہیں ہوتا۔لیکن ہم نے اپنی سی کوشش کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ افسانہ نگاروں کو نمائندگی دی جائے۔ہمیں انتظار حسین صاحب کی بہت کمی محسوس ہورہی ہے۔قیام پاکستان کے بعد نمایاں ہونے والے افسانہ نگاروں میں ان کا نام بہت اہم ہے۔خصوصاً جدید حسیت اور اپنے مخصوص داستانی اسلوب میں انہوں نے اپنے عصر کی بھرپور ترجمانی کی۔میرے جیسے بعد میں آنے والوں پر ان کا ایک احسان یہ ہے کہ انہوں نے پاکستان اور پنجاب کی شہری اور دیہی معاشرت،تہذیب اور ثقافت کو ہمارے لئے چھوڑ دیا۔اگر وہ اپنی خوبصورت زبان اور اسلوب میں ارد گرد کی زندگی کی عکاسی کرنے لگ جاتے تو ہم کہاں جاتے۔اور اگرچہ ان کے پہلے مجموعہ کا نام گلی گوچے تھا مگر ان گلی کوچوں کا بھرپور ذکر اور حوالہ ہمیں پاکستان میں جدید افسانے کے بانی ڈاکٹر انور سجاد کے افسانوں میں ملتا ہے۔قیامِ پاکستان کے بعد دوسرے اہم ترین افسانہ نگاروں میں اشفاق احمد سرِ فہرست ہیں۔اوران کا افسانہ گڈریا چند بہترین افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔گذشتہ دنوں ایک انگریزی اخبار نے پاکستانی ادب پر ایک سپیشل رپورٹ شائع کی تھی جس میں قیام پاکستان کے بعد اردو کے پانچ پانچ بہترین شاعروں، افسانوں، ناولوں اور نقادوں کے نام دیئے گئے تھے۔جن پانچ افسانوں کو بہترین قرار دیا گیا ان میں سعادت حسن منٹو کا **ٹوبہ ٹیک سنگھ**،اشفاق احمد کا **گڈریا**،غلام عباس کا **گرم کوٹ**،ممتاز مفتی کا **آپا** اور انتظار حسین کا **آخری آدمی** شامل تھے۔اس میں شک نہیں کہ یہ پانچ افسانے اردو افسانے کا باعثِ افتخار سرمایہ ہیں۔لیکن ہمارے قارئین اور نقادوں کو کچھ آگے بھی آنا چاہئے۔بے شک انہوں نے کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی،عصمت چغتائی،قرۃ العین حیدر،قدرت اللہ شہاب،احمد ندیم قاسمی،عبداللہ حسین،خالدہ حسین،بانو قدسیہ،منشا یاد اور مظہر الاسلام کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ آسانی سے ان کی بنائی فہرست میں شامل ہوسکتے ہیں

(are but a few names that can easily walk into any such company)۔مگر انہوں نے شامل کیا نہیں ۔اس طرح انہوں نے آخری آدمی کے بعد لکھے جانے والے سارے اردو افسانے کو نظر انداز کردیا۔حالانکہ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں علامتی یا جدید افسانے کی صورت جو فنی ،فکری اور اسلوبیاتی سطح پر انقلاب آیا اسے نظر انداز نہیں

کیا جاسکتا۔میرے خیال میں جن افسانوں کو کوئی بھی صاحبِ ذوق کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کرسکتا ان کا ایک کڑا انتخاب (بغیر ترتیب) اس طرح کیا جاسکتا ہے۔

اوپر دیئے گے افسانوں کے علاوہ جناب پریم چند کا کفن، احمد ندیم قاسمی کے کئی معرکتہ الآرا افسانے ہیں گنڈاسا، الحمدللہ ، لارنس آف تھیلیبیا، رئیس خانہ اور پرمیشر سنگھ ۔غلام عباس کا آنندی ، راجندر سنگھ بیدی کے لاجونتی اور اپنے دکھ مجھے دے دو،عصمت چغتائی کا مغل بچہ،کرشن چندر کا آدھے گھنٹے کا خدا،رتن سنگھ کا ہزاروں سال لمبی رات ،حیات اللہ انصاری کا آخری کوشش ،بلونت سنگھ کا جگا،علی عباس حسینی کا میلہ گھومنی،عزیز احمد کا کالی رات ،محمد حسن عسکری کا حرام جادی ،شفیق ؛لرحمٰن کا مدوجزر،رام لعل کا قبر،شمس آغا کا شکست،ابو الفضل صدیقی کا جوالامکھ۔قرۃ العین حیدر کے قید خانے میں طلاطم ہے اور لکڑ بگے کی ہنسی ،صادق حسین کا کچنار،شوکت صدیقی کا دیوار کے پیچھے ،آغا بابر کے گلاب دین چٹھی رساں اور اوپر گوری کا مکان،قدرت اللہ شہاب کا ماں جی،بانو قدسیہ کا توجہ کی طالب ،خدیجہ مستور کے نشیمن اور دادا ،ہاجرہ مسرور کا منی میلے میں ،زاہدہ حنا کا زرد ہوائیں زرد آوازیں،عرش صدیقی کا باہر کفن سے پاؤں،احمد شریف کا چھڑ کاؤ کی گاڑی اور چن ماہی کا کھوہ ،مسعود مفتی کے سالگرہ ،اور''میں''،میرزا ادیب کا ساتواں چراغ ،عالم شاہ خان کا کرائے کی کوکھ،رحمان مذنب کا پتلی جان مسعود اشعر کا آنکھوں پر دونوں ہاتھ۔حسن منظر کا مٹھل شاہ کا پڑ،غلام اثقلین نقوی کا کنواں،،جوگندر پال کے کھودو بابا کا مقبرہ اور دادیاں،محمد سلیم الرحمٰن کا نیند کا بچپن، یونس جاوید کا اناج کی خوشبو،وقار بن الٰہی کا نگران اور اکرام اللہ کا سایہ۔لطیف کاشمیری کا رسل جو،منیر احمد شیخ کا ایک تھوکا گیا آدمی، جیلانی بانو کا موم کی مریم ،گلزار کا ادھا،مستنصر حسین تارڑ کا بابا بگلوس، طارق محمود ا تیل کی دھار،محمد سعید شیخ کا اندر والے،طارق محمود کا شگاف اور شکیلہ رفیق کا گونجتی ہوئی خاموشیاں۔

دوسرے یا جدید اسلوب کے افسانوں میں سریندر پرکاش کے بجوکا اور رونے کی آواز۔،،،،بلراج مینرا کا ماچس ،سلام بن رزاق کا ندی ،ساجد رشید کا جلتے پروں سے اڑان ،انور سجاد کے گائے اور آج ،احمد ہمیش کے مکھی اور کہانی مجھے لکھتی ہے ،خالدہ حسین کے سایہ اور اے ڈیڈ لیٹر آفس،اعجاز راہی کا تیسری ہجرت ،رشید امجد کے سمندر قطرہ سمندر اور دشتِ امکاں،مظہر الاسلام کے ریت کنارا اور گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی مرزا حامد بیگ کے مغل سرائے اور سونے کا بچھو،اسد محمد خان کے باسودے کی مریم اور شہر کوفے کا محض ایک آدمی،محمد عمر میمن کا تاریک گلی،منیر الدین احمد کا انتالیسویں عورت، محمود احمد قاضی کے ہوا اور ٹھہرا ہوا موسم ، احمد داؤد کا وہسکی اور پرندے کا گوشت ،زاہدہ حنا کا جل ہے سارا جال،ناصر بغدادی کا خضر کے ہم سفر،محمود واجد کا خوشبو کا ایک لمحہ،مبین مرزا کا خواب ہارا ہوا آدمی ،احمد جاوید کا کولہو کا بیل ،آغا سلیم قزلباش کے انگور کی بیل اور الگنی ،نجم الحسن رضوی کا عفریت ،رفعت مرتضٰی کا پھول چاند تارے اور درخت ،حیدر قریشی کا کاکروچ،آصف فرخی کا آتش فشاں

پر کھلے گلاب، اسلم سراج الدین کا کتا جو آدمی تھا اور ٹلے باشی کا موچی، محمد حمید شاہد کا سورگ میں سور، نیلوفر اقبال کے گھنٹی اور آپریشن مائیس، احمد زین الدین کا دریچے میں سجی حیرانی، طاہرہ اقبال کا دیسوں میں، افتخار نسیم کا ایک تھی لڑکی، مصطفٰی کریم کا تسلسل، امجد طفیل کا مچھلیاں شکار کرتی ہیں، انور زاہدی کا کوئی موسم ہو، یوسف چودھری کا پھول آئے کٹہرے میں، علی تنہا کا گائے اور نگہت سلیم کا آسیب ِ مبرم۔ (حمید شاہد کا اضافہ:۔۔۔منشایاد کا تماشا اور نظر آ لباسِ مجاز میں)

میرے خیال میں ساٹھ کی دہائی اور اس کے بعد افسانے میں ادب کی ہر صنف سے زیادہ سیاسی اور سماجی زندگی اور معروضی حقائق کو پیش کیا گیا۔ یہ ایک سرسری سا جائزہ ہے اور میں جیسے جیسے یاد کرتا جاتا ہوں مجھے اور بہت سے اچھے اچھے افسانے یاد آتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن وقت کم ہے اور مجھے ایک ضروری فرض ادا کرنا ہے

بے شک ادب کو شہروں کے حوالے سے نہیں دیکھنا چاہئے لیکن حقیقت یہی ہے کہ کراچی اور لاہور کے بعد راولپنڈی اسلام آباد کے جڑواں شہر افسانے کا مرکز بن گئے۔ اس کی وجہ آپ جانتے ہی ہیں کہ دارالحکومت کی کراچی سے یہاں منتقلی کے ساتھ ہی بہت سے ادیب اور شاعر ایک جگہ جمع ہو گئے۔ ورنہ دارالحکومت کی منتقلی سے پہلے جب میں ۱۹۵۷ء کے آخر میں یہاں ملازمت کی غرض سے آیا تو یہاں تین یا چار افسانہ نگار ہی موجود تھے آغا بابر، احمد شریف اور منصور قیصر۔ آغا بابر اور احمد شریف اعلیٰ پائے کے افسانہ نگار تھے۔ اس وقت تو آغا بابر سے ایک فاصلہ رہا مگر اب وہ امریکہ سے جب بھی آتے تھے تو تندوری ریسٹوران میں میرے اور خاور نقوی کے ساتھ خوب گپ شپ کرتے تھے۔۔ احمد شریف نے پتہ نہیں کیوں اب تک اپنی کتاب نہیں چھپوائی اور گم سے ہو گئے ہیں۔ منصور قیصر نے چند اچھے افسانے بھی لکھے مگر ان کا زیادہ کام مضامین ادر کالموں وغیرہ پر مشتمل ہے۔ مشتاق قمر نے بھی چند عمدہ افسانے لکھے معتوب شہر ان کے افسانوں کا مجموعہ اور ایک ناول بھی ہے مگر وہ انشائیہ نگار کے طور پر زیادہ معروف ہوئے البتہ ایک سینئر ترین افسانہ نگار (انجمن داستان گویاں یعنی حلقہ اربابِ ذوق میں پہلا افسانہ پڑھنے والے) نسیم حجازی تھے جو افسانے کی بجائے ناولوں کی وجہ سے مشہور و معروف تھے۔ میرے فوراً بعد آنے والے بلکہ میرے ساتھی بن جانے والے افسانہ نگاروں میں رشید امجد اور اعجاز راہی شامل ہیں۔ ان کی وجہ سے مجھے تقویت ملی ورنہ آغا بابر جیسے گردن میں سریا رکھنے والوں کی موجودگی میں میرا آگے بڑھنا محال ہو جاتا۔ صاحبِ صدارت فتح محمد ملک کو یاد ہو گا حلقہ ارباب ذوق میں ہم لوگ ایک گوشے میں چپ چاپ سہمے بیٹھے رہتے تھے۔ بہر حال جب ہمارے ساتھ کچھ دوسرے احباب مظہر الاسلام، سرور کامران، احمد جاوید، احمد داؤد، زہرہ جبیں، خالدہ ملک، نثار ناسک، اختر امام رضوی، سلیم الدین سلیم وغیرہ بھی شامل ہو گئے تو ہم نے حلقے کے مقابلے میں لکھنے والوں کی انجمن بنالی اور اسے اس قدر کامیاب بنایا کہ حلقہ میں الو بولنے لگے۔ اور بالآخر اس پر ہم افسانہ نگاروں کا قبضہ ہو گیا۔ پھر دونوں شہروں میں الگ الگ حلقے بن گئے اور دونوں جگہ کئی برس تک افسانہ نگار چھائے

رہے۔ خوب محفلیں، ہنگامے اور افسانے کی شامیں منائی گئیں۔ کتابیں شائع ہوئیں اور ادبی رسائل میں ہر جگہ راولپنڈی اسلام آباد کے افسانہ نگار نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر انور سجاد کو اپنے لاہوری انداز میں حشرات الارض والی پھبتی کسنا پڑی۔ اور احمد ہمیش نے لکھا یا اس کو باور کرایا گیا کہ راولپنڈی کے افسانہ نگاروں رشید امجد، منشایاد، مظہر الاسلام، احمد داؤد، احمد جاوید، اور مرزا حامد بیگ وغیرہ کا ایک گروپ ہے جس نے صفت زدہ تشبیہوں سے اٹی ہوئی وو کیبلری کو رواج دیا ہے۔ غالباً انہوں نے ہمارے افسانے نہیں پڑھے ہیں ورنہ وہ دیکھتے کہ اتفاق سے ہم سب ایک جگہ جمع تو ہو گئے ہیں مگر ہم سب کا سوچنے اور لکھنے کا انداز بالکل جدا جدا ہے۔ اور یہ الزام ہم سب پر عائد نہیں ہوتا۔ بعد میں ان سب افسانہ نگاروں میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور آگے نکل جانے کی دوڑ شروع ہو گئی اور سارے تتر بتر ہو گئے۔ آپ جانتے ہی ہیں جن کو زیادہ جلدی ہوتی ہے وہ کہیں نہیں پہنچ پاتے۔ خیر یہ تو ایک جملہ' معترضہ تھا بہر حال ایک دور تھا جب اسلام آباد اور راولپنڈی میں ایک ساتھ تقریباً پچھتر (۷۵) سے زیادہ افسانہ نگار جمع ہو گئے تھے جن میں سے بہت سے اب بھی موجود ہیں۔ ذیل میں کسی ترتیب کے بغیر صرف ریکارڈ کے لئے ایسے افسانہ نگاروں کی فہرست دی جا رہی ہے جن میں سے دو ایک کے علاوہ سب کی کم از کم ایک کتاب شائع ہو چکی ہے

نسیم حجازی، آغا بابر، احمد شریف، مشتاق قمر، منصور قیصر، قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی، صادق حسین، وقار بن الٰہی، نجم الحسن رضوی، لطیف کاشمیری، بلقیس ظفر، اعجاز احمد فاروقی، پنہاں انصاری، سید باقر علیم، آغا ناصر، اختر جمال، خالدہ حسین، کہکشاں ملک، منشایاد، رشید امجد، اعجاز راہی، مظہر الاسلام، مرزا حامد بیگ، احمد داؤد، احمد جاوید، شمس نغمان، رشید نثار، رحمٰن شاہ عزیز، تصدق حسین راجا، انور زاہدی، رخسانہ صولت، مسرت لغاری، فریدہ حفیظ، شمیم اکرام الحق، ثاقبہ رحیم الدین،، عذرا وقار، نیلوفر اقبال، عذرا اصغر، شمع خالد،، خالدہ ملک، زہرہ جبیں، یوسف چودھری، محمد حمید شاہد، شعیب خالق، ابدال بیلا، تصدق حسین راجا، اظہر نیاز، ڈاکٹر احسان احمد شیخ، عبدالوحید رانا، محمد عاصم بٹ، ارشد چہال، صدیق اثر، محمود شروانی، حمید قیصر، امجد بھٹی، حمید رازی، عرفان عرفی، محسن عثمانی، عاطف علیم، میر تنہا یوسفی اور امیر حسین چمن۔ افرخندہ شمیم، شبانہ حبیب، فرحین چودھری (سابقہ شہابہ گیلانی) افشاں عباسی، ا، ثریا شہاب، ارجمند شاہین، شبنم شکیل،، عائشہ اسلم، محمودہ غازیہ،، فیروزہ بخاری، زینت قاضی۔ نگہت سلیم، عفت گل اعزاز کل تعداد (۷۲)

اتنے بہت سے افسانہ نگاروں کی موجودگی میں ہم لوگ اس شہر کو بجا طور پر ہم شہرِ افسانہ کہنے لگے تھے۔ مگر اب صورت حال آپ سب کے سامنے ہے۔ ہم نے اسی لئے افسانے کی ایک صدی مکمل ہونے پر یہ ادبی سیمینار منعقد کیا کہ افسانے کی محفلوں اور سرگرمیوں کا نئے سرے سے آغاز ہو جائے۔ اس کے سوا ہمارے کچھ مقاصد نہیں ہیں۔ اس اجلاس کی کاروائی آپ سب کی خدمت میں پیش کر دی جائے گی۔ اور اسے افسانے کی تاریخ

کا حصہ بنایا جائے گا۔آپ سب کی شرکت کا ایک بار پھر شکریہ ! (**ابتدائیہ تمام شد**)

اردو افسانے کی اولیت کا مسئلہ اپنی جگہ تاہم اردو میں افسانے کے تین ابتدائی مرکزی نام ہیں راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم اور منشی پریم چند۔ان میں سے اولیت کا اعزاز بے شک اول الذکر دونوں ناموں کو علی الترتیب دیا جا سکتا ہے لیکن افسانے کے باب میں پریم چند کی جو تخلیقی خدمات ہیں ان کے باعث افسانے کے باوا آدم بہر حال پریم چند ہی ہیں۔اردو افسانہ ایک عرصہ تک مختلف اخلاقی، سیاسی اور سماجی و معاشی قسم کے مقاصد کے تابع رہا، تاہم ایسے رویوں میں بھی کئی اہم تخلیقات سامنے آئیں۔اخلاقی مقاصد کے تحت لکھنے والوں نے تہذیبی روایات کی بقا کے لئے جدوجہد کی، تو رومان نگاروں نے خوابوں کی دنیا سجائے رکھی۔ترقی پسندوں نے سماجی اور معاشی انقلاب کی جدوجہد میں تخلیقی طور پر بھرپور شرکت کی تو کسی حد تک حقیقت پسندوں نے جنسی نفسیات کی گرہیں کھولنے میں قدم قدم پر چونکایا۔۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے نتیجہ میں جو انسانی المیہ سامنے آیا اسے دونوں طرف کے افسانہ نگاروں نے گہرے کرب کے ساتھ لیکن تخلیقی سطح پر بیان کیا۔اس کے بعد اردو افسانہ سارے پرانے رجحانات کے ملے جلے انداز کے ساتھ اپنا سفر کرتا رہا۔اس سفر میں کمزور تخلیقی یا تقلیدی اذہان نے ان افسانوی رویوں کے بے تکے اظہار کے کئی نمونے بھی پیش کئے۔اخلاقی موضوعات کو برتنے والے مصلحین غیر تخلیقی المیے سے دوچار ہوتے دکھائی دیئے تو رومان نگاروں کی رومانویت بھی مریضانہ حد تک گئی۔معاشی انقلاب لانے والے نعرے بازی کی سطح پر اتر آئے تو جنسی نفسیات پر لکھنے والوں نے جنسی چکا چوند پیدا کرنے کو ہی مطمع نظر بنا لیا۔اس کے باوجود اردو افسانے کو قارئین کی ایک بڑی تعداد میسر رہی۔پھر یوں ہوا کہ 1958ء میں جنرل ایوب خان کے مارشل لاء کے معاً بعد اردو افسانہ معمول سے زیادہ علامتی پیرایۂ اظہار اختیار کرنے کی طرف مائل ہوا۔سیاسی جبر کی فضا میں دل کی بات کہنے میں احتیاط کے باعث علامتی پیرایہ تجریدی افسانے کی سطح تک چلا گیا اور یہیں سے قاری کا رشتہ افسانے سے ٹوٹ گیا۔چند برسوں کی تجریدی مار اماری کے بعد کہانی نہ صرف افسانے میں واپس آئی بلکہ افسانہ مغربی دین ہونے کے باوجود اپنی مشرقی روایات (داستانیں، حکایات اور روایات وغیرہ) سے فیضیاب ہو کر بہتر روپ اختیار کرنے لگا۔آج کے افسانہ نگار کے سامنے جدید عہد کے مسائل اور ان سے متعلق اہم سوالات ہیں۔آج کے سارے اہم افسانہ نگار اپنے اپنے تخلیقی دائروں میں ان سوالات کے جواب تلاش کر رہے ہیں۔بحیثیت کہانی کار اپنے مقامی مسائل سے لے کر عالمی صورتحال تک بہت کچھ ہمارے سامنے ہے۔ایک بات طے ہے کہ آج اردو میں اتنی ہی بڑی کہانی لکھی جا رہی ہے جتنی بڑی کسی دوسری زبان میں لکھی جا رہی ہے بلکہ بعض ''بڑی عالمی کہانیوں'' سے بڑی کہانی اردو میں لکھی جا رہی ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ افسانے کے ناقدین اپنی اپنی مصلحتوں کے دائرے میں اسیر ہیں اور ان کہانیوں کے بیشتر اصل قاری ٹی وی چینلز کی بھول بھلیاں میں کھوئے ہوئے ہیں۔اردو افسانہ سو سالہ سفر میں تخلیقی طور پر سرخرو ہونے کے باوجود دیانتدار ناقدین اور اپنے کھوئے ہوئے قارئین کی تلاش میں ہے۔(تاثرات **حیدر قریشی**۔مطبوعہ روزنامہ **جناح** اسلام آباد ۱۰ فروری ۲۰۰۴ء)

افتخار عارف (اسلام آباد)

اُردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ

خواتین و حضرات !

میں اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے آپ سب کو خوش آمدید کہتا ہوں ۔ اُردو شاعری میں جس طرح دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں غزل کی صنف نے خاص طور پر اپنے تخلیقی جوہر کا لوہا منوایا ہے اُسی طرح اُردو نثر میں افسانے نے اپنی شناخت کا اعتبار و وقار قائم کیا ہے ۔اُردو ادب کے پچھلے سو برس کا زمانہ، افسانے کی بطورِ صنف، نشو و نما سے لیکر عروج و ترقی کے مختلف مراحل کو پیش کرتا ہے ۔ کہانی کو ''داستان'' کے تسلسل میں بھی دیکھا جا سکتا ہے اور اس کو ایک یکسر جُداگانہ حیثیت میں بھی سمجھنے کی کوشش کی جا سکتی ہے ۔

راشد الخیری، پریم چند کہ سجاد حیدر یلدرم ۔ اوّلیت کے تعین میں محققین کے درمیان یہ نام ہمیشہ زیرِ بحث رہے ہیں مگر راشد الخیری والی بات دل کو لگتی ہے کہ اُن کے حق میں دلائل ذرا زیادہ قوی ہیں ۔ سر سیّد تحریک کے سائے میں ظہور پانے والے راشد الخیری کی کہانی ''نصیر اور خدیجہ'' جو ''مخزن'' لاہور کے دسمبر 1903ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی، کو اُردو کا پہلا افسانہ قرار دیا جاتا ہے جس میں بہن نے بھائی کو خط لکھ کر مسلم معاشرے کے بعض مسائل پر گفتگو کی تھی ۔ یہ دراصل اُردو کہانی میں مسلم معاشرتی اصلاحی پس منظر کی نشاندہی کرتی تھی ۔ یہ کہانی بعد میں راشد الخیری کے مجموعے ''مسلی ہوئی پتیاں'' (مطبوعہ۔1937ء دہلی) میں شائع ہوئی ۔

آج کی اس محفل میں اُردو کے ممتاز افسانہ نگار اور صاحبانِ علم تشریف فرما ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ اس سیمینار میں پچھلے سو سال کے افسانوی ادب کا تفصیلی جائزہ پیش کریں گے، میں سمجھتا ہوں زیادتی ہوگی ۔ اہم افسانہ نگاروں کے اگر صرف نام ہی لیے جائیں تو بھی اس کے لیے کافی وقت چاہیے ۔ پریم چند، سدرشن، یلدرم، علی عباس حسینی، نیاز فتحپوری، اوپندر ناتھ اشک، اختر اورینوی، احمد ندیم قاسمی، مسز عبدالقادر، حجاب امتیاز علی، احمد علی، کرشن چندر، عزیز احمد، رشید جہاں، منٹو، ممتاز شیریں، غلام عباس، بیدی، عصمت، شوکت صدیقی، بلونت سنگھ، حسن عسکری، ابو الفضل صدیقی، خدیجہ مستور، حاجرہ مسرور، ممتاز مفتی، قدرت اللہ

شہاب ،قرۃ العین حیدر ،شفیق الرحمٰن ،محمد خالد اختر ،انتظار حسین ،آغا بابر ،اشفاق احمد ،جوگیندر پال ، احمد ہمیش ،جمیلہ ہاشمی ،بانو قدسیہ ،رحمٰن مذنب ،سید انور ،سریندر پرکاش ،انور سجاد ،خالدہ حسین ،غیاث احمد گدی ،مسعود مفتی ،منشا یاد ،رشید امجد ،مرزا حامد بیگ ،مظہر الاسلام ،اسد محمد خان ،احمد داؤد ،بلراج مین را وغیرہ۔

میں جب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ ابھی تو نہ جانے کتنے نام ہیں جو رہ گئے ہوں گے ،مثلاً سید رفیق حسین ،خواجہ احمد عباس ،اشرف صبُوحی ،حسن منظر ،وقار بن الٰہی ،صادق حسین ،قیصر تمکین ، فہمیدہ اختر ،زاہدہ حنا ،اختر جمال ،رضیہ فصیح احمد ،رضیہ سجاد ظہیر ،سلام بن رزاق ،انور خان ، جیتندر بلّو۔۔۔**خواتین و حضرات** ! یہ معاملہ ہمیشہ بہت حساس ہوتا ہے ۔کتنے نام رہ جاتے ہیں اور رہ گئے ہیں ۔نام ہیں ہی اتنے کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں ۔مراد صرف یہ ہے کہ ہمارا فکشن اردو نثر کی آبرُو ہے اور دُنیا کے ادب میں ہمارے افتخار و اعتبار کا سبب بنا ہے ۔

خواتین و حضرات ! یہ بتا تا چلوں کہ اکادمی ادبیات پاکستان کے کراچی ،لاہور ،کوئٹہ اور پشاور کے مراکز اپنے اپنے طور پر افسانے کے حوالے سے قومی سیمینارز منعقد کر رہے ہیں ۔

میرا یہ منصب تو نہیں ہے لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس سال کو ''افسانے کا سال'' قرار دیا جاتا ۔افسانہ بلاشُبہ اُن منتخب اصنافِ ادب میں سے ہے کہ جس نے 20 ویں صدی کے جہانِ ادب میں ہماری شناخت اور پہچان بنانے میں بُنیادی کردار ادا کیا ہے ۔اسالیب ،لحن ،موضوعات اور تجربات کے تنوّع ،سب حوالوں سے جس تخلیقی توانائی کا اظہار رہوا ہے اُس نے ہمارے افسانے ہی کو نہیں ادب کو بھی عوام و خواص میں بے حد مقبولیت عطا کی ہے ۔آج کا یہ قومی مذاکرہ ایک بڑی صنف کے بڑے لکھنے والے کو خراجِ عقیدت پیش کرنے اور اُن کی خدمات کے اعتراف کے لیے منعقد کیا گیا ہے ۔☆☆☆

> ''ادب کسی قوم کی تہذیبی اور تاریخی آئینہ داری کرتا ہو یا نہ کرتا ہو لیکن پاکستانی ادب اپنے دامن میں زیر زمین بہنے والے چشمے کی طرح نمناک مٹی رکھتا ہے۔۔۔فی الواقت اردو افسانہ کی صورتحال یہی ہے کہ شور شرابہ تقریباً ختم ہو چکا ہے یعنی اب راتوں رات شہرت کا امکان نہیں کے برابر ہے۔اس دور میں اردو افسانے کے مختلف امکانات سامنے آئے ہیں،اور آج کا افسانہ نگار آنے والی واضح اور روشن صورتحال کا خام مواد بنتا جا رہا ہے۔۔اس تمام بیخ و بُن کے نتیجہ میں جو صورت کل سامنے آئے گی وہی جدید تر افسانے کی شناخت بنے گی۔''
>
> (**قمر احسن** بحوالہ پیش لفظ ''نیا پاکستانی افسانہ۔نئے دستخط'' ۔معیار پبلی کیشنز۔دہلی۔۱۹۸۳ء)

اردو افسانے کی اولیت کی تحقیق کا مسئلہ

حیدر قریشی

اسلام آباد کے افسانہ سیمینار میں منشایاد نے مسعود رضا خاکی کے حوالے سے اولین اردو افسانہ ۱۹۰۳ء میں راشد الخیری کے ''نصیر اور خدیجہ'' کو قرار دیا تھا۔اور اس کے لئے مرزا حامد بیگ کی ایک مرتب کردہ کتاب کا حوالہ دیا تھا۔اس کے بعد جب روزنامہ جناح اسلام آباد کی ۱۰ فروری کی اشاعتِ خاص میں افسانے کے سو سال کے حوالے سے افسانہ نگاروں کے تاثرات شائع کئے گئے تو اس میں مرزا حامد بیگ کے اس بیان سے کنفیوژن پیدا ہوا۔انہوں نے ۱۹۰۳ء میں اولین افسانہ کی تحقیق کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا:''میرے لئے تو خاص جذبات ہیں کہ **میری تحقیق کے مطابق** افسانے کے سو سال اب پورے ہوئے۔مجھ سے بڑھ کر کوئی خوشی محسوس نہیں کر سکتا۔''۔۔۔ مرزا حامد بیگ کی خوشی بجا ہے اور ان کے جذبات بھی قابلِ قدر ہیں لیکن اب محمد حمید شاہد کی کل کی لاہور کی افسانہ تقریب کی رپورٹ دیکھ کر وہ بات زیادہ واضح طور پر سامنے آئی جو منشایاد کے ابتدائیہ میں موجود ہونے کے باوجود زیادہ توجہ نہیں کھینچ سکی تھی۔محمد حمید شاہد کی رپورٹ کے مطابق:

یاد رہے مرزا حامد بیگ ڈاکٹر مسعود خاکی کی اس تحقیق کے پرجوش حامی ہیں۔ڈاکٹر مسعود خاکی نے اپنے تحقیقی مقالہ ''اردو افسانے کا ارتقاء'' ۱۹۶۵ء میں مکمل کیا تھا جس پر انہیں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ڈاکٹریٹ کا اعزاز دیا گیا۔اس مقالے کے تیسرے باب میں ''اردو کا پہلا افسانہ نگار'' کا عنوان قائم کر کے ڈاکٹر مسعود خاکی نے لکھا ہے کہ:

علامہ راشد الخیری (محمد عبدالرشید دہلوی) کا سب سے پہلا افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' ۱۹۰۳ء میں مخزن میں چھپا۔

سید سجاد حیدر یلدرم کا پہلا افسانہ ۱۹۰۷ میں شائع ہوا جو طبع زاد نہیں تھا

خواجہ حسن نظامی نے افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۱۰ کے بعد کیا

منشی پریم چند (نواب رائے) کا پہلا افسانہ ''روٹی رانی'' ۱۹۰۷ میں شائع ہوا تھا جو ترجمہ تھا تاہم اسی سال ان کا طبع زاد افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' بھی شائع ہوا تھا۔ اسی تحقیق کو بعدازاں تسلیم کرلیا گیا۔ مرزا حامد بیگ نے بھی اسی تحقیق کو درست جانا۔ ڈاکٹر مسعود خا کی کا یہ مقالہ کتابی صورت میں مکتبہ خیال لاہور سے اگست ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا اس کتاب کا انتساب بھی ان کی تحقیق کے حوالے سے یوں ہے

''علامہ راشد الخیری کے نام جنھوں نے اردو کا پہلا افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' لکھا''

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس وضاحت اور مرزا حامد بیگ کے بیان سے کنفیوژن پیدا ہو رہا ہے۔ اگر مسعود رضا خا کی نے اپنا تحقیقی مقالہ ۱۹۶۵ء میں مکمل کرلیا تھا اور اس میں واضح طور پر علامہ راشد الخیری کے افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' کو اردو کا پہلا افسانہ قرار دیا گیا تھا تو پھر مرزا حامد بیگ کا اسے اپنی تحقیق قرار دینا عجیب سا لگتا ہے۔ حیرت ہے کہ انہوں نے روزنامہ جناح میں اپنے تاثرات میں وقار عظیم اور سید معین الرحمٰن کی تحقیق کا ذکر کر کے ان کو رد تو کیا ہے لیکن یہ کہیں ذکر نہیں کیا کہ میں جسے ۱۹۰۳ء کا پہلا افسانہ نگار کہہ کر اپنی تحقیق قرار دے رہا ہوں، اس تحقیق میں مسعود رضا خا کی کا کوئی حصہ ہے۔ ممکن ہے اخبار میں کتابت کی غلطی سے کوئی حصہ حذف ہو گیا ہو۔ اس لئے امید ہے مرزا حامد بیگ خود اس سلسلے میں وضاحت فرمائیں گے کہ اس تحقیق میں مسعود رضا خا کی کا کتنا حصہ ہے اور ان کا اپنا کیا حصہ ہے۔ تاکہ تحقیقی زاویے سے کوئی کنفیوژن نہ رہے۔ شکریہ! ۲۳ مارچ ۲۰۰۴ء

ناصر عباس نیر میں نے جناب حیدر قریشی کی بحث دیکھی ہے جو انہوں نے اردو کے پہلے افسانے کے بارے میں کی ہے۔ حامد بیگ صاحب کا دعویٰ غلط ہے ہے کہ دعویٰ غلط ہے کہ راشد الخیری کو انہوں نے اردو کا پہلا افسانہ نگار ثابت کیا ہے۔ اس ضمن میں عرض ہے کہ اردو میں پہلا ترجمہ شدہ افسانہ یلدرم (سجاد حیدر یلدرم) نے ۱۹۰۱ء میں لکھا تھا اور راشد الخیری ۱۹۰۳ء میں طبع زاد لکھا تھا۔ یہ تحقیق ڈاکٹر مسعود رضا خا کی کی ہے اور اس سے اتفاق ڈاکٹر انوار احمد نے بھی کیا ہے جنھوں نے اردو افسانے پر بہت اچھا کام کیا ہے۔ انہوں نے مخزن کا وہ شمارہ (دسمبر ۱۹۰۳ء، شمارہ ۲، جلد ۶) بھی تلاش کرنے کا دعویٰ کیا ہے جس میں یہ افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' کے نام سے چھپا تھا۔ ۲۳، مارچ ۲۰۰۴ء

نوٹ: اردو افسانے کی اولیت کی تحقیق کے مسئلہ پر سائبر ادبی حلقہ **اردو رائٹرز** ایٹ یاہو گروپس پر ڈاکٹر مرزا حامد بیگ صاحب سے جو استفسار کیا گیا تھا اس کا جواب وہاں نہیں مل سکا۔ شاید ڈاکٹر صاحب انٹرنیٹ پر اردو میں رابطہ نہیں کر سکتے۔ امید ہے اب **جدید ادب** میں چھپنے کے بعد ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اس حوالے سے اپنی وضاحت عنایت فرمائیں گے، جدید ادب کے صفحات حاضر ہیں۔ **حیدر قریشی**

الیاس عشقی (حیدر آباد)

ہائیکو کا منفرد شاعر اقبال حیدر

(کلام کا جائزہ)

اقبال حیدر کی ہائیکو نگاری پر اس غیر روایتی جائزے کی ابتدا روایتی انداز میں کی جا رہی ہے تا کہ اس کی غیر روایتی شاعری فطری طور پر اُبھر کر سامنے آ جائے۔ اس سے پہلے چند مشہور اور معیاری مثالیں اس کی تخلیقات کی منطقی تقسیم کے مطابق پیش کی جاتی ہیں۔ پہلے حمد و نعت کا اسلوب دیکھئے:

حمد

تو ہی صاحب کُن
کائنات کا ہر ذرّہ
گائے تیرے گُن

نعت

صادق اور امین
میرے آقا کو مانیں
وہ بھی جو بے دین

ایک ملی ہائیکو

پیارے پاکستان
تو میری پہچان ہے اور
میں تیری پہچان

یہاں ہائیکو کے فن زبان اور اسلوب کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ صنف اب تعریف و تعارف سے آگے نکل گئی ہے اس کا مقبول ترین فن پہلے پہل (۵۔۷۔۵) کے ارکان میں ظاہر ہوتا ہے جس کا استعمال عام ہے۔ اقبال حیدر کا بہتر کلام اسی میں ظاہر ہوتا ہے جس سے موضوع اور مزاج کی انفرادیت ظاہر ہے۔ بچوں کی اہمیت اور ان سے محبت کا انداز یہ ہے۔

ویراں اور بے خواب

وہ گھر گھر ہی نہیں جس میں

بچے اور نہ کتاب

☆☆☆

جاگ رہی ہے رات

کھیل رہے ہیں کچھ جگنو

اک بچے کے ساتھ

☆☆☆

رشتہ سچا ہے

اک بوڑھے کی بانہوں میں

ننھا بچہ ہے

مضامین کی ندرت اور احساس کی نزاکت جذبے کی صداقت کے ساتھ دیکھئے:

پھر نادانی میں

میں نے اس کا نام لکھا

بہتے پانی میں

تم کو کیا ڈھونڈیں

ہم تو اپنے آپ کو بھی

ڈھونڈ نہیں پائے

پہلا ہائیکو متداول ردیف کی رعایت کے ساتھ ہے اور دوسرا ہائیکو اس سے عاری مگر بے ساختگی اور زبان کی سلاست اس کا احساس ہی نہیں ہونے دیتی وہ فطری طور پر قدرت سے قریب اور مناظر کے دلدادہ مگر محض برائے منظر نگاری نہیں۔

اکثر شام ڈھلے

میری آنکھیں تکتی ہیں

دور سمندر کو

☆☆☆

بادل کے اس پار

اک معصوم پرندے سے

بچھڑ گئی ہے ڈار

دوسرے ہائیکو میں بیان کا انوکھا اور موثر انداز ہے صاف ظاہر ہے کہ کونجوں کی ڈار کا ذکر ہے مگر عمداً پرندے کا نام نہیں لیا ہے اور ذہن از خود اس طرف چلا جاتا ہے۔ پڑھنے اور سننے والا جانتا ہے کہ ذکر کونج کا ہے جو بچھڑ گئی ہے' پر شاعر کہتے ہیں کہ ڈار بچھڑ گئی ہے۔

اقبال حیدر نے ہائیکو میں تجربے بھی کیے ہیں اور مسلسل ہائیکو بھی کہے ہیں۔ کراچی شہر سے متعلق تاثرات اس شہر کے باسی کی اس سے محبت اور اس کے متعلق فکرمندی کا اظہار اس طرح ہے گویا یہ شہر ان کی شخصیت کا حصہ ہے اور وہ اس شہر میں گم ہے مگر غافل نہیں۔ پہلا مصرع جو خطابیہ ہے' سب میں مشترک ہے۔

اے شہروں کے شہر

کہیں پہ خوشیاں ناچیں اور

کہیں پہ ٹوٹے قہر

اے شہروں کے شہر

ٹھنڈے دل سے سوچ ذرا

کیوں پھیلا یہ زہر

کچھ مسلسل ہائیکو موسم کے تاثرات اور بالکل ذاتی احساسات کے آئینہ دار ہیں اور پروین شاکر کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے کہے گئے ہیں۔ لیکن نئے زاویئے اور ماحولیات کے متعلق دو فن پارے اپنے موضوعات کے اعتبار سے ایسے ہیں کہ ان سے گزر جانا شاعر کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

نیا جہاد کرو

نئے ہزاریئے کا پیغام

ذہن آزاد کرو

☆☆☆

شہر ہو یا گاؤں

سر پر باقی رہنے دو

پیڑوں کی چھاؤں

اس سلسلے میں جاپانی آرائش گل کے فن اور حالات حاضرہ کے موضوع قابل قدر ہیں۔ چند ہائیکو سے شگفتہ

مزاجی کا اظہار ہوتا ہے۔

ایک پہیلی ہے
سابق شوہر کی بیوی
اس کی سہیلی ہے

☆☆☆

دنیاداری ہے
اندھے لنگڑے کا قصہ
اب بھی جاری ہے

یہ ہائیکو کی عام اور رسمیہ شاعری ہے جو اپنی سحر کاریوں کی وجہ سے مقبول ہو رہی ہے۔اور کم وبیش سارے ہائیکو کے شاعر اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔لیکن کچھ ۵۔۷۔۵ وزن کے پابند نہیں ہیں مگر اقبال حیدر کا کلام جو نمایاں خوبیاں رکھتا ہے وہ ایک جگہ کم نظر آئیں گی لیکن جائزے میں میں ان کے غیر رسمی کلام کا ذکر خاص طور پر کرنا چاہتا ہوں۔جس کی طرف عام طور پر توجہ نہیں دی گئی ہے۔سب سے پہلے نثر کے ہائیکو کا دو نمونے دیکھئے:

تیز بارش تھم گئی ہے
تمام سنگ میل اکھڑ چکے ہیں
مسافر ستارہ سفر کو ڈھونڈ رہے ہیں

☆☆☆

ان کے نقش قدم پر چلو
جو ہم سے پہلے منزل کی طرف گئے
اور پرندوں پر بھی نظر رکھو

اقبال حیدر نے مساوی الاوزان ہائیکو بھی کہے ہیں۔

پھول بیچنے والی کب کی چلی گئی
لیکن اس کے ساتھ جو تتلی آئی تھی
اب بھی گل دانوں پر منڈلاتی ہے

خود کردہ را علاج نہ پاؤں کتاب میں
لوگوں پہ آسمان سے آتے ہیں سب عذاب

میں مبتلا ہوں اپنی زمین کے عذاب میں

انہوں نے مختلف بحروں میں بھی ہائیکو کہے ہیں:

خزاں کی ہوا ہے بڑی دھول ہے
جسے توڑنا چاہتی ہے میری پیاری بچی
وہ اک آخری لال سا پھول ہے

☆☆☆

خزاں کی سنہری سنہری راتوں میں
درختوں کی شاخوں سے پتے بچھڑنے لگے ہیں
مگر میرے دل کی کلی کھل رہی ہے

کبھی کبھی انہوں نے عنوان کے ساتھ بھی ہائیکو کہے ہیں اور پورا حق ادا کیا ہے۔

نیت

نیت نیک نہیں
اک بستی میں رہتے ہیں
لیکن ایک نہیں

مکان

اونچے ہوئے مکان
لیکن ہم سے روٹھ گئے
آنگن اور دالان

'مکان' کے عنوان سے جو ہائیکو ہے اس کا مضمون نادر ہے۔کسی فارسی شاعر نے یہ بات اس طرح کہی ہے:

پیش خورشید پر مکش دیوار ؎ خواہی از صنم خانہ نورانی

اگر تم چاہتے ہو کہ گھر کے صحن میں روشنی (دھوپ) رہے تو سورج کے رخ پر دیوار نہ بناؤ۔ شاہ لطیف بھٹائی نے بالکل وہی بات کہی ہے جو اس ہائیکو میں ہے مگر اپنے منفرد انداز میں:

ڈگھی ادو منھی پکواؤ مدلا یہ
جنھین آ ذورادید سجد سوار رولڈ یو

اتفاق سے اس بیت میں فارسی شعر اور ہائیکو دونوں مضامین آ گئے ہیں تم اپنے کچے اور پھونس کے مکان اور طویل نہ بناؤ کہ جنھوں نے ایسے بڑے اور طویل برآمدے بنائے۔ان کے گھروں سے سورج وقت سے پہلے ہی

رخصت ہو جاتا ہے۔

منظوم تعارف کی بنیاد شوکت تھانوی نے حیدر آباد کے ایک یادگار مشاعرے میں رکھی تھی لیکن اسے عروج راغب صاحب نے دیا۔ اقبال حیدر جیسے قادر الکلام شاعر سے فی البدیہہ شاعری بھی کوئی غیر معمولی بات نہ ہوگی۔ راغب مراد آبادی نے مشاعرے کی نظامت میں شاعر کے منظوم تعارف کی باقاعدہ ابتدا کی تھی جو ان کی بدیہہ گوئی کا ثبوت ہے۔ اقبال حیدر نے ہائیکو کے مشاعرے کی نظامت کرتے ہوئے شعراء کا تعارف ہائیکو میں کرایا یہاں سب شعراء کا منظوم تعارف کرانے والے راغب مراد آبادی کا تعارف دیکھئے جو اقبال حیدر نے ہائیکو کے ذریعے کرایا ہے۔

اچھی لگتی ہے
راغب صاحب کی ہائیکو
سچی لگتی ہے

اقبال حیدر نے جاپانی ہائیکو کے بہت کامیاب ترجمے بھی کیے ہیں۔ مشہور شاعر باشو کے ہائیکو کا ترجمہ دیکھئے:

دلکش ہیں کتنے
دور پہاڑی رستے پر
پھول بنفشہ کے

شیکی کے ہائیکو کا ترجمہ دیکھئے اس پر ترجمے کا گمان نہیں ہوتا

پروا چلتی ہے
حد نظر تک وادی میں
برف پگھلتی ہے

بوساں، اسا، سانتو کا اور یاما کوچی کے کلام کا تراجم کا بھی یہی رنگ ہے۔

شام دھندلکے میں
اس کی آنکھیں روشن ہیں
دل کے رستے میں

برف ہوا برسات
ہجرت رُت میں کوچ کریں
آؤ سب کے ساتھ

طائر کہتے ہیں
اڑتے طیارے کے پر

ساکت رہتے ہیں

اقبال حیدر نے پنجابی، پشتو، بلوچی، سرائیکی، براہوی، ہندکو اور سندھی زبانوں میں لکھی جانے والے ہائیکو کا اردو منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ شیخ ایاز کے ایک سندھی ہائیکو کا ترجمہ دیکھئے:

شیخ ایاز

تتر بولن تھا
کی دوراز ڈنڈم
مون لئے کولن تا

ترجمہ

تیتر بولتے ہیں
دھند میں بھی کچھ دروازے
مجھ پر کھولتے ہیں

اور آخر میں اقبال حیدر کے کہے ہوئے اردو واکا (تنکا) کے ایک ترجمے پر اقبال حیدر کے اس جائزے کو ختم کرتے ہیں کہ اس کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے کہ اس جاپانی صنف شاعری کے اول تین مصرعوں کو جدا کر کے ہائیکو کی صنف کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

شہروں کا آزار
ہمسایوں کے بیچ میں ہے
اونچی سی دیوار
بے خوابی کی راتیں ہیں
دیہاتوں کی باتیں ہیں

یہ ہے اقبال حیدر کے ہائیکو شاعری کا ایک طائرانہ سا جائزہ، اگرچہ وہ ایک مفصل مربوط مقدمے کا تقاضا کرتا ہے اور وہ اس کی مستحق ہے۔

اقبال حیدر کی شخصیت اور اس کے ہائیکو کے متعدی مرض کا جس نے پاکستان کی تمام زبانوں کے شعراء میں یہ بیماری پھیلا دی ہے' میں اس وقت قائل ہوا جب اس مضمون کے ختم ہوتے ہوتے اس مرض کا مجھ پر بھی حملہ ہوا اور میں نے بھی کچھ ہائیکو کہہ ڈالے جو ثبوت میں پیش کرتا ہوں۔ اللہ مجھ پر رحم کرے۔

دیکھ کے تیرا روپ
ساون کی دوپہر میں

ہوئی سنہری دھوپ

☆☆☆

دیس سے دور ہے تو
پھر بھی ہے تجھ میں بسی
مٹی کی خوشبو

☆☆☆

کسی کا اشارا ہے
دل دریا میں ڈوب جا
وہیں کنارا ہے

☆☆☆

چنداہالے میں
روتا بچہ ہنس پڑا
دیکھ کے پیالے میں

☆☆☆

ہر دکھ سہنا ہے
منزل کی خاطر ہمیں
چلتے رہنا ہے

☆☆☆

صحبت ہے بیکار
مذہب عشق میں ایک ہیں
کافر اور دیندار

☆☆☆

تارو لمحے چند
دریا میں وہ نہائے گی
کرلو آنکھیں بند
تھے جو گھٹا کی مثال

جن میں بیلا البیلا تھا
بیلا سے ہیں وہ بال

☆☆☆

رہ کر تجھ سے دور
اب بھی مزاج گلابی سا ہے
اے شہر جے پور

☆☆☆

سہتی کا من روگی
وہ جو اتر پہاڑ سے آیا
رانجھا ہے یا جوگی

☆☆☆

اٹھ محنت سے کات
کٹے گا اچھا سوت
جائے گا ہاتھوں ہات

☆☆☆

خواب ہے یا تعبیر
وینس کے پیکر میں امر ہے
پتھر کی تقدیر

☆☆☆

کہا بھکارن نے
اللہ جوڑی سلامت رکھے
چاند سا بیٹا دے

☆☆☆

دریا میں ہے طوفان
کچے گھڑے سے عشق کا
کس نے رکھا مان

☆☆☆

اجرت ہے یا پریت
ہر مٹکے والی پنہاری
تیری کونسی ریت

☆☆☆

کیا ہے تجھے منظور
دھر منل دھر کوچ چل
ابھی ہے دِلّی دور

☆☆☆

عشق کی جان سے دور
تاج محل کا مدعی
شاہ ہے یا مزدور

☆☆☆

ہونے کا آزار
مچھلی کی تقدیر ازل سے
کانٹا، ڈور، شکار

☆☆☆

ہنستا ہے بچہ
خواب وہ شاید دیکھ رہا ہے
تتلی، جگنو کا

☆☆☆

ہادیٔ اسلام
دین ہو یا دنیا مری

سب کچھ آپ کے نام

☆☆☆

رخسانہ صبا (کراچی)

نیرنگیٔ فطرت کا سچا عکاس سہیل احمد صدیقی

کائنات کا تمام تر حسن جلوہ ہائے رنگ رنگ سے عبارت ہے۔صبح کی سپیدی ہو یا رات کی تاریکی، سبزہ ءِ صحرا کی دل پذیری ہو یا نیلگوں سمندر کی بے کرانی...... جدھر نظر اٹھایئے فطرت کے سات بنیادی رنگ ہزار ہا رنگوں کی صورت میں منعکس نظر آتے ہیں البتہ تخلیقی عمل کا سلسلہ ذرا مختلف ہے۔رنگ احساسِ جمال ہو یا بے رنگیءِ خیال...... وہ ہر کیفیت میں ایک نئی رنگ آمیزی کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔تخلیقی نظر مظاہر اور محسوسات کے درمیان ایک جمالیاتی اور معنیاتی نظام قائم کرتی ہے اور نئے خیال کشید کرتی ہے......سہیل احمد صدیقی کی مندرجہ ذیل خوبصورت ہائیکو میری نظر سے گزری تو مجھے کچھ ایسا ہی خیال آیا:

خوش کن ہے پت جھڑ
برگِ سرخ یہ کہتا ہے
اک بوسہ مجھ پر

پت جھڑ کا تصور ہماری ادبی وسماجی روایت میں عمومی طور پر غم واندوہ کی کیفیت اور زرد رنگ کی علامت کے طور پر موجود ہے لیکن سہیل احمد صدیقی کی یہ ہائیکو ایک نئی معنویت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ سرخ رنگ ہمارے سماج میں زندگی کے نئے پہلوؤں اور نئے رنگوں سے آشنائی کا مظہر ہے اور یوں بھی سرخ رنگ ہمارے جسم میں لہو کی صورت زندگی بن کر گردش کر رہا ہے......اس حوالے سے پت جھڑ کی کیفیت ہمیں زندگی کے نئے پہلوؤں سے آشنائی کی نوید سناتی ہے۔

ممتاز شاعر، ادیب اور نقاد ڈاکٹر ابوالخیر کشفی اپنے مضمون ''پہلا اور آخری نغمہ'' میں لکھتے ہیں: ''ہائیک

جھرنے کی آواز' برف کی سفیدی' پہاڑ کی چوٹی پر تازہ ہوا کا نام ہے۔ہائیک' سردی کی چاندنی رات' غروبِ آفتاب سے کچھ پہلے پرندے کی اڑان اور پتے پر شبنم کی لرزش کا نام ہے۔۔۔۔۔۔جس میں یارا ہو وہ ہائیک کہئے' ہائیک تین مصرعوں کا نام نہیں' فطرت کے ساتھ انسان اور جذبات کی قلم لگانے کا نام ہے۔''

اس اقتباس کی روشنی میں جب ہم سہیل احمد صدیقی کی ہائیکو کا مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ فطرت کے ساتھ انسان اور جذبات کی قلم لگانے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ان کی شعوری کوشش یہ رہی ہے کہ ہائیکو کی شناخت کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے' اسی لیے ان کی تخلیق کردہ ہائیکو میں فطرت کی علامتیں تازہ کاری کے ساتھ موجود ہیں مثلاً

☆خوشبو لہرائی   ☆جھرنے گرتے ہیں   ☆مٹی مہکی ہے   ☆اڑتی ہے بس دھول   ☆مست ہوا ساون
تیری آمد ہے یا پھر   گوری تیرے قدموں میں   اب کے ساون میں کھل کر   یادبگولہ' دل میرا   زلف گھٹا میں پوشیدہ
فصل گل آئی   موتی رلتے ہیں   چڑیا چہکی ہے   اک پژمردہ پھول   اس کا سیمیں تن

☆کیسا افسوں ہے   ☆سورج سرگوشی   ☆ مئے گوں تھے گل نار   ☆دل بھی کیسا ہے   ☆ بس شرمندہ ہے
برف پڑی ہے چوٹی پر   شرماتی ہے برفیلی   مست ہوا بھی شوریدہ   خواہش کے دریا پی کر   اک بھونرے کے بوسے سے
چہرہ گلگوں ہے   چوٹی شاگوری   مجھ سے بچھڑا یار   بالکل پیاسا ہے   گل افسردہ ہے

[شاگوری دنیا کی دوسری بلندترین پہاڑی چوٹی کے۔ٹو[K-2] کا بلتی زبان میں نام ہے]

☆پھول جو رویا ہے   ☆سناٹا بولا   ☆بادل آئے ہیں   ☆بے موسم خواہش   ☆آنکھ میں در آئی
شبنم نے اس کا مکھڑا   رات کی رانی مہکی جو   بن بارش کیوں یکجا ہیں   تجھ بن کیسے بھیگوں میں   ننھی تتلی چپکے سے
خوب ہی دھویا ہے   دل میں درد اٹھا   چھاگل لائے ہیں   گرما کی بارش   دل میں اتر آئی

سہیل نے حمدیہ اور نعتیہ ہائیکو میں بھی ممتاز شعراء سے فطرت نگاری سے بھرپور کلام لکھوایا اور خود بھی ایسے ہائیکو تخلیق کیئے:

☆جلوہ کو بہ کو   ☆ ہردم' ہر ساعت   ☆ مصروفِ تحمید
چنبیلی ہو یا چمپا   ندی' دریا' چشمے سب   خاروں' کہساروں میں بھی
جنگلی پھول میں تو   مشغولِ مدحت   تیری ہی تمجید

☆سارا عالم دھول   ☆کیسے نظّارے   ☆سید و سرور (ﷺ)
آقا (ﷺ) کے آجانے سے   خاکِ مدینہ آئینہ ہے   بزم علاء میں جھکتے ہیں
کھل گئے ہر جا پھول   ذرّے ہیں تارے   سب شاہوں کے سر

سہیل احمد صدیقی ہائیکو میں پانچ۔سات۔پانچ کے قائل ہیں اور پنجاب کے مکتب مساوی الاوزان کو درست نہیں سمجھتے' اگرچہ مدیر کی حیثیت سے اپنے رسالے میں ان کا کلام ضرور شائع کرتے ہیں۔اردو زبان کے دیگر شعراء کی طرح وہ بھی ''غزل زدہ'' ہائیکو سے مکمل اجتناب تو نہیں برت سکے لیکن انھوں نے اردو کی رائج اور اصل جاپانی ہائیکو کا امتزاج ضرور پیش کیا ہے۔ذرا دیکھیئے مندرجہ ذیل غیر مقفیٰ ہائیکو جو جاپانی رنگ کی مظہر ہیں:

☆داؤدی کا پھول   ☆چاندنی چھٹکی ہے   ☆جھیل میں جوں سارس   ☆مینھ جو برسا ہے   ☆ کان میں رس گھولے
جس کو دیکھ کے یاد آئے   دل کے ویراں کھنڈر میں   ہردم یوں رہتا ہوں میں   کچھ کچھ بدلا ہے جانم   ڈالی ڈالی رس چوسے
الھڑ' نازک نار   میلہ لگتا ہے   تیری یاد میں گم   اندر کا موسم   اک نیلی چڑیا

☆پھر کب دیکھوں گا   ☆چیری مہکی تو   ☆ پیتم تیری یاد   ☆دونوں کا غم ایک   ☆منظر پُراسرار
برکھا رت میں یہ منظر   میں نے یہ جانا دلبر   میگھا چھم چھم برسے ہے   مشرق میں رخشاں تارا   جنگل کے سناٹے میں
تارے اور بادل   رت وہ بیت گئی   آنکھوں سے دن رات   اور میں بھی تنہا   مینڈک کی آواز

سہیل اگرچہ اپنی ہائیکو میں سندھی' پنجابی اور دیگر زبانوں کے الفاظ بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے لیکن خاص طور پر اپنے کلام میں ہندی زبان کی کوملتا اور فارسی زبان کی شیرینی کو سمونے کی کوشش ضرور کرتے ہیں......اس طرح انھوں نے جن لفظیات اور تراکیب کا استعمال کیا ہے ان کی بدولت ان کے ہائیکو میں ایک قسم کی غنائیت اور موسیقیت بھی پیدا ہوگئی ہے اور ساتھ ساتھ گیتوں کا رس اور سادہ جذبات ومحسوسات کی عکاسی بھی ان میں موجود ہے:

☆ڈولے میرا من   ☆آئینہ ہے دل   ☆دل بہلاؤ نا!   ☆ساحل پہ ہر شام   ☆اس کے پیار کی دھوپ
کس کس کو پرچائے گا   نین کنول کی برکھا اور   یاس کے صحرا میں آکر   گیلی ریت پہ لکھتی ہے   چہرے کو نرمائے ہے
کس کس کو پرچائے گا   تاروں کی جھلمل   پھول اگاؤ نا!   پگلی تیرا نام   شام کو اس کا روپ

☆سپنوں کی تعبیر   ☆دل کش اور غم ناک   ☆ہردم تیرا خواب   ☆چہرہ ہے گل فام   ☆مت دکھلاؤ خواب
گوری کیسے دیکھے گی   مست غزال آنکھیں ویراں   من ساگر میں مچلے ہے   گوری پل پل تڑپے ہے   مجھ کو زندہ رہنا ہے
خواب اس کی جاگیر   نیلم کی پوشاک   اک موجِ بے آب   کب ہو مولا شام   جوں ماہی بے آب

سہیل احمد صدیقی نے موضوعاتی ہائیکو میں بھی اثر انگیزی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے' مثلاً پاکستان اور جاپان کی دوستی کے پچاس سال کی تکمیل پر ان کی طبع زاد ہائیکو ملاحظہ کیجئے:

☆گیت سہانے ہیں
کے۔ٹو[k2]اور فوجی۔یاما{ Fujiyama }
میت پرانے ہیں

☆دکھ سکھ سانجھا ہو
ساون رت ہو یا پت جھڑ
راضی رانجھا ہو

یا نیو میلینیئم [New Millennium] کے حوالے سے یہ ہائیکو:

☆کوشش یہ کرلیں
بدلے پت جھڑ کی یہ رت
نئے ہزارے میں

☆نئے ہزارے میں
آ ؤ مل کر دنیا میں
انساں کو ڈھونڈیں

﴿سہیل نے یہ لفظ فارسی کی جدید لغات سے اخذ کیا ہے﴾

اسی طرح ملکی حالات اور وادیءِ کشمیر کے حوالے سے بھی ان کے یہاں دلکش ہائیکو موجود ہیں' مثالیں ملاحظہ کیجیے:

☆کتنی غربت ہے
آبِ گُم آ کر دیکھیں
کس کو فرصت ہے

☆چاروں اور ہے گرد
وحشت ساماں ہے موسم
سایہ بھی ہے زرد

☆گولہ اور بارود
ہائے ہم سے چھوٹ گئے
مشک و عنبر' عود

☆رنگیں ہے تصویر
خون کے سچے رنگوں سے
وادیءِ کشمیر

☆سیاچن کہتا ہے
میرے پھولوں کی خاطر
جھگڑا رہتا ہے

سہیل احمد صدیقی نے ۱۹۹۸ء میں جنوبی ایشیا کے پہلے اور واحد کثیر لسانی [multi-lingual] ہائیکو جریدے' ہائیکو انٹرنیشنل کا بطور مدیر و ناشر اجراء کیا۔اب تک اس کے کئی شمارے منظر عام پر آ چکے ہیں' جن میں چار مشاہیر یعنی محسن بھوپالی' وضاحت نسیم' اقبال حیدر اور رئیں علوی پر خصوصی نمبر شائع ہوئے ہیں......خاص طور پر اقبال حیدر نمبر اس حوالے سے ضرور فتح مندی کا اعلان ہے کہ جب کسی ایک صنف سخن کے مخالف کئی لشکر صف آرا ہوں تو اس پر بیک وقت کئی زبانوں میں کام کر کے اس کے فروغ کی راہ ہموار کرنا جی داری کی علامت ہے......اور اگر مدیر محترم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ ہائیکو کے فروغ کے لیے کوشاں برصغیر کا اولین کثیر لسانی جریدہ ہے تو یہ محض دعویٰ نہیں بلکہ ایسی صداقت ہے جو روزِ روشن کی طرح آشکار ہے۔ اقبال حیدر نمبر اپنی ضخامت اور ہائیکو کے حوالے سے وقیع مواد کی بناء پر اہل فکر و نظر کی توجہ کا مرکز بنا' اس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے جن میں شاعر کا کلام' مشاہیر کے مضامین اور اقبال حیدر کے تراجم کے علاوہ پندرہ زبانوں میں مواد شامل ہے......جاپان سمیت کسی ملک میں ہائیکو کے حوالے سے اتنی زبانوں میں کام کہیں نہیں ہوا۔

ہائیکو انٹرنیشنل اب تک پچیس سے زائد زبانوں میں ہائیکو اور اس سے متعلق مواد شائع کر چکا ہے جو یقیناً ایک عالمی ریکارڈ ہے اور ہائیکو سے محبت کرنے والوں کے لیے باعث فخر بھی۔سہیل احمد صدیقی نے اردو اور انگریزی میں متعدد ہائیکو نگاروں کی تخلیقات پر روشنی ڈالنے کے علاوہ ان دونوں زبانوں نیز سندھی میں بعض تکنیکی معاملات پر قلم اٹھایا ہے......کراچی کے کئی شعراء نے ان کی تحریک و ترغیب سے ہائیکو نگاری شروع کی۔ان کی

ادبی و صحافتی تحریروں کی تعداد (طبع زاد و تراجم) اردو اور انگریزی میں ساڑھے تین سو سے زائد ہے......انھوں نے اب تک فرینچ' انگریزی' فارسی اور سندھی کے متعدد منظوم اور منثور تراجم براہ راست کئے ہیں' اردو سے انگریزی اور فرینچ میں بھی منظوم اور منثور تراجم کر چکے ہیں۔اقبال حیدر کی ہائیکو کا آزاد فرینچ ترجمہ بہت مشکل کام تھا جو انھوں نے انجام دیا۔وہ غالباً پہلے شاعر ہیں جن کی دو انگریزی نظموں کو تین مرتبہ (۱۹۹۲ء' ۱۹۹۴ء اور ۲۰۰۲ء میں) امریکا کی نیشنل لائبریری آف پوئیٹری' انٹرنیشنل لائبریری آف پوئیٹری اور انٹرنیشنل سوسائٹی آف پوئیٹس کے عالمی انتخاب کلام میں شامل کیا جا چکا ہے۔

ماہنامہ 'صریر' (۲۰۰۱ء) میں مطبوعہ ''ادب کہانی۔۱۹۹۸ء'' میں ڈاکٹر انور سدید نے ہائیکو کا جائزہ لیتے ہوئے ہائیکو انٹرنیشنل کو دینی ہائیکو کی اشاعت کے حوالے سے منفرد قرار دیا۔

اسی طرح ڈاکٹر انور سدید نے ماہنامہ 'تخلیق' (لاہور) میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا:

'' سہیل احمد صدیقی ہائیکو کا انٹرنیشنل روپ نکھارنے کے لیے ہمہ تن مصروف ہیں۔وہ ہائیکو کے فروغ میں وہی کردار ادا کر رہے ہیں جو انشائیہ میں ڈاکٹر وزیر آغا نے ادا کیا اور اب ماہیا میں حیدر قریشی ادا کر رہے ہیں...... سہیل احمد صدیقی کی اپنی ہائیکو میں فطرت سے موانست کا زاویہ نمایاں ہے اور وہ اردو ہائیکو کو جاپانی ہائیکو کے مماثل بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

الغرض اس سفر میں بے شمار مسائل اور مشکلات کا شکار ہونے کے باوجود سہیل احمد صدیقی جس حوصلے اور توانائی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہائیکو سے ان کی محبت ضرور رنگ لائے گی۔

''ہر صنف سخن کی طرح ہائیکو نظم بھی اپنی ایک شناخت رکھتی ہے۔اسے اردو میں رائج کرتے ہوئے اس کی پہچان اور ہیئت کی پاسداری بھی ضروری ہے ورنہ ہائیکو بہ حیثیت ایک صنفِ سخن اردو شاعری میں مقام حاصل نہیں کر سکے گی۔ڈاکٹر رفعت اختر نے ہائیکو کے اوزان کا تعین کر کے بڑا کام کیا ہے۔ہائیکو کا پہلا اور تیسرا مصرعہ ہم وزن اور درمیانی مصرعہ نسبتاً طویل ہوتا ہے۔ایک یا دو رکن زیادہ۔جاپانی شاعری کے ضوابط کی مکمل پیروی اردو شاعری میں ممکن نہیں جس کی نشاندہی ڈاکٹر رفعت اختر نے اپنے مضمون ''اردو ہائیکو'' میں کی ہے۔لیکن اس کے ارکان کی کمی بیشی اور آخری مصرعے کی اہمیت کے ساتھ ہائیکو کی مخصوص شناخت بڑی آسانی سے برقرار رکھی جا سکتی ہے۔''

(**ادا جعفری** کے پیش لفظ ''**ھائیکو۔تنقیدی جائزہ**'' **پر ایک نظر**۔سے اقتباس بحوالہ کتاب **ھائیکو۔تنقیدی جائزہ** از ڈاکٹر رفعت اختر مطبوعہ ۱۹۹۳ء)

تبسم کاشمیری (جاپان)

زمیں پہ پھول نہ پتہ دکھائی دیتا ہے
جدھر بھی جاؤں میں صحرا دکھائی دیتا ہے

فقط نہیں ہوں میں تنہا اداس بستی میں
میں جس کو دیکھوں وہ تنہا دکھائی دیتا ہے

یہ شہر کیسا ہے جس میں کہ ریت اگتی ہے
یہاں پہ پھول ،نہ پتہ دکھائی دیتا ہے

چلے چلو کہ ابھی دور اپنی منزل ہے
ابھی تو شام ہے،رستہ دکھائی دیتا ہے

ابھی فُرات پہ ابنِ زیاد اترا ہے
ابھی یزید کا دستہ دکھائی دیتا ہے

عجب زماں ہے کہ ہر شخص ٹوٹا پھرتا ہے
میں جس سے ملتا ہوں خستہ دکھائی دیتا ہے

ابھی چراغ سا جلتا ہے چلمنوں کے ادھر
ابھی وہ جاگتا پھرتا دکھائی دیتا ہے

تبسم کاشمیری

مثالِ شعلۂ مشتاق رات بھر جلنا
مثالِ آئینہ حیرت میں ڈوبتے جانا

کسی نگاہ کے تیغے کا وار سہنے کو
سرِ جنوں کو ہتھیلی پہ چومتے جانا

ہوائے ابر میں بادہ کشی سے خوش ہونا
حصارِ گل کی تمازت میں جھومتے جانا

کسی کے پھول لبوں کی مہک سے کھل اُٹھنا
کسی کے جسم کی خوشبو میں جھولتے جانا

اترنا آئینہ خانہ میں اور گم ہونا
مدام منظرِ حیرت میں ڈوبتے جانا

کسی کے چاند بدن پہ گلاب رکھ دینا
کسی کے پھول سے جامے کو کھولتے جانا

تبسم کاشمیری

ہواؤں میں کوئی یہ چیخ سی ہے
فضاؤں میں کوئی یہ چیخ سی ہے
کوئی روتا ہے اپنے گھر کی چھت پر
نواؤں میں کوئی یہ چیخ سی ہے
کوئی سجدے میں گریہ کر رہا ہے
دعاؤں میں کوئی یہ چیخ سی ہے
کنارِ دجلہ کوئی آگ سی ہے
ہواؤں میں کوئی یہ چیخ سی ہے
فغاں اک ،بادلوں سے اُٹھ رہی ہے
گھٹاؤں میں کوئی یہ چیخ سی ہے
ہوائے دشت کیوں روتی ہے لیلیٰ
صداؤں میں کوئی یہ چیخ سی ہے
زمینِ نجد مجنوں کی خبر لے
فضاؤں میں کوئی یہ چیخ سی ہے
بدن ہے یہ کہ ہے یہ کوئی نوحہ
قباؤں میں کوئی یہ چیخ سی ہے
شمر نے آج پھر نیزہ ہے مارا
بلاؤں میں کوئی یہ چیخ سی ہے
کوئی سمجھے نہ سمجھے شعر میرا
ہواؤں میں کوئی یہ چیخ سی ہے

تبسم کاشمیری

ہم تیری زلف کے بندے تھے تری زلف کی راہ میں فقیر ہوئے
ترے رستے میں سب کچھ کھو کر ہم پہلے سے بھی امیر ہوئے

جس ماتھے پہ چاند اترا تھا،جس آنکھ میں تارہ چمکا تھا
اس آنکھ کا جادو جادو تھا،جس آنکھ سے سب تسخیر ہوئے

کل ابر تھا تیری چھت اوپر،کل مہتابی پر ماہ بھی تھا
ہم چپ چپ ماہ کو تکتے تھے کیا کہیے کیوں دلگیر ہوئے

اب کون اٹھائے ناز ترے؟اب کون نبھائے رسمِ وفا
جو عاشق تھے جاناں تیرے وہ سب کے سب شمشیر ہوئے

اک راہ تھی مسجد کو جاتی اک رستہ تھا میخانے کو
ہم چھوڑ کے مسجد کا رستہ میخانے کے راہگیر ہوئے

کیا زور تھا بازوئے قاتل میں،کیا تیزی اس کے وار میں تھی
دیکھا جو اس کے کوچے میں،عشاق سبھی نخچیر ہوئے

جو اس کے قصے کہتے تھے،جو اس کی باتیں کرتے تھے
وہ ہم جیسے ہی عاشق تھے یا ہم سے پہلے میؔر ہوئے

اب نکلو بھی میخانے سے اور دَیر میں جا پرنام کرو
اب عہدِ جوانی بیت چکا لو صاحب اب تم پیر ہوئے

اکبرحمیدی (اسلام آباد)

کب تلک وقت ٹالنا ہوگا
راستہ تو نکالنا ہوگا

اگلی نسلوں کو کفر سازی کے
چکّروں سے نکالنا ہوگا

نئی دنیا کے جگمگانے کو
نیا سورج اچھالنا ہوگا

عقل بھی عشق کرنا جانتی ہے
خود کو بس اعتدالنا ہوگا

زندگی کی ہے ایک شرط یہی
اِک نہ اِک روگ پالنا ہوگا

جس طرح سے بھی ہومگر اکبر
بُرے وقتوں کو ٹالنا ہوگا

اکبرحمیدی

مجھے تُو ہی نہیں سارا زمانہ چاہیئے ہے
کہ اِک گوہر تو کیا پورا خزانہ چاہیئے ہے

گذشتہ عمر تو اِس خبط میں ہم نے گنوائی
محبت کے لیے اچھا گھرانا چاہیئے ہے

غزالوں کے شکاری تجھ کو یہ بھی سوچنا تھا
شکاری کو بہت کچھ دام ودانہ چاہیئے ہے

جہاں شاہ وگدا اپنے پرائے ایک سے ہوں
حقیقت میں ہمیں اِک بادہ خانہ چاہیئے ہے

بغیر اس کے نہیں آئے گا اس میں لطف کوئی
حقیقت کو بھی کچھ رنگِ فسانہ چاہیئے ہے

یہ دنیا تم کو حسن وعشق کی مورت لگے گی
پر اندازِنظر بھی عاشقانہ چاہیئے ہے

جسے سنتے ہوئے خود کو فقط انسان سمجھیں
ہمیں اکبروہ انسانی ترانہ چاہیئے ہے

اکبرحمیدی

خواب اب چبھنے لگے آنکھوں میں
وہ بھی دن تھے کہ سجے آنکھوں میں

میں نے دیکھا اُسے سب زاویوں سے
اُس کے سب رنگ پڑے آنکھوں میں

تن بدن اُس کے بھی کلیاں چٹکیں
میرے بھی پھول کھلے آنکھوں میں

وہ مناظر تھے حواس اُڑنے لگے
پھر مرے بارہ بجے آنکھوں میں

دل کے آنگن میں نہ کھل پائے تھے جو
سب کے سب کھلنے لگے آنکھوں میں

وہ الاؤ جو کبھی ذہن میں تھے
اُس کو دیکھا تو جلے آنکھوں میں

جو نہ اکبر کبھی لکھ پایا اُسے
سب خطوط ایسے لکھے آنکھوں میں

اکبرحمیدی

گئی گذری کہانی لگ رہی ہے
مجھے ہر شے پُرانی لگ رہی ہے

وہ کہتا ہے کہ فانی ہے یہ دنیا
مجھے تو جاودانی لگ رہی ہے

یہ ذکرِآسماں کیسا کہ مجھ کو
زمیں بھی آسمانی لگ رہی ہے

ہر ایک نوخیز کی مغروریوں میں
تری کافر جوانی لگ رہی ہے

بہت خوش معنی سی تحریر ہے وہ
کسی کی خوش بیانی لگ رہی ہے

وہ اِس حُسنِ توجہ سے ملے ہیں
یہ دنیا پُر معانی لگ رہی ہے

غزل دنیا میں رہتا ہوں میں اکبر
یہ میری راجدھانی لگ رہی ہے

آفاق صدیقی (کراچی)

محرمِ جاں کوئی دیوار نہ در لگتا ہے
اپنا گھر تو کسی اور کا گھر لگتا ہے

باغ سرسبز ہے لیکن یہ شجر کیسے ہیں
جن کی ہر شاخ پہ زہریلا ثمر لگتا ہے

جانے کس جادۂ خوں ریز پہ چل نکلے ہیں
ہر قدم اک نئے مقتل کا سفر لگتا ہے

خود فریبی کو تباہی کا بھلا کیا احساس
اپنا ہر عیب ہمیں کارِ ہنر لگتا ہے

ہم بھی دیکھیں تو کہیں وفا کی صورت
کوئی بتلائے وہ بازار کدھر لگتا ہے

آفاق صدیقی

محبت بے نیازِ عہد و پیماں ہے جہاں میں ہوں
خزاں کا نام بھی فصلِ بہاراں ہے جہاں میں ہوں

بیاباں ہے نہ محمل ہے نہ اب محمل نشیں کوئی
جنوں بے گانہء جیب وگریباں ہے جہاں میں ہوں

کوئی چرچا نہیں افسردگی کا غنچہ وگُل میں
ادائے جورِ گلچیں لطفِ ساماں ہے جہاں میں ہوں

کہیں روشن ہیں دل کے داغ جلتے ہیں کہیں آنسو
جدھر دیکھو چراغاں ہی چراغاں ہے جہاں میں ہوں

سبکسارانِ ساحل کی رواداری سے کیا حاصل
مزاجِ زندگی کانوسِ طوفاں ہے جہاں میں ہوں

جہنم بن گئی ہو اپنی بے تابی تو کیا کیجیے
بظاہر ایک فردوسِ لگاراں ہے جہاں میں ہوں

امید چارہ سازی اور اس دورِ جراحت میں
وفورِ درد ہی خود اپنا درماں ہے جہاں میں ہوں

فرارِ عافیت کی کوئی صورت ہی نہیں بنتی
بڑی مضبوط ہر دیوارِ زنداں ہے جہاں میں ہوں

آفاق صدیقی

زندگی اور اس دور کی زندگی
اک نئی تیرگی اک نئی روشنی
یہ زمیں تو زمیں ماہ وانجم پہ بھی
آگہی اپنا جادو جگانے چلی
بزمِ ہستی میں ہے کس قدر دلکشی
پھر بھی محسوس ہوتی ہے کوئی کمی
معتبر کوئی غم ہے نہ کوئی خوشی
اف یہ تہذیبِ حاضر کی جلوہ گری
دیدنی ہے محبت کی افسردگی
جیسے مرجھا کے رہ جائے کوئی کلی
بڑھ گئیں اور بھی دل کی بے چینیاں
جی بہلنے کی جب کوئی تدبیر کی
دیکھ کر تیری محفل کی رنگینیاں
دم بخود ہے مرے شوق کی سادگی
خواہش ولولے کاوشیں حوصلے
کتنی خوش فہمیوں میں ہے ہر آدمی
قربت لہوشاں اور عمرِ رواں
بہتے پانی پہ چھٹکی ہوئی چاندنی
روحِ انسانیت اور یہ کشمکش
جیسے گرداب میں ڈوبتی سوہنی

آفاق صدیقی

انہیں قید و بند کا غم ہو کیا جو ہر امتحاں سے گزر گئے
سبھی عاشقانِ شکستہ دل یونہی اپنی جاں سے گزر گئے

بڑی پر خطر تھی رہِ طلب مرا ذوق وشوق بھی ہے عجب
دیا ترے پیار نے حوصلہ تو کہاں کہاں سے گزر گئے

کوئی مال وزر کی ہوس رہی نہ جچی کسی کی سکندری
ہمیں مل گئی وہ قلندری ہر این وآں سے گزر گئے

تری جستجو مری جانِ جاں ہمیں کو یہ کو ہے بہر زماں
کبھی ہم زمیں سے گزر گئے کبھی آسماں سے گزر گئے

ہمیں بے خودی نے خبر نہ دی کہ نشیب کیا ہے فراز کیا
دلِ دوستاں کی تلاش میں صفِ دشمناں سے گزر گئے

انھیں سرکشی کی سزا نہ دے کہ ازل سے مستِ الست ہیں
جو بغیر سجدہ کئے ہوئے ترے آستاں سے گزر گئے

آفاق صدیقی

جب تک ترے جمال کی رعنائیاں رہیں
کیا کیا نہ میری حوصلہ افزائیاں رہیں

نظارہ درمیاں تھا تجھے کیسے دیکھتے
آنکھوں میں کچھ عجیب سی پرچھائیاں رہیں

تجھ سے بچھڑ گئے تو ہمیں جلوتوں میں بھی
سب سے قریب تر تری تنہائیاں رہیں

یاد آئی جب کبھی ترے لہجے کی نغمگی
دھیمے سروں میں گونجتی شہنائیاں رہیں

پانی پہ جب بکھر سا گیا چودھویں کا چاند
میری نگاہ میں تری انگڑائیاں رہیں

ممکن ہے خود کو بیچ کے بھی کچھ نہ مل سکے
بازار میں اگر یہی مہنگائیاں رہیں

آفاقؔ وہ نہیں ہے تو کیا رونقِ حیات
کہنے کو لاکھ انجمن آرائیاں رہیں

ڈاکٹر محبوب راہی (اکولہ)

اونگھتے دن، چیختی راتوں سے بچنا چاہیے
وقت کی بے کیف سوغاتوں سے بچنا چاہیے
ہر تکلف ، دلنشیں باتوں سے بچنا چاہیے
مخلصو! اخلاص کی گھاتوں سے بچنا چاہیے
اپنی بے لوثی کا جو اظہار کرتے ہیں سدا
ایسے لوگوں کی ملاقاتوں سے بچنا چاہیے
ملتے ہیں اکثر منافق دوستوں کے روپ میں
کیسے آخر ایسے بد ذاتوں سے بچنا چاہیے
ملک وملّت کی انہیں ہاتھوں میں ہے اب باگ ڈور
ملک اور ملّت کو جن ہاتھوں سے بچنا چاہیے
جیت کے نشّے میں سرشارانہ قال و حال سے
جیتنے کے بعد کی باتوں سے بچنا چاہیے
آج وہ جانیں جو دنیا کے لیے ہیں ناگزیر
ماں کہاں کرتی تھی ''ان باتوں سے بچنا چاہیے''
گھاؤ دل پر جھیل کر بے مہریٔ احباب کے
دشمنوں کی مرہمی گھاتوں سے بچنا چاہیے
شعر کی توقیر کا راہیؔ جو رکھنا ہو بھرم
تو اسے نقّاد کی نگاہوں سے بچنا چاہیے

☆☆☆

ڈاکٹر محبوب راہی

روشنی کی ترجماں میری غزل
زندگی کی رازداں میری غزل

نور افشاں، درخشاں میری غزل
کہکشاں در کہکشاں میری غزل

تشنگیِ فکر و نظر کی لب بہ لب
چشمۂ آب رواں میری غزل

دے کے وسعت ہر زمین تنگ کو
چھو رہی ہے آسماں میری غزل

کچھ ہے آپ اپنی حکایات جنوں
کچھ حدیث دیگراں میری غزل

جگمگاہٹ میں ستاروں سے سوا
رشک ماہ و کہکشاں میری غزل

سوہنی مہیوال سے تاجوئے شیر
داستاں در داستاں میری غزل

سوز میرؔ، اقبالؔ کا جذب دروں
اور غالبؔ کا بیاں میری غزل

صرف ا سکا تذکرہ مقصود ہے
اب کہاں وہ اور کہاں میری غزل

ہر گھڑی سرسبز ہے شاداب ہے
ہوں بہاریں یا خزاں، میری غزل

معنویت کا لیے ہر شعر میں
ایک بحر بیکراں میری غزل

سلسلے مفہوم در مفہوم کے
اک جہاں اندر جہاں میری غزل

جدّت و ندرت کی جلوہ سازیاں
کچھ عیاں ہے کچھ نہاں میری غزل

جیسے اک وحشت زدہ زخمی ہرن
ناقدوں کے درمیان میری غزل

آگ تھی اے بے بصیرت ناقدو
ہوگئی آخر دھواں میری غزل

میرؔ و غالبؔ ہوئے جہاں راہیؔ وہاں
میں بھلا کیا اور کہاں میری غزل

ڈاکٹر محبوب راہی

چلیں گے تھوڑا دم لے کر ذرا سورج نکلنے دو
بدلنے دو ذرا منظر، ذرا سورج نکلنے دو
صف ماتم بچھی ہے قتل شب پر بزم انجم میں
بپا ہے عرصۂ محشر ذراسورج نکلنے دو
اندھیرے چندلمحوں میں بساط اپنی اٹھالیں گے
بہے گا نور سڑکوں پر ذرا سورج نکلنے دو
ابھی چہروں کےخدوخال دھندلائے ہوئے ہوں گے
نہیں واضح کوئی پیکر ذرا سورج نکلنے دو
ہمیں تعبیر بھی تو دیکھنی ہے اپنے خوابوں کی
مرے ہمدم، مرے دلبر ذرا سورج نکلنے دو
سنپولے تیرگی کے سرسراتے پھر رہے ہوں گے
ابھی ہر سمت رستوں پر، ذرا سورج نکلنے دو
کہاں ہیں وہ نئی صبحوں کی تعبیروں کے سوداگر
کہا کرتے تھے جو اکثر ذرا سورج نکلنے دو
سکڑتے بڑھتے سایوں کے، پھراپنوں اور پرایوں کے
بدلنے والے ہیں تیور ذرا سورج نکلنے دو
ابھی کھل جائے گا راہیؔ بھلا کیا ہے بُرا کیا ہے
وہ رہزن ہے کہ ہے رہبر ذرا سورج نکلنے دو

☆☆☆

میری آشفتہ مزاجی کا سبب جانتا ہے
کوئی جانے کہ نہ جانے مرا رب جانتا ہے
اجنبیت میں کوئی مصلحت ہوگی اس کی
ورنہ وہ شخص مرا نام و نسب جانتا ہے
وہ بڑا آدمی ، لاکھوں میں ہے شہرت جس کی
ہم اسے جانتے ہیں وہ ہمیں کب جانتا ہے
میرے مالک کے کرم کا کوئی اندازہ بھی ہے
ہر ضرورت مری ، ہر میری طلب جانتا ہے
جس کی دہلیز کے دربان ہوں چاند اور سورج
ظلمت شب کو وہ کب ظلمت شب جانتا ہے
کس کو ہوتاہے مصیبت کا کسی کی احساس
جس پر جب آن کے پڑتی ہے وہ تب جانتا ہے
اپنے سر پیر کا تک ہوش نہیں ہے اس کو
بات یوں کرتا ہے جیسے کہ وہ سب جانتا ہے
وہ تو ہے حسن کا دیوانہ شب و روز کو وہ
سایۂ زلف سیہ ، سرخیِ لب جانتا ہے
ماسوا شان کریمی ترا بندہ مولا
تیرا غصّہ نہ ترا قہر و غضب جانتا ہے
من و تو پر نہیں موقوف کہ سارا عالم
عظمت و مرتبۂ خاک عرب جانتا ہے
اک یہی بات کہ میں دن کو بھی دن کہتا نہیں
شہر کا شہر مجھے شخص عجب جانتا ہے
گامزن اس پہ ہوں چالیس برس سے راہیؔ
مجھ کو ہر نقش رہ شعر و ادب جانتا ہے

ڈاکٹر محبوب راہی

قید کی معیاد گھٹتی جارہی ہے
وقت کی چادر سمٹتی جارہی ہے
روز و شب کی مستقل یکسانیت سے
کچھ طبیعت بھی اچٹتی جارہی ہے
دھیرے دھیرے کھلتے جاتے ہیں دریچے
رفتہ رفتہ دھند چھٹتی جارہی ہے
ڈھہ رہی ہیں درمیاں کی سب فصیلیں
بیچ کی ہر کھائی پٹتی جارہی ہے
پھیلتے جاتے ہیں سایے جیسے جیسے
دھوپ گھٹتی اور سمٹتی جارہی ہے
ایک آدم ایک حوّا کی یہ دنیا
ان گنت خانوں میں بٹتی جارہی ہے
سامنے کے راستے مسدود پاکر
آگہی پیچھے پلٹتی جارہی ہے
دن نکلنا ہے نکل کر ہی رہے گا
رات کو کٹنا ہے کٹتی جارہی ہے
راستوں کی گرد کی مانند راہیؔ
یاسیت مجھ سے لپٹتی جارہی ہے

☆☆☆

نہ دھوپ جیسا نہ چھاؤں سا ہے
مزاج اس کا ہواؤں سا ہے
تمامتر کربلاؤں سا ہے
یہ گاؤں بھی میرے گاؤں سا ہے
کہاں فضائیں وہ وادیوں سی
کہاں وہ منظر گپھاؤں سا ہے
ہر ایک چہرے پہ اجنبیت
ہر ایک شخص آشناؤں سا ہے
وہ بھولی الھڑ سی لڑکی اس میں
کہاں بھلا کچھ اداؤں سا ہے
در آیا ہے شہر اس کے اندر
کہاں کوئی گاؤں، گاؤں سا ہے
نہیں ہوں گلفام سا اگر میں
تووہ بھی کب مہ لقاؤں سا ہے
اگرچہ اولاد نا خلف ہے
سلوک ماؤں کا ماؤں سا ہے
دلار ہے ماں کی گھڑکیاں بھی
غضب بھی اس کا دعاؤں سا ہے
نہیں ہے بندوں سا کوئی بندہ
ہر ایک بندہ خداؤں سا ہے
وہ کارخانوں ، مِلوں کا مالک
دِل اس کا جو ہے گداؤں سا ہے
سریلا سنگیت بات اس کی
سکوت اس کا صداؤں سا ہے
نفس نفس بد دعائیں راہیؔ
غزل کا لہجہ دعاؤں سا ہے

ڈاکٹر محبوب راہی

(برزمین غالب)

لاکھ پھر ہوں شکستہ پا کیا ہے
چل پڑے ہیں تو سوچنا کیا ہے

زندگی کا مآل پوچھتے ہو
موت ہے! اس کے ماسوا کیا ہے

کرکے ہر شے سے بے نیاز مجھے
پوچھتے ہیں کہ مدّعا کیا ہے

کہنے والا ہے کون مت دیکھو
صرف دیکھو کہ کہہ رہا کیا ہے

زخم احساس، رشک خوں کے سوا
زندگی سے مجھے ملا کیا ہے

قبل از مرگ اے مرے مولا
یہ عذابوں کا سلسلہ کیا ہے

غمزہ پھر کس بلا کو کہتے ہیں
عشوہ کیا چیز ہے ادا کیاہے

جس کا دنیا میں کوئی حل ہی نہ ہو
کونسا ہے وہ مسئلہ کیا ہے

گونگے بہروں سے پوچھتے کیا ہو
واقعہ کیا، معاملہ کیا ہے

کوئی پوچھے تو اس کو بتلائیں
ذہن و دل میں ہمارے کیا کیا ہے

گرد آلود، تند، زہریلی
چل رہی ہے جو یہ ہوا کیا ہے

اک ہیولا یہ آدمی جیسا
اصل میں آدمی ہے یا کیاہے

ہے مسلّط جو مجھ پہ اے راہیؔ
شاعری ہے کہ اک بلا کیا ہے

شعر گوئی کے ماسوا راہیؔ
دوسرااپنا مشغلہ کیا ہے

محبوب راہی

نہیں جو ذوق عمل کچھ نہیں ہے کچھ بھی نہیں
ابد ہے کچھ نہ ازل کچھ، نہیں ہے کچھ بھی نہیں
حیات ازل تا ابد نام اک تسلسل کا
اجل کا کیا ہے اجل کچھ نہیں ہے کچھ بھی نہیں
پیام دیتا ہے ہر ڈوبتا ابھرتا دن
جو کچھ ہے آج ہے، کل کچھ نہیں ہے کچھ بھی نہیں
ارادے ہوں متزلزل، نہ دل میں ہو ہل چل
تو ہاتھ پاؤں کا بل کچھ نہیں ہے کچھ بھی نہیں
بلند تاڑ کے مانند جو ہوئے بھی تو کیا
نہ سایہ ہے نہ ہے پھل کچھ نہیں ہے کچھ بھی نہیں
خدا ہے وہ، وہ ہر افتاد ٹال سکتا ہے
کہ اس کے آگے اٹل کچھ نہیں ہے کچھ بھی نہیں
کوئی حکیم بہت خوب کہہ گیا ہے کہ عشق
دماغ کا ہے خلل کچھ نہیں ہے کچھ بھی نہیں
سوائے موت کے کیا اے خدائے عز و جل
ہماری زیست کا حل کچھ نہیں ہے کچھ بھی نہیں
خلوص جنس تجارت نہیں عزیز مرے
کہ اس کا نعم بدل کچھ نہیں ہے کچھ بھی نہیں
ہمارا آئینۂ دل شفاف ہے جس میں
کپٹ ہے اور نہ چھل کچھ نہیں ہے کچھ بھی نہیں
مری غزل کے وہ تیور بھی دیکھ لیں راہیؔ
جو کہہ رہے ہیں غزل کچھ نہیں ہے کچھ بھی نہیں
غزل جو ہوتی ہے آزاد، جو بھی ہو راہیؔ
وہ نظم ہے نہ غزل کچھ نہیں ہے کچھ بھی نہیں

☆☆☆

ہر کوئی ہے کہ خدا خود ہی ہوا چاہتا ہے
اور ہوتا تو وہی ہے جو خدا چاہتا ہے
آنکھ بھر روشنی ، اک سانس ہوا چاہتا ہے
اور کیا اس کے سوا تیرا گدا چاہتا ہے
میرے اندر سے رہا کوئی ہوا چاہتا ہے
جسم بارود کی مانند پھٹا چاہتا ہے
میں نے حلیہ ہی نہیں رکھا تھا سائل جیسا
مجھ سے کس طرح کوئی پوچھتا کیا چاہتا ہے؟
ٹیس پھر درد کی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے
زخم دیرینہ کوئی پھر سے چھلا چاہتا ہے
اب دعاؤں پہ کسی کا بھی بھروسہ نہ رہا
جو کوئی چاہتا ہے صرف دوا چاہتا ہے
جو بھی بویا ہے اسے کاٹنا ہوگا پیارے
کر بھلا اوروں کا خود کا جو بھلا چاہتا ہے
ہم نے جس درد سے کل پائی تھی مرمرکے نجات
آج سینے میں وہی درد اٹھا چاہتا ہے
پھڑپھڑاتا ہے مسلسل رگ جسم و جاں میں
طائر روح بہ ہر لمحہ اڑا چاہتا ہے
میری سوچوں کا بدن، پیکر تخیئل مرا
شعر تازہ کوئی، ملبوس نیا چاہتا ہے
چاہتا ہے دل پُر شوق کوئی چوٹ نئی
جذبۂ شوق کوئی زخم نیا چاہتا ہے
کوئی بھی آج نئی راہوں کا متلاشی نہیں
ہر کوئی نقش کف پا پہ چلا چاہتا ہے
شعر کاحسن تو بس رمز میں ہے اے راہیؔ
اور قاری ہے کہ ہر شعر کھلا چاہتا ہے

حمد نما غزل

خادم رزمیؔ (کبیر والا)

شمار مت کر اسے فقط ہست وبُود میرا
ترا بھی نام و نمود ہے یہ وجود۔۔میرا

جو تونے بھیجا نہیں تو پھر میں کہاں سے آیا؟
یہ کس کی خواہش ہے اس زمیں پر ورود میرا

تری ہی تخلیق ہوں تو کیوں کر الگ ہے تجھ سے؟
ترے جہاں میں کوئی زیاں ہو کہ سُود میرا

اسی پہ موقوف کیا نہیں ہے؟ترا بھی ہونا
یہ نغمۂ زندگی! یہ سازوسرود میرا

تجھی سے منسوب کیا نہیں ‘میرا جلنا بجھنا؟
ترا دیا ہوں تو پھر کہاں ہے یہ دود میرا

نہیں ہوں میں ہی کوئی اکیلا صدا میں اپنی
فقط مرا ہی نہیں یہ شوقِ نمود میرا

انہیؐ پہ تو بھی تو بھیجتا ہے سلام اپنا
طواف کرتا ہے جنؐ کے در کا ،درود میرا

اسے بھی اک بے کلی سی کیوں گھیرتی ہے رزمی!
وہ جس کے در پر اگر نہ ہولے سجود میرا

خادم رزمیؔ

رزق بھی کم دے ہمیں ‘دادِ عطا بھی ہم ہی دیں
پھر حساب اس کا کڑا ‘روزِ جزا بھی ہم ہی دیں

یہ وفا کی کون سی ہے قسم؟ بتلائے کوئی
وہ ستائے بھی ہمیں ‘اس کو دعا بھی ہم ہی دیں

کس نے بخشا ہے ہمیں یوں زیست کرنے کا مزاج!
خود جلیں جس آگ میں ‘اس کو ہوا بھی ہم ہی دیں

یہ بھی اس کا حکم ہے جائیں ہمی ملنے اسے
وہ نہ بولے گر تو پھر اس کو صدا بھی ہم ہی دیں

یہ نہیں کہ وہ جو ظلمت دے ،کرم سمجھیں اسے
خون سے اپنے جلا کر اک دیا بھی ہم ہی دیں

کونسی ہے قِسم یہ انصاف کی ؟اے منصفو!
ہوں ہمی مقتول بھی ،اور خوں بہا بھی ہم ہی دیں

دُور رکھا جائے اس کی خوشبوؤں سے بھی ہمیں
جس بیاباں کو گلابوں کی رِدا بھی ہم ہی دیں

چاہے اپنا خون ہی رزمیؔ،نہ کیوں دینا پڑے
جو سوا ہے اس کو رنگِ ماسوا بھی ہم ہی دیں

خادم رزمیؔ

نجانے کس بے خودی کے زیرِ اثر تھا میں بھی
ملال یہ ہے کہ خود سے کیوں بے خبر تھا میں بھی

مگر یہ قصہ ہے تب کا ،جب ایک چھت تھی مجھ پر
مہک بھری کچھ سجل صداؤں کا گھر تھا میں بھی

بکھر رہی ہو جو چارسُو اِک غبار صورت
کھلا ہے مجھ پر یہ اب کہ ایسی خبر تھا میں بھی

ملی نہیں ہے یونہی مجھے یہ کُلاہِ ہستی
نہیں زیادہ تو اس قدر معتبر تھا میں بھی

اُتار لیتے ہیں پات بھی جس کے ،ساتھ پھل کے
ہوس پرستوں کے درمیاں وہ شجر تھا میں بھی

خوشی سے واپس کیا جو اذنِ رہائی ہنس کر
کوئی تو ہے جس کا یوں اسیرِ نظر تھا میں بھی

یہ اب کھلا ہے اسی کی جانب رواں تھے سارے
لگا ہوا جس سراب کی راہ پر تھا میں بھی

خادم رزمی

رات کا پچھلا پہر ،ڈھلا مہتاب ،ہوا
میں ،تنہائی،آنکھوں میں اک خواب،ہوا
برسوں کے بچھڑے جو کبھی ملاتی تھی
ہوتی ہے محسوس وہ اب نایاب ہوا
پھر کُرلاتے پتّے ،چیختی شاخیں ،شب!
پھر پیڑوں پر لائی ایک عذاب‘ہوا
ایک مدار میں قید رکھے ہیں کیوں جانے!
رات،دیے کی لرزاں لَو،محراب،ہوا
میں انسان ہوں‘ تونے پتھر سمجھا تھا
ٹوٹ رہے ہیں یوں جو مرے اعصاب ،ہوا!
ایک الاؤ میرے اندر دہک اُٹھے
اب تو جب بھی چلتی ہے برفاب ہوا
کیسی صورت ہے ،جس کا ہے کھوج اُسے
صدیوں سے کیوں پھرتی ہے بے تاب ہوا؟
اس میں آکر لوگ ، نجانے کیا ہوجائیں !
جیسے ہو یہ کوئی پرِ سرخاب ہوا
اپنی ساری عمر کٹی کچھ یوں رزمیؔ!
سیلِ ہجر کی لمبی رُت،گرداب،ہوا

خادم رزمیؔ

پہچان ہمیں گردشِ حالات! وہی ہیں
ہم لوگ وہی ،تیری عنایات وہی ہیں

دن رات کے اس سیلِ بلاخیز میں اب بھی
دیوانوں کے احوال ومقامات وہی ہیں

ہم اہلِ نظرہیں ،ہمیں معلوم ہے سب کچھ
بے دھول سہی، پھر بھی یہ دن رات وہی ہیں

کوڑوں سی ہوا پر بھی کوئی پات نہ بولے
اس بار بھی موسم کی ہدایات وہی ہیں

ہوتے ہیں جواں بیٹیوں والے کے جو دل میں
ہر شاخِ ثمردار کے خدشات وہی ہیں

اک زہر مگر پیڑکو پھلنے نہیں دیتا
شاخیں ہیں وہی گرچہ ہرے پات وہی ہیں

الفاظ ہی بدلے ہیں فقط اہلِ ہوس نے
رسمیں ہیں وہی ان کی روایات وہی ہیں

رِندوں سے کسی صلح کی امید نہ رکھے
گر حضرتِ واعظ کے خرافات وہی ہیں

پہلے جو بیاں سچّے صحیفوں میں ہوئے ہیں
اس شہر کے مٹنے کے نشانات وہی ہیں

دن جلتا ہوا دشت ہے ،شب خوف سرا سی
اس تازہ،نئی رُت کے بھی دن رات وہی ہیں

ماتھے پہ ہیں اُس کے بھی وہی سلوٹیں،رزمیؔ !
اور تیرے لبوں پر بھی سوالات وہی ہیں

خادم رزمی

اب وہ بھی سب میرے دھیان میں رہتے ہیں
جتنے لوگ بھی اِک انسان میں رہتے ہیں

جن کی آنکھیں دیکھتی ہیں ملبوس مرا
وہ ناکام مری پہچان میں رہتے ہیں

چاہے سوچ کی حد تک ہی وہ کیوں نہ ہو
پر بستہ بھی ایک اُڑان میں رہتے ہیں

سوچ نہیں رکھتے ہیں لیکن اک جیسی
یوں تو ہم سب ایک مکان میں رہتے ہیں

ابر آتے ہیں بن برسے چھٹ جاتے ہیں
تشنہ لوگ یونہی ہیجان میں رہتے ہیں

آدھی عمر اُصول بناتے کٹتی ہے
آدھی تک ان کے بطلان میں رہتے ہیں

سچ ہی اپنا دین وایماں ہے رزمیؔ!
اور مگن ہم اس ایمان میں رہتے ہیں

ڈاکٹر ولی بجنوری (دہلی)

اِس وحشی بستی سے راتوں رات گذرنا ہے
رک جائے وہ جس کو موت سے پہلے مرنا ہے

اپنے آپ کو اپنا مخالف کرنا ہے پہلے
پھر اس پاگل دل کو بھی صف آرا کرنا ہے

یہ بھی کر گذریں گے اس ملنے کی خاطر
آگ کے ہر دیا سے اب کے پار اترنا ہے

تازہ سرخ گلابوں رُت آئے تو، طے ہے
مرجھائے پھولوں سے اپنا دامن بھرنا ہے

خود سے خوف زدہ بھی ہم کو رہنا ہوگا اب
اور پھر اپنے اپنے سائے سے بھی ڈرنا ہے

پھول بدن کیسے ہوتے ہیں، دیکھیں تو ان کو
اک شب تیری جنت میں بس یونہی ٹھہرنا ہے

ریت کے اُس ٹیلے کو حاصل کرنے دھن میں
پانی کے اک ریلے آگے خود کو دھرنا ہے

ڈاکٹر ولی بجنوری

مہک رہے ہیں جسم و جاں نہ جانے کس خیال سے
ابھی میں آشنا نہیں ہوا ترے وصال سے

تمام ہوچکا ہے گفتگو کا اب معاملہ
کہ بولنے لگے ہیں آئینے ترے جمال سے

جو بات پوچھتی ہے وہ، خلوصِ دل سے پوچھ لے
اداس ہو نہ جاؤں میں ترے کسی سوال سے

ہزاروں سورجوں کو پی کے اڑ رہا ہوں چرخے پر
سفر مرا طویل ہے میں کیوں ڈروں زوال سے

تسلیوں سے میرا دل بہلِ نہ پائے گا کہ اب
کرے وہ مطمئن مجھے کسی عجب مثال سے

نہ خاک وخوں کے موسموں کا ذکر چھیڑ ہمنشیں!
خوشی کا پل عظیم ہے یگوں کے اُس حلال سے

اگرچہ سایہ بن کے اُس کے ساتھ چل رہے ہیں ہم
پتا نہیں وہ بے خبر ہے کیوں ہمارے حال سے

ڈاکٹر ولی بجنوری

غم مسلسل ہوں عطا اک سلسلہ یہ بھی سہی
وہ رہیں مجھ سے خفا اک سلسلہ یہ بھی سہی

پھر اسے میں ڈھونڈ کے لاؤں دیارِ غیر سے
پھر وہ ہوجائے جدا اک سلسلہ یہ بھی سہی

وہ مجھے دیتا رہے سب نفرتیں، سب تہمتیں
کم نہ ہو کوئی سزا اک سلسلہ یہ بھی سہی

چاند نکلے جب اُدھر، مہکیں حسین چہرے اِدھر
آسمانوں کے خدا اک سلسلہ یہ بھی سہی

کوئی موسم ہو ولؔی تانے رہے سر پر مرے
اپنی زلفوں کی ردا اک سلسلہ یہ بھی سہی

ڈاکٹر ولی بجنوری

بجھتے دلوں میں درد کی شمعیں جلاؤں میں
اہلِ خرد کو ہوش کی باتیں سکھاؤں میں

پہلے سجاؤں سبز جزیروں میں وحشتیں
پھر دشتِ بے چراغ میں سورج اگاؤں میں

جس میں کوئی پڑاؤ نہ ہو وہ سفر چنوں
سَر پر جہاں فلک نہ ہو خیمے لگاؤں میں

لکھے ہیں سب لبوں پر فسوں کار قہقہے
آیاتِ غم سناؤں تو کس کو سناؤں میں

کوئی مجھے بتائے حقیقت ہے کیا مری
آئینہ اپنی ذات کو کیسے دکھاؤں میں

سینے پہ اسکے نام کا کتبہ لکھے پھروں
آنکھوں میں انتظار کے موسم سجاؤں میں

دیکھوں نہ خود پرستوں کی دہلیز کی طرف
سر اپنا اپنی ذات کے آگے جھکاؤں میں

ڈاکٹر ولی بجنوری

نذرِ غالب

بارشِ سنگ و خشت جاری ہے
خوف دیوار و در پہ طاری ہے

زخم سینے کے کھول کر بیٹھو
''آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے''

خوش بہت ہیں تجھے بھلا کر ہم
کیا عجب سادگی ہماری ہے

اپنے بیمار کی خبر لینا
آج کی رات اُس پہ بھاری ہے

سننے والا نہیں کوئی فریاد
کس لئے پھر یہ آہ و زاری ہے

چین آتا نہیں کسی صورت
اس قدر دل کو بے قراری ہے

کیوں بتاتے نہیں ولؔی صاحب
کس کی خاطر یہ اشکباری ہے

ڈاکٹر ولی بجنوری

زخمی ساعتوں کا نہ چرچا کیا کریں
آنکھوں سے ایک دوجے کی باتیں سنا کریں

جاگی ہوئی ہو ہجر کی سفّاک رات جب
ہمراہ چاند تاروں کو لے کر اڑا کریں

یہ معجزہ بھی ہم کو محبت دکھائے اب
تحریر اس بدن کی یہ پوریں پڑھا کریں

جب لوگ اپنے اپنے جلانے لگیں دیئے
کچھ دل کے داغ ہم بھی تو روشن کیا کریں

ہم وحشیوں کو دیتا ہے صحرا یہ مشورہ
دامن کو تارتار کریں اور سیا کریں

یہ عشق روگ کیا ہے، مسیحا ہمیں بتائے
مرجائے ہے مریض اگر ہم دعا کریں

اب کس کے پاس جاؤں بجھا جارہا ہے دل
جلدی سے میرے دل کی ولؔی جی دوا کریں

ڈاکٹر ولی بجنوری

جسموں سے لپٹے ہیں سبز سنہرے سائے
اس بستی میں ایسے لوگ کہاں سے آئے

فطرت کی آوازوں سے موسیقی جاگی
پُر اسرار جزیروں نے جب ساز اٹھائے

اُس کی خاطر آگ کے دریاؤں سے گذرے
آندھی آگے ہم نے برسوں دیپ جلائے

ہم نے بھی روکر کاٹی ہیں ہنستی راتیں
اُس نے بھی تو درد کے کتنے چاند اُگائے

پوریں تجھ کو چھوکر روشن ہوجاتی ہیں
کون ہے تو، تجھ سے مل کر یہ دل گھبرائے

تعبیریں سورج کی کرنوں پر لکھتا ہے
دل دیوانہ چاندنگر میں خواب سجائے

رنگوں کو بس دور ہی سے دیکھا کرتے ہیں
اڑتی تتلی چپکے چپکے کہتی جائے

ڈاکٹر ولی بجنوری

ہمارے بہتے سفینوں کے سَر جلے ہیں ابھی
تمام تو نہیں، ہاں کچھ سفر جلے ہیں ابھی

چھتوں پہ برسے گی بارُود دیکھتے رہنا
مچا ہے شور کہ دیوار و در جلے ہیں ابھی

نگر میں آگ کا سیلاب آنے والا ہے
نکل چلو، یہاں دوچار گھر جلے ہیں ابھی

ابھی تو جسموں میں اتریں گے تیر آ آکر
اڑانیں بھرتے پرندوں کے پر جلے ہیں ابھی

یہ حکم جاری ہوا ہے سیاہ آندھی کو
دیۓ گلابوں کے دیکھے کدھر جلے ہیں ابھی

یہاں بھی بونے ہیں کچھ خاک و خون کے موسم
یہاں بھی روشنیوں کے شجر جلے ہیں ابھی

ہمیں بھی جلتے الاؤ کا سامنا ہے ولؔی
ہمارے شہر کے کچھ نام ور چلے ہیں ابھی

مسعود منور (ناروے)

عشق کیا ، عشق کا سخن کیا ہے
درمیانِ لب و دہن کیا ہے
نرگسِ ناز بر گلاب اندام
یہ ترا نین سا بدن کیا ہے
آنکھ کیا،آنکھ کا فسوں کیا ہے
رنگِ رُخسار کی پھبن کیا ہے
زلف کے خم میں کیا اشارہ ہے
ابروؤں پیچ کی شکن کیا ہے
حرف میں راز،راز میں اغماض
یہ تماشا مری سجن کیا ہے
یہ زنخداں کا سیب یہ گردن
صندلیں قوس کیا،کرن کیا ہے
کنجِ ابرو میں تل ہے یا دل ہے
اوردل میں ترے چھبن کیا ہے
آگ سی جل رہی ہے کیا من میں
سچ بتا دے کہ یہ جلن کیا ہے
اے زلیخا! مجھے خریدو گی؟
جانتی ہو زرِ ثمن کیا ہے
جانِ مسعؔود کیسے عشق کروں
کون سا مُلک ہے زمن کیا ہے

مسعود منور

بے گھروں، اُجڑے ہوؤں، بے آسروں کے درمیاں
میں بدن آباد کی تنہائیوں کا حکمراں

اگلے وقتوں کے رسولوں کی یہ تازہ اُمتیں
دوزخوں کی آگ میں جلتی سُلگتی لکڑیاں

اپنے عملوں کی سیاہی میں ہیں سب غرقِ عذاب
اپنے اپنے قید خانے ہیں یہ اینٹوں کے مکاں

کھا گئیں زر کے ذخیرے،پی گئیں بہتے بحور
یہ سیاسی مچھلی گھر کی بے مُروّت مچھلیاں

اپنی اپنی پڑ گئی سب کو مچی ہے کھلبلی
ہورہی ہے مسجدوں میں شامِ محشر کی اذاں

کھُل گئے اعمالنامے عدل کے بازار میں
بِک گئیں ایک ایک کی خاطر سزا کی روٹیاں

سارے رشتے،سارے ناتے رنجشوں میں جل گئے
کچھ نہیں باقی بچا مسعؔود بہرِ داستاں

مسعود منور

خواب دیکھا نہیں تعبیر کہاں سے آئی
یہ میرے پاؤں میں زنجیر کہاں سے آئی

کورے کاغذ پہ سیاہ حرف تھے لیکن اِن میں
یہ میرے یار کی تصویر کہاں سے آئی

سب فقیہوں نے محبّت پہ دیا ہے فتویٰ
ورنہ اِس جرم کی تعزیر کہاں سے آئی

تو نہ قاتل ہے ،نہ شاعر ہے نہ فوجی جرنیل
تیرے قبضے میں یہ شمشیر کہاں سے آئی

میں عناں گیر نہ جانے کی اُسے جلدی تھی
بول، اِس باب میں تاخیر کہاں سے آئی

آسمانوں سے تو اُتری تھی محبّت کی کتاب
اُس کی نفرت بھری تفسیر کہاں سے آئی

یار مسعودؔ ، اماوس کا لگا ہے پہرا
اِس سیاہ رات میں تنویر کہاں سے آئی

مسعود منور

وہ مفادات کو جب پاسِ وفا کہتا ہے
کچھ سمجھتا بھی ہے کم ظرف کہ کیا کہتا ہے

یہ خیالوں کا تراشا ہوا معبود اُس کا
وہ خُدا ہے ہی نہیں جس کو خُدا کہتا ہے

نظریہ اُس کا محبّت تو عمل نفرت ہے
کیسا صوفی ہے جو کینے کو صفا کہتا ہے

وہ خریدے گا زرِ زہد سے ستّر حوریں
دین میں ایسی تجارت کو روا کہتا ہے

خشمگیں چہرے پہ لٹکے ہوئے قلاش سے ہونٹ
اِس یبوست کو عبادت کا صلا کہتا ہے

جو مری گوشہ نشینی کو عداوت سمجھا
اب مرے صبر کو اک طرفہ گِلا کہتا ہے

پہلے مسعودؔ کو کہتا تھا زمیں کا غدّار
اب وہ غدار کو زندیقِ سما کہتا ہے

جدید ادب

عزیز نبیل (قطر)

لہجے میں روشنی کا سمندر لئے ہوئے
وہ آدمی تھا نور کا پیکر لئے ہوئے

جذبِ درونِ ذات کی کوشش میں بارہا
خود اپنی سمت لپکا ہوں پتّھر لئے ہوئے

میں بھی رواں ہوں جانبِ تشنہ لبانِ دشت
اپنے جلو میں سات سمندر لئے ہوئے

جب بھی فلک نے پھینکا ہے مجکو زمیں کی سمت
اترا ہوں شہرِ انجم و اختر لئے ہوئے

ہر آدمی غریقِ غمِ روزگار ہے
کاندھوں پہ اپنا اپنا مقدر لئے ہوئے

میں قافلے سے پیچھے بہت دور رہ گیا
آنکھوں میں ایک ڈوبتا منظر لئے ہوئے

عزیز نبیل

زندگی درد اضافی چاہے
مرے جینے کی تلافی چاہے

تری دیوار سے سر پھوڑ لیا
اب کوئی کتنی معافی چاہے

جسم جو ٹوٹ گیا ، ریزہ ہوا
پھر تری وعدہ خلافی چاہے

میں کہ اک کانچ کے ٹکرے جیسا
اور وہ سنگ شگافی چاہے

اور کچھ راس نہیں آتا ہے
دل وہی چشم غلافی چاہے

عزیز نبیل

وحشت کے اس شور کو مجھ میں مرجانے دے تھوڑی دیر
سوکھ گیا ہے سوچ کا دریا بھر جانے دے تھوڑی دیر

کب تک دشت نوردی یارب؟ کتنے جنگل کاٹوں گا؟
اچھا لوٹ کے آجاؤں گا گھر جانے دے تھوڑی دیر

ٹھنڈی رات اور ماہِ دسمبر، ٹوٹا پھوٹا میرا گھر
تاریکی میں چھولے آ کر ڈر جانے دے تھوڑی دیر

تیری یاد میں تارے گنتے بیت گئی ہے ساری رات
صبح ہوئی، وہ سورج نکلا مرجانے دے تھوڑی دیر

کوئی نیا اندازِ جفا اے کوچہء جاں کے باشندے
تشنہ آنکھیں جان بہ لب ہیں بھر جانے دے تھوڑی دیر

اُس کوچے سے جو بھی گذرے پاگل ہوجاتا ہے نبیل
مجکو خبر ہے ساری حقیقت، پر جانے دے تھوڑی دیر

عزیز نبیل

تمام شہر تھا جلّاد جادوگر کی طرف
میں تک رہا تھا خموشی سے شہر بھر کی طرف

ہماری دشت نوردی کا کچھ حساب ملے
یہ کیا کہ عمر کٹی اور اپنے گھر کی طرف

الجھتے زاویئے سب خطِّ مستقیم ہوئے
سبھی لکیروں کو جانا تھا مستقر کی طرف

اک اضطرابِ مسلسل ہے ہمسفر میرا
رواں ہوں دائرہ در دائرہ بھنور کی طرف

یہی تھا جرم کہ سچ بولنے لگا تھا میں
سو پتھروں کی تھی بوچھار میرے گھر کی طرف

دھواں دھواں ہے بہت روشنی کا ہر لمحہ
سلگ رہا ہے اندھیرا رخِ سحر کی طرف

حامدی کاشمیری (سری نگر)

منجمد چُپ سمندروں میں ہے
بے قراری شناوروں میں ہے

رفتگاں کا گزر ہوا شاید
شور سا سوختہ گھروں میں ہے

سو گئے پھر کبھی نہیں جاگے
سحر کیسا صنوبروں میں ہے

ریت کو خونِ دل سے سینچتے ہیں
کیسی آشفتگی سروں میں ہے

ختم کر لی لہو نے سب تفریق
ایک ہی رنگ منظروں میں ہے

بستی بستی ہے شب کا سناٹا
صبح کا شور مقبروں میں ہے

ناصر زیدی (راولپنڈی)

گرچہ اکثر فریب کھاتا ہوں
پھر بھی اُلفت کے گیت گاتا ہوں

بال بکھرا کے بیٹھ جاتی ہو!
اور میں اندر سے ٹوٹ جاتا ہوں

حُسن کی کج ادائیوں کی قسم،
عشق کے واسطے میں داتا ہوں

ورنہ میری بساط ہی کیا ہے
کچّے دھاگے کا ایک ناتا ہوں

تُم پکارو ذرا محبت سے
لو میں آیا، ابھی میں آتا ہوں

اب مجھے خود پہ اختیار نہیں
پھر تصور میں تجھ کو لاتا ہوں

شب کی تنہائیوں میں اے ناصرؔ!
خود کو پہلو میں اُس کے پاتا ہوں

سہیل احمد صدیقی (کراچی)

یخ بستہ گرد باد میں سوچا ہے بار بار
تیرے بغیر زیست بھی ممکن ہے گل عذار؟

فصل بہار روٹھ کے گزری ہے بار بار
پژمردہ ذہن ' پیاس کا صحرا ہے شہرِ یار

ابرِ کرم برس بھی چکا' پھول بھی کھلے
موتی برس چکیں تو ذرا دیکھ حسنِ یار

پیاسے کو جھیل پاس بھی آ کر نہ کچھ ملا
ساقی ترا تو خود ہی رہا محو انتظار

تیرا جمال کاسنی پھولوں میں گم ہوا
تیرا نصیب دیکھ کے رویا ہوں زار زار

احمد سہیل (امریکہ)

جلتی دوپہروں میں اک سایہ سا زیرِ غور ہے
بجھتی آنکھوں میں کوئی چہرہ سا زیرِ غور ہے

اب کے میں زندہ رہوں یا پھر سے مرجاؤں سہیلؔ
فیصلہ سب ہو چکا،تھوڑا سا زیرِ غور ہے

اتنی ویرانی میں روشن ہو ترے تصویر کب
اس سلگتے جسم میں شعلہ سا زیرِ غور ہے

جسم کے آئینے میں شعلہ سا رکھا ہے سوال
پاؤں کی زنجیر کو حلقہ سا زیرِ غور ہے

نیند اڑتی ہی رہی خوابوں کے جنگل میں سدا
آسماں پر چاند کا خاکہ سا زیرِ غور ہے

گر گئی تاریخ میرے ہاتھ سے احمد سہیلؔ
اک نئے انسان کا خاکہ سا زیرِ غور ہے

فیصل فارانی (ٹورونٹو)

سوچا ہے اپنے آپ کو اب کھوجنا بھی ہے
اپنا ہی راز خود پہ مجھے کھولنا بھی ہے

گویا یہ قفلِ آگہی اب توڑنا بھی ہے
یوں بے خودی کے در کو مجھے کھولنا بھی ہے

اِس آتشِ معاش کا اب سامنا ہے یوں
خود کو بچا کے رکھنا ہے اور جھونکنا بھی ہے

اک حرفِ معتبر کے ترازو میں ایک دن
ردّی کا اپنا ڈھیر مجھے تولنا بھی ہے

سازِ خیالِ یار کو اب چھیڑ کر مجھے
تنہائیوں میں وصل کا سُر گھولنا بھی ہے

یہ جانتا ہوں اِس کی پہونچ بھی نہیں وہاں
پھر بھی ہوا سے کچھ تو مجھے بولنا بھی ہے

اکثر تو بند رہنا ہے اپنے مکان میں
خود کو کسی گلی میں مگر رولنا بھی ہے

رکھنا ہے اپنے آپ کو فیصلؔ سنبھال کر
لیکن کہیں کہیں پہ مجھے ڈولنا بھی ہے

احسان سہگل (ہالینڈ)

ہر وصل کی شب ایک کہانی مانگے
دل پھر سے وہی اپنی جوانی مانگے

ہم بھی صفِ مرداں میں کبھی شامل تھے
ہم سے کوئی تصویر پرانی مانگے

تصویر ہو رومال ہو یا کچھ اور چیز
وہ پیار کی بس ایک نشانی مانگے

تحریر نہیں ہے تو یقیں کیسے ہو
وہ قرضِ وفا ہم سے زبانی مانگے

احساس نہیں اُس کو ذرا بھی سہگلؔ
ہر بات میں وہ شخص روانی مانگے

نوٹ از شاعر: بحر ہزج مثمن
مفعول مفاعیل مفاعیلن فع
اخرب مکفوف سالم ابتر

کلیم احسان بٹ (گجرات)

دل کے ٹوٹ جانے کا سانحہ نکل آیا
ہاتھ کی لکیروں سے زائچہ نکل آیا

وہ جہاں بسایا تھا شوق خود نمائی نے
آئینے کے پیچھے بھی آئینہ نکل آیا

کس نے ذکر چھیڑا تھا اس کی سردمہری کا
باد و برف زاروں کا سلسلہ نکل آیا

دائرے کے باہر بھی دائرے ہی لگتے ہیں
دائرے کے اندر بھی دائرہ نکل آیا

پھر مرے خیالوں میں پھوٹنے لگی سرسوں
پھر جنون و وحشت کا مسئلہ نکل آیا

اس کی جھوٹی باتوں پر میں یقین کیوں کرلوں؟
پھن اٹھائے بل سے پھر وسوسہ نکل آیا

میں ابھی سفر کی دھول گھر کو لے کے لوٹا تھا
پھر نئی مسافت کا راستہ نکل آیا

کلیم احسان بٹ (گجرات)

شکار و ناوک و دانہ و دام ہوتے ہیں
چمن میں پھر سے وہی اہتمام ہوتے ہیں

قدم قدم پہ ہمیں روک لیتے ہیں جلوے
ہم ایسے لوگ کہاں تیز گام ہوتے ہیں

زباں پہ ہوتی ہیں اکثر حلال کی باتیں
اگرچہ ہاتھ میں لقمے حرام ہوتے ہیں

تمھارا عشق بھی اپنی جگہ سلامت ہے
جو زندگی میں مگر اور کام ہوتے ہیں

گلی میں گاؤں کے بچے یہ کہہ رہے تھے کلیم
سنا ہے شہر میں دیدار عام ہوتے ہیں

عارف فرہاد (راولپنڈی)

ہجر کی تنہائیوں میں بال بکھرائے ہوئے
آج پھر اے یار تم اِس دل میں ہو آئے ہوئے

آج پھر اُن خیال اِس دل میں گھر کرنے لگا
آج پھر ہم لوٹ آئے گھر کو گھبرائے ہوئے

کیا جوانی کی مہک ہو، کیا دھنک سے رنگ ہوں
ہم تو ایسے پھول ہیں جو تھے ہی مرجھائے ہوئے

کب نہ ڈوبا کوئی سورج زندگی کی شام پر
کب نہ دنیا میں اے تیرہ شب! ترے سائے ہوئے

خاک ہو جانے کو ہے، ہاں راکھ ہو جانے کو ہے
پھر بھی تُو چلتا ہے اِس مٹّی پہ اترائے ہوئے

زندگی فرہاؔد شاید کوئی ایسا شہر ہے
جس کے لوگوں پر سدا افلاس کے سائے ہوئے

عارف فرہاد

یقیں نے ایسے سجائے تھے دھیان کے پردے
اُتر گئے مرے وہم و گمان کے پردے

تجھے نہ سوچیں تو پھر کیسے اور کو سوچیں
کھچے ہیں ذہن پہ تیرے ہی دھیان کے پردے

یہ آنکھ ہونے لگی ہے ابھی سے کیوں خیرہ
ابھی تو دیکھے ہیں تیرے مکان کے پردے

کس انکسار سے یہ دل خریدنا چاہے
دکاندار کی دولت، دکان کے پردے

عجیب ڈھنگ سے قصرِ فلک میں کھینچے ہیں
خدا نے میرے لئے اِس جہان کے پردے

ہماری چشم ابھی چاک پر سنورنے دے
اے سیم تن مت اُٹھا اِس جہان کے پردے

عطا ہوئی مجھے بینائی بھی مگر اس پر
خود اُس نے تان دیئے آسمان کے پردے

ہمیں یہ غم ہے کہ فرہاؔد عمر بیت چلی
مگر نہ کھل سکے ہم پر جہان کے پردے

حفیظ شاہد (خان پور)

جانے کیا اُس نے مری خاکِ بدن میں رکھا
بے وطن جس نے مجھے اپنے وطن میں رکھا
جانے کیوں فصلِ بہاراں نے صبا کے ہاتھوں
گُل کی خوشبو کو پریشان چمن میں رکھا
مہرباں ہم پہ رہی گردشِ دوراں کیا کیا
ہم کو صحرا میں ،اسے سرووسمن میں رکھا
صرف پھولوں کو نہیں ریشمی پیکر بخشے
اس نے کانٹوں کو بھی خوشحال چمن میں رکھا
ہم نے دنیا کی روایاتِ کہن سے ہٹ کر
اک نیا رنگ یہاں اپنے چلن میں رکھا
وادیء عشق ومحبت سے نکلتے کیسے
اس نے ہر آن ہمیں اپنی لگن میں رکھا
کیا انوکھا یہ محبت کا سفر تھا جس نے
ہر مسافر کو مسافت کی تھکن میں رکھا
ہم نے حالات کی تلخی کو چھپا کر شاہدؔ
خود کو اوروں سے جدا شہرِ سخن میں رکھا

سعید شبابؔ (خان پور)

مانا کہ کوئی حال مرا پوچھتا نہیں
پھر بھی میں اس جہان میں بے آسرا نہیں
کس حال میں ہیں اور کہاں ہیں وہ ان دنوں
مدت ہوئی ہے اُن سے کوئی رابطہ نہیں
ہر چند ہیں سخی وہ ہمارے لیے مگر
کشکول آرزو کا ابھی تک بھرا نہیں
رہنا تم احتیاط سے، شہروں کی بھیڑ میں
ہوجائیں گُم تو کوئی یہاں ڈھونڈتا نہیں
ہر چند آندھیوں سے رہا سابقہ بہت
پھر بھی مرا چراغِ تمنا بُجھا نہیں
جس کی طلب نہ تھی وہ عطا اس نے کر دیا
ہم چاہتے تھے جو ہمیں حاصل ہوا نہیں
ہم لوگ ناسپاس مگر انتہا کے ہیں
اس کی عنایتوں کی کوئی انتہا نہیں
ہر شخص محترم ہے ہماری نگاہ میں
نَے دشمنی کسی سے، کسی سے گلہ نہیں
سیکھا ہے زندگی میں یہی ہم نے اک سبق
ہم ہیں برے شبابؔ زمانہ برا نہیں

ناصر نظامی (ہالینڈ)

ہم سے اب چہرہ تمہارا نہیں دیکھا جاتا
جلتے سورج کو دوبارہ نہیں دیکھا جاتا

دل کی بینائی بھی درکار ہے جلوے کے لئے
خالی آنکھوں سے نظارہ نہیں دیکھا جاتا

چاند بن کر جو لٹاتا رہا کرنیں اپنی
بنتا،اُس چاند کو تارا، نہیں دیکھا جاتا

عشق کی جنگ میں کب سُود و زیاں چلتا ہے
اس میں تُو جیتا،میں ہارا،۔نہیں دیکھا جاتا

جس کی تاروں کی ہر اک چال پہ ہے گہری نظر
اُس سے کیوں میرا ستارا نہیں دیکھا جاتا

ناصر نظامی

دل کو بڑا ہی شوق تھا اونچی اڑان کا
دھرتی کا ہی رہا ہوں نہ اب آسمان کا

آگے خلا کی تیرگی،پیچھے انا کی موت
اب راستہ نہیں ہے کوئی درمیان کا

اپنی جڑوں کو اپنے ہی ہاتھوں سے کاٹ کر
نقصان کر رہا ہے وہ اپنی ہی جان کا

دل میں عناد اور لبوں پر ہنسی لئے
وہ شخص دل کا کھوٹا ہے ،میٹھا زبان کا

کس روز اپنے شہر کو آؤگے لَوٹ کر
ناصرؔ میں منتظر ہوں تمہارے بیان کا

انور مینائی (کولار)

جانے کس کا سایا ہے
آئینہ دھندلایا ہے

سب کچھ فانی ہے تو سوچ
کیا کھویا ،کیا پایا ہے

گاؤں کی جنت کہہ اس کو
بر گد کی جو چھایا ہے

منظر کیا ،پس منظر کیا
جیون جب اک مایا ہے

اب کے تو ساون نے بھی
للچایا ، ترسایا ہے

تجھ کو بھلانے کی خاطر
کس کس کو اپنایا ہے

روح سسکتی ہے جس میں
ایسی میری کایا ہے

انور مینائی

ہزاروں کی جھوٹی ستائش ملی
مجھے اپنی شہرت سے کاہش ملی

دشائیں بھیانک نظر آئیں جب
مجھے عین جنگل میں بارش ملی

یہ کیسی نوازش ہے لمحات کی
مجھے خود پہ مرنے کی خواہش ملی

ترے گیان سے اور تری ذات سے
مِری روح کو ایک تابش ملی

عجب رابطہ تھا یہ تم سے مِرا
نہ راحت ملی اور نہ رنجش ملی

بڑے سخت پہرے تھے جذبات پر
رواجوں کی ہر سمت بندش ملی

مخالف ہے کیا میرا شہرِ سخن
ہر اک ذہن میں تازہ سازش ملی

راحت حسن (علی گڑھ)

شکستہ پا ہوں کہ برہم شعور ہے میرا
زمین گول ہے،یہ بھی قصور ہے میرا

کسے گرفت میں لیتا ہے آئنہ یارب!
صفات ہوں نہ ہوں،چہرہ ضرور ہے میرا

قدم قدم پہ ہزاروں گلاب کھلتے ہیں
وہ مہرباں ہے کہ یہ بھی سرور ہے میرا

یہی دیارِ دل و جاں ہے سلطنت میری
اسی محل میں کہیں کوہِ نُور ہے میرا

وہ کشتیوں کو جلانے کی بات کرتے ہیں
میں سوچتا ہوں کہ گھر کتنی دور ہے میرا

دعا کو ہاتھ اٹھاؤں تو کس طرح راحتؔ
ہزیمتوں سے بدن چور چور ہے میرا

شارق عدیل (مارہرہ)

جن خوابوں کو دیکھا ہے،دے ان کو جِلا آکر
کچھ ریت گھروندے ہی ساحل پہ بنا آکر

اک حرب کا میداں سی دنیا نظر آتی ہے
پھر ذہن میں گونج اٹھی یہ کس کی صدا آکر

یہ تیرے تجسس کا بے سمت سفر کب تک
ہوں کونسی منزل میں، احساس دلا آکر

گزرے ہوئے وقتوں پر کچھ تبصرہ ہی کر لیں
اے ہمدمِ دیرینہ اک روز نہ جا، آکر

پرھت پہ لکیروں سا کندہ ہوں میں ذہنوں پر
جرأت ہے اگر تجھ میں اب مجھ کو مٹا آکر

جب قہر چراغوں کو بے نور نہ کر پایا
شرمندہ ہوئی شارقؔ خود تیز ہوا آکر

نسرین نقاش (سری نگر)

عظمت وہ زندگی کی بڑھاتے ہوئے مَرے
جو دوسروں کا بوجھ اٹھاتے ہوئے مَرے

کانٹوں کا زہر پھیل گیا جسم میں تو کیا
خوش ہیں لہو گلوں کو پلاتے ہوئے مَرے

پتھر تو موم ہو نہ سکے، جان بھی گئی
ہم قاتلوں کے ناز اٹھاتے ہوئے مَرے

واپس ہوئے نہ دوریٔ منزل سے ڈر کے ہم
منزل کے پاس،راہ میں جاتے ہوئے مَرے

ہم آگ میں جلے تو جلے وہ بھی دوستو
وہ گھر ہمارے آگ لگاتے ہوئے مَرے

کچھ لوگ زندگی کو سدا کوستے رہے
ہم زندگی گلے سے لگاتے ہوئے مَرے

اپنا مکاں جلا تو جلا،آہ تک نہ کی
ہم دوسروں کی آگ بجھاتے ہوئے مَرے

نسریںؔ وجہِ موت بنا اس کا سامنا
دیکھا اُسے تو ہوش گنواتے ہوئے مَرے

نسرین نقاش (سری نگر)

رُوٹھے ہوئے کو یوں بھی منانا پڑا مجھے
دل چیر کے کسی کو دکھانا پڑا مجھے

سینے میں جیسے دل کی خوشی آگ بن گئی
بارش میں آنسوؤں کے نہانا پڑا مجھے

صد شکر! اس کے غم سے میں پتھر کی ہو گئی
رونا پڑا مجھے، نہ رُلانا پڑا مجھے

بربادیاں کچھ ایسی ہوئیں مجھ پہ مہرباں
بربادیوں کا جشن منانا پڑا مجھے

طوفانِ غم کا جب مِرے سر سے گزر گیا
رو رو کے ،دل کے ساز پہ گانا پڑا مجھے

وہ تھا انا پرست کہ ضد پر اڑا رہا
میں منکسر تھی ،سر کو جھکانا پڑا مجھے

پوچھا جو اس نے کس کے لئے ہو اداس تم
شیشے میں اس کا چہرہ دکھانا پڑا مجھے

نسریںؔ جب وہ زعم میں فرعون ہو گیا
اوقات اس کی کیا ہے بتانا پڑا مجھے

مرتضیٰ اشعر (ملتان)

کچھ اِس لئے بھی چاہیے سورج کی ضو مجھے
ملتے ہیں ہجر ، وصل کے زینے پہ سو مجھے

خاشاک کی طرح سے تھا میں تیرے ہاتھ میں
چاہا جدھر بھی لے گئی سو تیری رو مجھے

گندم کے کھیت پر تو وڈیرے کی آنکھ ہے
بونی پڑے گی صحن میں اِس بار جو مجھے

اِس شہر کی فصیل پہ شب ہے گڑی ہوئی
اِس تار میں تلاشنی ہے کوئی پو مجھے

چوپال کے الاؤ کی مانند مرتضیٰ
سُلگا رہی ہے ایک حکایت کی لو مجھے

مرتضیٰ اشعر

کسی نے پیڑ ہی کچھ اس طرح اُگائے تھے
وہاں پہ دھوپ دھری ہے جہاں پہ سائے تھے

پھر اُسکے بعد ندی میں اُتر گیا تھا چاند
بس ایک بار ستارے سے جھلملائے تھے

نجانے گھاس کناروں کی کیوں نہیں چمکی
دیئے جلا کے تو ہم نے بہت بہائے تھے

لہولہان ہیں جن سے تمام شہر کے لوگ
کوئی بتائے یہ پتھر کہاں سے آئے تھے

ہوا نے چھین لئے اور اُڑا دیئے اشعرؔ
کہ ہم نے آنکھ سے جو نقشِ پا اُٹھائے تھے

ناہید ورک (امریکہ)

بکھرتے ہی گئے سب خواہشوں کے ساز، کیا کرتے
تری لَے اور تھی کچھ اور تھی آواز، کیا کرتے

کمالِ ضبط پر میرے بھلا وہ ناز کیا کرتے
ستانے آئے تھے مجھ کو وہ چارہ ساز، کیا کرتے

جنھوں نے چادروں کو پھاڑ کر سینے چُھپائے ہوں
وہ اپنی مُفلسی میں اور پس انداز کیا کرتے

ہماری خوشبوؤں کی جب دھنک بھی قید کر ڈالی
تو مجبوراً ہمیں کرنی پڑی پرواز، کیا کرتے

ضرورت تھی جنھیں تیری وفاؤں کے گھروندے کی
ترے وعدوں کی خالی سیپیوں پر ناز کیا کرتے

گئے تھے اُس کے در پر مُدّعا اپنا بیاں کرنے
''جفا کاری سے پیش آیا وہ حیلہ ساز کیا کرتے''

ہمارے غم کہاں ناہیدؔ دنیا پر عیاں ہوتے
مگر آنکھوں نے دل کے کہہ دیے سب راز، کیا کرتے؟

ایوب راز (کویت)

کبھی نہ اس سے کہو کچھ ہوا کے لہجے میں
جو روز ملتا ہے تم سے دعا کے لہجے میں

چمن میں رونقِ فصلِ بہار ہے پھر بھی
غضب کا درد ہے اب کے صبا کے لہجے میں

میں زخم زخم ہوں مجھ کو بچائیے ورنہ
بلا کا زہر بھرا ہے دوا کے لہجے میں

زمیں پہ اب بھی وہ احسان کر رہی ہے مگر
عجیب طنز ہے اب کے گھٹا کے لہجے میں

کبھی کبھی ہی سہی رازؔ دل کی بستی میں
اتر کے بات کرو تم وفا کے لہجے میں

سلیم اختر فاروقی (کیرانہ)

سمجھ رہا ہے یہ ساقی قضا سے ٹوٹ گئے
مگر وہ جام ہماری اَنا سے ٹوٹ گئے

قدم بڑھائیں تو کیسے بڑھائیں منزل تک
ہمارے پاؤں تو دشتِ جفا سے ٹوٹ گئے

جو پھول صحنِ گلستاں میں مسکرائے تھے
وہ پھول تیری انوکھی ادا سے ٹوٹ گئے

ملال بچوں کے چہروں سے یوں نمایاں ہے
کھلونے ان کی ذرا سی خطا سے ٹوٹ گئے

وہ جسے گہرا تعلق تھا اِک زمانے سے
ہم ان کے آج خلوص و وفا سے ٹوٹ گئے

کسی بھی دھارے نے شکوہ نہیں کیا کوئی
بہت سی موجوں کے دل ناخدا سے ٹوٹ گئے

رسولِ پاک نے مانگی خدا سے جو اخترؔ
غرور جن کو تھا وہ اس دُعا سے ٹوٹ گئے

سیما عابدی (امریکہ)

الٹے سیدھے خواب ستانے لگتے ہیں
اور آنکھوں کی نیند اڑانے لگتے ہیں

شہر کے ہنگامے کرتے ہیں خوفزدہ
شہر کے سناٹے بھی ڈرانے لگتے ہیں

صورتِ حال ہراساں کرنے لگتی ہے
اپنے آپ سے ہی گھبرانے لگتے ہیں

روشنیاں نہ کم ہوں کبھی،بس اس ڈر سے
دھیرے دھیرے خود کو جلانے لگتے ہیں

اس کو واپس آنا ہے پر دیکھتے ہیں
کتنے مہینے، سال، زمانے لگتے ہیں

گھر کی فضا پژمردہ کہیں نہ ہوجائے
اپنا دکھ اپنے سے چھپانے لگتے ہیں

خوشیوں کا احساس فزوں تر ہوتا ہے
سیماؔ جب اس بزم میں جانے لگتے ہیں

نذر خلیق (خانپور)

پھولوں کی طرح تجھ کو سنبھالے نہیں ہوتے
گر دل سے تجھے چاہنے والے نہیں ہوتے

نرگس کی جو مہکار نہ ہوتی مِرے دل میں
گھر میں مِرے خوشبو کے حوالے نہیں ہوتے

اک شوخ کا اعجاز یا جادو تھا وگرنہ
یوں عشق کبھی ہم سے نرالے نہیں ہوتے

خوشیوں سے نہ بھر دیتا وہ دامن جو ہمارا
غم دل سے کبھی ہم نے نکالے نہیں ہوتے

وہ چاند اگر آکے نہ آنگن میں اترتا
گھر میں مِرے اس طرح اجالے نہیں ہوتے

حیدر قریشی (جرمنی)

آنکھ سے گر کر ٹوٹے خواب کھلونے ہیں
اور اب دل کے ، بچوں جیسے رونے ہیں
عمرِ لا حاصل کا جو حاصل ٹھہرے
کس نے ایسے داغِ ملامت دھونے ہیں
درد ہمارے تو انمول نکل آئے
گرچہ خرید ے ہم نے اونے پونے ہیں
صرف گناہوں کا ہی بوجھ نہیں سر پر
اپنے نیک اعمال بھی ہم کو ڈھونے ہیں
رادھےؔ،میٹھے رادھے! کچھ پہچان ذرا
دیکھ ہمیں ہم تیرے شام سلونے ہیں
زخموں کی خیرات بھی کب مل پائے گی
حُسن سے کچھ احسان ہی ایسے ہونے ہیں
راس زمینِ دل کو غم ایسے آئے
غم کی فصلیں کاٹ کے،پھر غم بونے ہیں
یادوں کے پھولوں سے،اپنی پلکوں نے
اُس کی جیت پہ حیدرؔ ہار پرونے ہیں
عشق میں حیدرؔ باون سال کا ہو کے بھی
بیس برس کی عمر کے رونے دھونے ہیں

ڈاکٹر رشید امجد (اسلام آباد)

گملے میں اُگا ہوا شہر — ۲

جنازہ ایک بار پھر گم ہو گیا تھا‘

برسوں پہلے بھی یُوں ہی ہوا تھا کہ جب اُسے سولی سے اتار کر چار پائی پر ڈالا گیا اور ہجوم قبرستان کی طرف روانہ ہوا تو درمیان میں کہیں جنازہ گم ہو گیا‘ لوگ اُس کی تلاش میں سڑکوں اور گلیوں میں پھیل گئے اور جب جنازہ نہ ملا تو ایک دوسرے سے الجھ پڑے‘ جنازہ اب پھر گم ہو گیا تھا لیکن اِس بار صورتِ حال کچھ مختلف تھی۔ دیکھنے میں وہ اگرچہ ٹھیک ٹھاک تھا لیکن اندر ہی اندر کوئی شے اُسے کھوکھلا کیے جا رہی تھی‘ لوگ اُس کی صحت کی باتیں بھی کرتے تھے اور اُس کی موت کے منتظر بھی تھے چنانچہ جب اُسکی موت کا اعلان ہوا تو لوگوں کو کچھ زیادہ تعجب نہ ہوا۔

جنازہ اُٹھنے کے وقت کے آگے پیچھے جمع ہونا شروع ہو گئے۔ ٹولیوں اور گروہوں کی شکل میں گلیوں اور سڑکوں میں پھیلے لوگ اُسی کی باتیں کر رہے تھے‘ اُس کی اچھائیاں اور بُرائیاں‘ دفعتاً کسی کو احساس ہوا کہ بہت دیر ہو گئی ہے اور جنازہ ابھی نہیں اُٹھا‘ ایک نے دوسرے سے اور دوسرے نے تیسرے سے پُوچھا: کسی نے کہا جنازہ تو اُٹھ چکا اور اب قریبی مسجد میں نماز کی ادائیگی ہو رہی ہے یا ہونے والی ہے۔ لوگ مسجد کی طرف چل پڑے‘ مسجدیں تو کئی تھیں، کسی نے پُوچھا---- اُس کا عقیدہ کیا تھا؟ جنازہ کس مسجد میں گیا ہے؟ اُس کا عقیدہ کیا تھا‘ یہ سوال ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے اور چوتھے تک پہنچا‘ معلوم نہیں‘ ایک نے دوسرے سے اور دوسرے نے تیسرے سے کیا کہا۔ اب انہوں نے ایک ایک مسجد دیکھنا شروع کی‘ ہر مسجد کے دروازے پر کسی نہ کسی مسلک کی تختی لگی ہوئی تھی اور جنازہ وہاں موجود نہیں تھا۔

ایک بے یقینی کی فضا پر پھیلائے چاروں طرف منڈلا رہی تھی‘ ایک نے دوسرے سے پوچھا--- ’’کچھ معلوم ہے؟‘‘

دوسرے نے نفی میں سر ہلایا----- ’’کچھ نہیں‘‘

کسی نے کسی سے سوال کیا----- ’’کچھ پتہ ہے؟‘‘

’’نہیں‘‘ اُس نے تیسرے کی طرف دیکھا‘ تیسرے نے منہ دوسری طرف کر لیا‘

تلاش اور لاتعلقی ساتھ ساتھ چل رہے تھے‘ قدم سے قدم ملائے‘

’’ہوا کیا؟‘‘

’’کچھ معلوم نہیں‘‘

’’تو پھر-----------‘‘

چُپ پتھرائے چہرے‘ خاموش سوال کرتی آنکھیں!

’’خیریت----------؟‘‘

’’نہیں‘ خیریت تو نہیں‘‘

’’تو پھر---------‘‘

’’کچھ معلوم نہیں‘‘

رینگتی سرگوشیاں گھٹنوں کے بل اُٹھیں اور دبے پاؤں چاروں طرف پھیل گئیں‘ دبی دبی رونے کی آوازیں آہستہ آہستہ بین میں اور پھر کہرام کی صورت نمایاں ہونے لگیں‘ کئیوں کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کیوں رو رہے ہیں لیکن رو سب رہے تھے اور آہیں بھی بھر رہے تھے‘

’’ہوا کیا ہے؟‘‘ کسی نے کسی سے پوچھا

’’معلوم نہیں‘‘

’’تو پھر----------‘‘ لیکن رونے کا سبب پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی‘ بَین کی آوازوں نے ایک ایسا دائرہ بنا لیا تھا جس نے پورے ماحول کو اپنی بُکل میں دبا لیا تھا کچھ دیر بعد رونے کی شدت میں ذرا سی کمی ہوئی تو ایک نے دوسرے سے پوچھا----- ’’مرنے والا کون تھا؟‘‘

’’تمہیں نہیں معلوم‘‘ اُس نے غصہ سے اُسے گھورا----- اور پھر اُسے خیال آیا------- ’’واقعی مرنے والا کون تھا؟‘‘

’’مجھے تو نہیں معلوم‘‘ اُس نے دھیمی آواز سے کہا اور آگے والے سے پوچھا---- ’’مرنے والا کون تھا؟‘‘

’’تم نہیں جانتے‘‘ اُس نے بھی غصہ سے گھورا‘ لیکن لمحہ بعد ہی وہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔

’’مرنے والے کے ساتھ میرا کیا رشتہ ہے؟‘‘ پہلے والے نے سوچا‘ اُسے کچھ یاد نہ آیا‘ اُس نے ساتھ والے سے پوچھا ’’مرنے والے سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟‘‘

’’میرا-----------‘‘ ساتھ والے نے جواب کے لیے منہ کھولا‘ لیکن خود ہی چُپ ہو گیا اور سوچنے لگا کہ مرنے والے سے اُسکا کیا رشتہ ہے‘ سوال ایک سے دوسرے تک‘ دوسرے سے تیسرے، چوتھے سے ہوتا ہوا سڑکوں اور گلیوں میں پھیل گیا‘ روتے‘ بین کرتے لوگوں نے ایک لمحہ کے لیے سوچا‘ جواب نہ ملا تو پل بھر کے لیے چُپ ہوئے اور پھر رونا شروع کر دیا۔

’’تو تم اُسے جانتے تھے؟‘‘ کسی نے کسی سے کہا.

''جانتا تو تھا لیکن''

''لیکن کیا؟''

''جانتا تو تھا لیکن پھر بھی ہر بار''

''کیا ہر بار''

ہر بار وہ مجھے اپنی دلفریب باتوں میں الجھا لیتا تھا''

''تو وہ تمہارا ساتھی نہیں تھا''

''تھا یا شاید نہیں تھا'' جواب دینے والے نے بے یقینی سے کہا، بہت دیر چُپ رہا پھر بولا---------- ''شاید وہ میں ہی تھا''

''شاید میں بھی تھا'' دوسرے نے سوچتے ہوئے کہا'

ہجوم گلیوں اور سڑکوں پر بکھرا ہوا تھا اور جنازے کی تلاش جاری تھی' ایک ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا جا رہا تھا'

''یہاں تو نہیں؟''

''نہیں یہاں بھی نہیں''

گھر تو سارے ایک جیسے تھے' گلیاں اور سڑکیں بھی ایک سی تھیں' تو پھر اُسے کہاں ڈھونڈا جائے'

''اور ہم میں سے ہر کوئی بھی تو اُسی جیسا ہے''

''تو------------''

ایک کو لگا اُس کا دم گھُٹ رہا ہے' دوسرے کو بھی یہی احساس ہوا'

''ہم سبھی تو کہیں نہیں مر رہے؟''

''اور ہمارے جنازے------------؟''

شہر کا شہر ہی ایک جنازہ تھا اور کہیں گم ہو گیا تھا۔

''شہر بھی کہیں گم ہوتے ہیں؟''

''کبھی کبھی ہو بھی جاتے ہیں''

''روشن دان اور دریچے بند ہو جائیں تو اندھیرا ہو جاتا ہے''

''اور اندھیرے میں چیزیں گم ہو جاتی ہیں''

اُنہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی۔ کچھ نظر آیا، کچھ نظر نہ آیا' بس یہ لگا ایک بے قابو ہجوم ہے جو ہاتھ پیر مار رہا ہے' افسوس کے نعرے لگا رہا ہے اور پھولی سانسوں کے ساتھ سڑکوں اور گلیوں میں کچھ تلاش کر رہا ہے۔

''ہم کسے تلاش کر رہے ہیں؟'' ایک نے دوسرے سے پوچھا ''تمہیں نہیں معلوم'' دوسرے نے قدرے تلخی سے کہا

''نہیں مجھے نہیں معلوم' اِسی لیے تو تم سے پوچھ رہا ہوں''

''ہم------'' دوسرے نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا' لیکن لفظ نامکمل رہ گئے---------- ''ہم کسے تلاش کر رہے ہیں'' اُس نے خود سے سوال کیا مگر اُسے اپنے سوال کا کوئی جواب نہ ملا' اُس نے کن انکھیوں سے پہلے کی طرف دیکھا اور خاموشی سے سر جھکا لیا۔ سوال کرنے والا کچھ دیر تو چُپ رہا' پھر اُس نے یہی سوال کسی اور سے کیا ' لیکن وہ بھی کوئی جواب نہ دے سکا' اُلٹا سوچ میں پڑ گیا کہ وہ کسے تلاش کر رہے ہیں۔

''اب تو یاد بھی نہیں رہا'' ایک نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا ''ہم نکلے کب تھے اور کس لیے' تمہیں کچھ پتہ ہے؟'' اُس نے ساتھ والے سے پُوچھا۔ اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

''شاید اُسی کو پتہ تھا جس کا جنازہ وہ ڈھونڈ رہے ہیں''

''تو سارا اتہ پتہ وہ اپنے ساتھ ہی لے گیا'' ایک نے دوسرے سے کہا

''اور خود بھی گم ہو گیا'' دوسرا ہنسا

''تم ہنسے کیوں'' پہلے نے دوسرے کو گھورا۔

''ہنسی آئی، ہنس پڑا'' دوسرے نے اُسے گھورا ''تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے''

''میں''

''ہاں تم''

میں تم-------- تم میں--------- دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے' سارا ہجوم ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گیا۔ سڑکوں' گلیوں اور گھروں میں سب ایک دوسرے سے اُلجھ پڑے۔ جو جس کے ہاتھ میں آیا' اُٹھا کر' دوسرے کو مارنے دوڑ پڑا۔ چیخیں'------------ سسکیاں' آہیں' کسی کو کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کسی کو کسی کی بات سمجھ نہیں آ رہی تھی' ایک ہنگامہ تھا کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ شہر کا شہر میدانِ جنگ بن گیا تھا' شہر سے باہر قبرستان میں گورکن تازہ کھدی ہوئی قبر کے کنارے بیٹھا بار بار شہر سے آنے والے راستے کو دیکھے جا رہا تھا قبر کھدے دیر ہو چکی تھی اور قبر ایک بار کھد جائے تو کسی نہ کسی کو اِس میں دفن ہونا ہی ہوتا ہے۔

شہر میں ہنگامے اب اپنے عروج کو پہنچ چکے تھے۔ سڑک کے کنارے پڑا جنازہ کسی کو دکھائی نہیں دے رہا تھا اور نہ اُس میں سے اُٹھنے والی بُو کسی کو محسوس ہو رہی تھی!

☆☆☆

نوٹ از ایڈیٹر: اس سلسلے کی پہلی کہانی ۱۹۸۰ء میں لکھی گئی تھی اور **جدید ادب** کے شمارہ فروری ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اب بھی یہ کہانی ''جدید ادب'' میں ہی سب سے پہلے شائع ہو رہی ہے۔

سلطان جمیل نسیم (کراچی)

بے چارہ بے کار

فہیم اس طرح بھیڑ میں گھر گیا تھا کہ ایک قدم آگے بڑھانا دوبھر ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے دو قدم آگے بڑھتا تو چار قدم پیچھے دھکیل دیا جاتا تھا۔

''میں کس مصیبت میں آن پھنسا۔۔۔؟''

اس ہجوم کے نرغے سے نکلنے کے لیے راہ ملنا تو درکنار اُس کو سوچنے تک کی مہلت نہیں مل رہی تھی بلکہ کبھی کبھی تو وہ لوگوں کے بیچ اس طرح بھنچ جاتا کہ سانس لینی مشکل معلوم ہونے لگتی۔۔۔۔۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی تیز رَو دریا کے بہاؤ کے خلاف تیر رہا ہے۔ اب اسے صرف اتنا یاد ہے کہ سویرے جاگا تو آسمان پر سورج گہرے بادلوں کی چادر میں لپٹا ہوا تھا تب اس نے سوچا کتنے عرصے بعد گھنگھور گھٹا دیکھی ہے، خدا کرے آج مینہ برسے۔۔ ۔۔۔ گرمی اور حبس کے دائرے سے لوگ نکلیں۔ فہیم نے چائے کی کیتلی چولہے پر رکھی۔۔ شیو کیا ۔۔ نہایا پھر چائے کی پیالی اور کتاب لے کے بالکنی میں آیا تو پلکیں چکا چوند سے جھپک گئیں۔۔۔۔ سورج چمک رہا تھا اور بلڈنگ سے ذرا فاصلے پر جو شاہراہ تھی وہاں آدمیوں کا سیلاب اُمڈ آیا تھا اور سب ایک ہی رُخ بہے جا رہے تھے۔۔۔۔۔۔ غیر متوقع ہجوم دیکھ کر بادلوں کا خیال ہوا ہو گیا۔۔۔ فہیم حیرت واستعجاب میں نہا گیا۔۔۔۔ یہ لوگ ایک ہی جانب رواں دواں کیوں ہیں۔؟

وہ کبھی کبھار ہی بالکنی میں آ کے کھڑا ہوتا تھا۔۔ آس پاس کے گھروں سے نظریں سمیٹ کر سڑک پر لوگوں کو آتے جاتے دیکھتا رہتا۔۔۔ راستہ اتنا صاف ہوتا تھا کہ ٹیکسی اور کار چلانے والوں کو ہارن بجانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، زن سے نکل جاتی تھیں۔۔۔ رکشا، ٹرک، گھوڑا گاڑی یا باربرداری کے لیے چلنے والی دوسری گاڑیوں کے واسطے ایک اور متوازی راستہ تھا جو ذرا لمبا بھی تھا اور میونسپلٹی والوں کی بے توجہی کا شکار بھی۔۔۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب لوگ کہاں بھاگے جا رہے ہیں۔۔۔ کل تک سب ٹھیک ٹھاک تھا ایک دم شہر پہ کیا افتاد پڑی کہ سب ایک طرف منہ اُٹھا کے بھاگ کھڑے ہوئے۔۔۔۔۔ یقیناً کوئی خاص بات ہے۔ کوئی اہم واقع رونما ہوا ہے۔ کیا 9/11 (نائن الیون) کی طرح ہمارے شہر کی بھی کوئی عمارت ڈھے گئی؟ معلوم کرنا چاہئے کہ سبب کیا ہے۔۔ رات بھر میں شہر پہ کس آسیب کا سایا پڑا ہے کون سی بلا نازل ہوئی ہے۔ کیا عراق کی طرح امریکا نے میرے

ملک پر بھی حملہ کر دیا ہے؟ اسی تجسّس میں اس نے کتاب کرسی پر رکھی۔۔۔ چائے کی پیالی منڈیر پر چھوڑی، دروازہ بھیڑے بغیر اپنے فلیٹ سے باہر نکلا۔۔ پڑوس میں رہنے والے پروفیسر کا دروازہ تھپتھپایا۔۔۔ دو تین مرتبہ کنڈی کھڑکائی۔۔ شاید گھر میں کوئی نہیں۔۔۔ عجلت کے ساتھ زینہ طے کر کے نیچے آیا۔۔۔۔ پہلے انجینئر صاحب پھر اُن کے پڑوسی کنٹریکٹر صاحب کے دروازوں پر دستک دی۔۔۔ کیا سب ہی گھر چھوڑ کر چلے گئے؟۔۔۔ اس سے پہلے کہ گھبراہٹ پوری طرح فہیم پر حاوی ہو جائے اُسے ڈاکٹر صاحب کا خیال آیا۔۔۔ وہ اتنے صبح سویرے اپنی ڈسپنسری میں آ کے بیٹھ جاتے ہیں کہ لوگوں کو یہ گمان ہو گیا ہے وہ پیسہ بٹورنے کی لت میں ایسے پڑے ہیں کہ رات کو بھی اپنے گھر نہیں جاتے کہ خدا معلوم کب کوئی مریض آ جائے۔ فہیم نیچے پہنچا۔۔۔ اب اُسے چکر سا آ گیا۔۔۔ دوا خانہ بھی بند تھا۔

لمحہ بھر تذبذب کے عالم میں بلڈنگ کے دروازے پر کھڑا رہا۔۔۔ اب اِس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ دوڑتا ہوا سڑک کی طرف جائے اور ایک طرف رُخ کیے جانے والوں سے اس افراتفری کا سبب پوچھے۔۔۔۔۔ وہ چھوٹی سی گلی سے نکل کر سڑک پر آیا۔۔۔ یہ جلوس تھا یا تماش بین تھے۔۔۔ سب قبلہ رُو۔۔ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی فکر میں۔۔۔ عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ البتہ عورتیں کم تھیں، چھوٹے بچے اور بہت زیادہ بوڑھے بھی اس مجمع میں شامل نہیں تھے۔۔۔ ہر شخص دوسرے کو پیچھے کی جانب کھینچ کر خود آگے بڑھنے کی کوشش میں لگا ہوا۔۔۔ سب ہانپ رہے تھے جیسے میراتھن ریس (Merathon Race) جاری ہو۔

فہیم نے سڑک پر ٹھہر کر۔۔۔ بہت سارے لوگوں کو۔۔۔ ایک کے بعد ایک کو مخاطب کیا۔۔۔ چیخ چیخ کر پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور کیوں۔۔۔۔ لیکن کسی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ جس کا ہاتھ پکڑ کر روکنے کی کوشش کی وہ ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر آدمیوں کے اس ریلے میں آگے بڑھ گیا۔ فہیم نے محسوس کیا جیسے وہ سمندر کے کنارے کھڑا ہے اور موجوں کو روک لینے کی حماقت کر رہا ہے۔۔۔ مگر اس ہجوم کا۔۔ اس بے ربط انبوہ کا۔۔۔ آخر کوئی مطلب، کوئی مقصد کوئی منزل تو ہو گی۔۔۔۔۔؟ یہ سب مغرب کی طرف رُخ کیے ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کی جدوجہد میں مبتلا صرف آگے بڑھ رہے ہیں۔ کبھی دس پانچ قدم جلدی بڑھ جاتے ہیں کبھی آگے بڑھنے کی کوشش میں اِنچ بھر آگے نہیں سرکتے۔۔ مگر جس سمت سے یہ بھیڑ آ رہی ہے اُس طرف تو سیمی کا گھر ہے۔۔۔ اچانک اُسے سیمی کا خیال آیا۔۔۔ کیا اس وقت وہ بھی میری طرح حیران و پریشان کھڑی اِس ہجوم کو دیکھ رہی ہو گی۔۔۔؟ مجھے اُس کی طرف جانا چاہیے۔۔ ممکن ہے وہ میرا ہی انتظار کر رہی ہو۔۔۔

سیمی کے گھر پہنچ کر اس کا حال احوال معلوم کرنے کی بات اِس یک رُخے اور بے معنی آوازیں نکالتے ہجوم کو دیکھ کر فہیم کے ذہن میں آ گئی۔۔۔ پھر اس کا ذہن ان آوازوں کی اُلجھی ڈور میں پھنس گیا۔ یہ آوازیں بے معنی نہیں ہیں کیوں کہ سب لوگ اپنے اپنے انداز اپنے اپنے لہجے میں کچھ بول رہے ہیں اس لیے آوازوں کا بھی ایک

ہجوم ہوگیا ہے۔۔۔۔جس طرح یہ لوگ آگے بڑھنے کی جلدی دکھا رہے ہیں۔۔۔اپنے سامنے والے کو پیچھے دھکیلنے کے بعد خود کو اطمینان دلا رہے ہیں کہ وہ آگے بڑھ گئے ہیں۔ یہ نفسا نفسی کی کیفیت ہے۔ ورنہ یہ ہجوم تو ایسا ہے جیسے دُسہرے میں راون کے پُتلے کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کرنا۔۔۔یا جیسے محرم کی دسویں تاریخ کو تعزیوں کے جلوس میں شامل ہو جانا۔۔۔۔معاً اُس کا ذہن ایک فلم کے ایسے سین کی طرف چلا گیا جہاں قیدیوں نے جیل خانے کا دروازہ کھول لیا تھا اور سب ایک ساتھ نکل بھاگنے کی کوشش میں اسی قید خانے میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ ۔۔اب یہ لوگ یہاں جمع ہیں۔۔۔اور نجانے کب سے اِس حالت میں ہیں،تو آخر کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوگی۔۔۔یہ سب دیوانے تو نہیں ہیں۔ معاملہ کچھ سنگین ہی لگتا ہے اس لیے لازم ہے سیمی کی خیر خیریت معلوم کی جائے۔

بعض لوگ جنہیں تیرنا نہیں آتا محبت اور جذبات سے مغلوب ہو کر دریا میں چھلانگ لگا دیتے ہیں‘ ایسے ہی بغیر سمجھے بوجھے اُس نے دو قدم آگے بڑھائے اور ہجوم کی مخالف سمت جانے کے لیے اُس کے بیچ گھِر گیا۔۔۔۔وہ تازہ دم تھا اِس لیے مجمع کو چیرتا پھاڑتا ذرا دور تک نکل گیا۔ جب پہلو میں لوگوں کی کہنیاں چبھیں‘ پیروں پر پیر رکھے گئے۔۔۔۔سامنے سے آتے ہوئے لوگوں کی بھنبھناہٹ بھری سانس۔۔۔بدبو دار بھاپ کی طرح محسوس ہوئی تو اُس نے اپنا راستہ بنانے کے لیے کچھ اور زور آزمائی شروع کر دی لیکن ذرا ہی دیر میں یقین آ گیا کہ یہی حال رہا تو سیمی کا گھر تو دور کی بات ہے واپس اپنے گھر جانا بھی ممکن نہیں رہے گا، اِس لیے کہ دونوں جانب سے فاصلہ گھٹنے کی بجائے بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ لوگوں کا ریلا جس طرف بہا لے جاتا ہے وہ اُسی طرف بڑھ جاتا ہے۔ اس کے باوجود یہ کوشش جاری رکھی کہ رُخ سیمی کے گھر کی طرف ہی رہے۔۔وہ یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ ہجوم میں نہیں کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ اِس بھیڑ میں چند جان پہچان والے بھی دکھائی دیئے۔
اُس نے کوشش کی ذرا اُن کے قریب پہنچے اور جو بات اب تک سمجھ نہیں سکا ہے وہ معلوم کرے۔۔۔۔مگر سب ہی اپنی دُھن میں مگن تھے۔ کسی کی طرف کوئی دھیان ہی نہیں دے رہا تھا۔۔۔۔شہر بھر کے لوگوں کا اپنے گھر سے نکل پڑنا اور ایک ہی سمت چلے جانا۔۔۔۔۔۔آخر کوئی وجہ تو ہوگی۔۔۔کوئی جواب بھی تو اُسی وقت دے گا جب کچھ سنے گا۔۔۔ یہاں تو سب اپنی ہی اپنی کہہ رہے ہیں۔۔۔۔بس اِس بھیڑ بھڑکے میں شامل ہونے سے صرف ایک اطمینان ہوا ہے کہ یہ کسی مصیبت سے نہیں بھاگ رہے ہیں لیکن کس مصیبت کی طرف بھاگ رہے ہیں یہ کوئی بتاتا ہی نہیں ہے ٹھیک اِنہی خیالات کے بیچ اُسے اپنا ایک کلاس فیلو دکھائی دیا۔ کالج کے دنوں میں بہت ہنس مکھ اور کھلنڈرا تھا اور فہیم کے ساتھ ہی اُس کا سب سے زیادہ اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ اپنے پرانے ساتھی کو دیکھ کر ڈھارس بندھی کہ اب شاید اصلی بات معلوم ہو جائے کہ یہ بھیڑ کہاں جا رہی ہے، مگر بیچ میں کم سے کم بیس پچیس آدمیوں کا فاصلہ تھا۔ فہیم نے پہلے ہاتھ ہلا کر پھر نام لے لے کر۔۔۔ایک بار۔۔۔دو بار۔۔۔کئی بار پکارا۔۔ یہ سارے لوگ جس

بے ترتیبی سے آگے بڑھ رہے تھے اِسی طرح اُن سب کی ملی جلی آوازیں شور مچا رہی تھیں۔ پھر جیسے کوئی گوّیا ایک ہاتھ کان پر رکھ کے تان بھرتا ہے اِسی طرح اپنی پوری طاقت سے فہیم نے ایک بار پھر نام لے کر پکارا۔۔۔اب کے اتفاق سے اُس کے دوست نے سن لیا اور آواز کی سمت گردن گھما کے دیکھا بھی۔۔ایک لمحہ کے لیے یہ انداز رہا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔۔۔۔پھر پہچان کر ہنس دیا۔۔اُس نے کچھ کہا۔ فہیم سن ہی نہیں سکا۔ آواز بھی کہیں درمیان میں ہی رہ گئی۔۔اُس کے خوش مزاج دوست نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔۔جیسے کہہ رہا ہو، اپنا رُخ بدلو اور میرے قریب آ جاؤ۔۔فہیم نے چیخ کر پوچھا۔۔کہاں جا رہے ہو؟
جواب میں چند لوگوں نے ٹھوکے دے کر۔۔۔ بلکہ ٹھیل ٹھیل کر فہیم کو پیچھے کیا۔۔۔اب اُس نے مڑ کر اپنے دوست کو دیکھا۔ وہ فہیم کی طرف سے بے نیاز ہو کر پہلے کی طرح آگے بڑھنے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا۔
اُس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اِس راستے پر خلقت یوں ٹوٹ پڑے گی جیسے مردہ جانور کی بو پر بھوکے بھیڑیئے چاروں طرف سے دوڑ پڑتے ہیں۔۔۔بے شک یہ بڑی شاہراہ ہے لیکن آگے جا کر یہ سمندر اور پہاڑوں کے سنگم پر ختم ہوتی ہے۔ وہی لوگ اِس طرف جاتے ہیں جن کے گھر ہیں یا جو لنگر ڈالے جہازوں سے واسطہ رکھتے ہیں یا پھر وہ لوگ جن کو کوہ پیمائی کا شوق ہو۔۔۔زناٹے بھرتی کاروں اور ٹیکسیوں میں ہوائی اڈے جانے والے بھی ہوتے ہیں۔ بلکہ سڑک پر زیادہ گہما گہمی ائر پورٹ جانے آنے والوں کے سبب ہی رہتی ہے۔ سڑک کی حالت بھی اِسی لیے بہتر ہے کہ برسرِ اقتدار طبقہ کا کوئی وزیر سفیر بھی جہاز سے آتا جاتا رہتا ہے۔۔۔ورنہ شہر کی باقی سڑکوں کی طرف میونسپلٹی والے اتنی توجہ بھی نہیں دیتے جتنی کوئی بھولا بھٹکا بڈھی طوائف کی طرف دیکھ لیتا ہے اور وہ جو شہر کا نقشہ بناتے ہیں اور فخریہ اپنے آپ کو ٹاؤن پلانر کہتے ہیں۔۔اُن کو بھی اپنی جیب سے آگے کچھ دکھائی نہیں دیتا، وہ یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے کہ اُن کے بچوں کے بڑے ہونے تک شہر کتنا بڑا ہوگا۔ آبادی کتنی بڑھے گی، مسائل میں کتنا اضافہ ہوگا۔۔۔بس آج۔۔یہ آج ہی تو ہے جس میں گزرے ہوئے کتنے کل اور آنے والے کتنے دن سمٹے ہوئے ہیں۔۔۔اِسی لیے اتنی بھیڑ ہے۔۔پر مجھے اِس بھیڑ سے کیا مطلب۔۔۔میں تو سیمی کے گھر جانا چاہتا ہوں۔۔۔مانا اُس کا گھر ویسٹ اوپن ہے مگر ہے تو مشرق میں۔ میں جس رُخ چل رہا ہوں اُس طرف۔۔۔سیمی ہاں۔۔شاید اِس وقت وہ بھی میری ہی راہ دیکھ رہی ہوگی۔۔۔ذہن میں اٹھنے والے خیال اور راستے میں بڑھنے والے قدم۔۔دونوں کی رفتار یکساں تھی۔

کل رات کو ہی تو وہ سیمی سے ملا تھا۔ کل رات کو۔۔! ہاں شاید اور ایک رات پہلے۔۔وہی باتیں ہوئیں جو عشق و عاشقی میں ہوتی ہیں۔۔سیمی نے بتایا تھا کہ ایک چمڑے کا بیوپاری اُس کے گھر آنے جانے لگا ہے اور کانا پھوسی کرتا رہتا ہے۔ اِس لیے فہیم اپنی شاعری‘ مصوری سے دامن چھڑائے اور ایسے حالات پیدا کرے کہ بغیر کسی رکاوٹ کے وہ ایک دوسرے کے بن جائیں۔۔۔سیمی کے ہاں سے واپس آنے کے بعد فہیم نے ذرا دیر کے لیے

سوچا تھا۔۔۔ چلا جاؤں کسی دور دیس میں ۔۔مزدوری کروں ،ٹیکسی چلاؤں ۔قلم اور بُرش کی طرف آنکھ اُٹھا کے نہ دیکھوں‘ اگر ایسا ہو جائے تو پھر کہیں جانے کی ضرورت بھی کیا ہے ۔۔ اِس اپنے ملک میں کرپشن کا حصہ بن جاؤں ۔۔ وہی ہتھکنڈے اپناؤں جو مالدار لوگوں کے ہیں۔۔۔کیا ہوگا۔۔؟ لوگ یہی تو کہیں گے کہ۔۔۔مشکل تو یہی ہے کہ لوگ اب کچھ کہتے بھی نہیں ہیں۔۔سب تماشائی ہیں۔۔اور تماشے کا حصہ بھی۔۔قلم اٹھاؤ۔۔یا چمڑے کا بیو پار کرو۔۔۔کسی کو مطلب ہی نہیں۔۔اُس نے غیر ارادی طور سے لوگوں کو گھورنا شرع کر دیا۔۔شاید اِن میں چمڑے کا کوئی بیوپاری بھی ہو۔۔پھر اُس کے ذہن میں آیا کہ اِن میں سے کوئی چمڑے کا بیوپاری نہیں ہے یا سب ہیں۔۔اِن سب لوگوں کی آنکھوں میں بھوکے جانوروں کی سی چمک ہے۔۔سب کی نظریں ایک ہی طرف یوں گڑی ہیں جیسے شکار کی تاک میں ہوں۔

اُس نے ایک بار پھر اِس ریلے کی طرف دیکھا جس کی مخالف سمت جانے کی تگ ودو کر رہا تھا پھر بالکل سامنے آجانے والے آدمی سے پوچھا۔جس کی سانسوں میں سارے ہجوم کی گندی سانسوں اور پسینے کی بُو شامل ہو کر ایک عجیب سی سڑاند پیدا کر رہی تھی۔۔۔’’آپ کہاں جا رہے ہیں۔۔؟‘‘ جواب دینے کی بجائے اُس نے کہنیوں کے ٹھوکے سے فہیم کو دوسرے آدمی کے رُوبرو کر دیا اور خود ذرا سا آگے بڑھ گیا۔فہیم کو حیرت یوں ہو رہی تھی کہ وہ اِسی شہر میں پلا بڑھا ہے۔اِس شہر کی سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کی تصویریں اُس نے بنائی ہیں اور لوگوں نے پسند بھی کی ہیں۔۔اخباروں کے پورے پورے صفحے اُس کے فن پر لکھے گئے ہیں۔وہ ان سب لوگوں کے لیے انجان نہیں ہے پھر بھی سب لوگ اُس کے لیے اجنبی ہو گئے ہیں۔۔اتنے غیر کہ اب اُس کی بات بھی اَن سنی کر رہے ہیں۔۔فہیم کو اگر سیمی کا خیال نہ آیا ہوتا تو وہ اِن میں سے کسی بھی آدمی کو دبوچ کر ایک طرف لے جاتا پھر اِس ہنگامے۔۔اِس ہڑبونگ اور اِس یک طرفہ روانگی کا سبب معلوم کیے بغیر نہ چھوڑتا۔۔یا پھر ان سب لوگوں کی زبان سے نکلنے والے الفاظ کو سمجھنے اور پہچاننے کی کوشش کرتا۔۔فی الحال تو سانپوں کی پھنکار اور سرسرانے کی سی ملی جلی آوازیں ایک بے معنی شور بن کر اِس کے کانوں میں سیٹی سی بجا رہی ہیں۔

اِس ہجوم کے دھکے کھاتے ہوئے اُن تمام راستوں کے بارے میں سوچا جو اُسے سیمی کے گھر تک جلدی سے جلدی لے جا سکتے تھے۔۔۔مگر سب ہی راستوں میں خلقت کی دیوار کھڑی تھی۔۔اُس نے سوچا کوئی ایسا راستہ ضرور اختیار کرنا چاہئے جہاں یہ لوگ رکاوٹ بن کے موجود نہ ہوں۔۔۔ورنہ اِس بھیڑ کی مخالف سمت چلنا تو اپنی راہ کھوٹی کرنا ہے۔۔اِس خیال کے آتے ہی اُس نے بھیڑ سے نکل کے سڑک کے ایک طرف ہو جانا چاہا۔۔مگر وہ اکیلا تھا جو ایک کنارے کی طرف جانا چاہتا تھا اور وہ بہت سے تھے جو اُسے اپنے راستے میں حائل دیکھ کر دھکیلتے ہوئے پھر بیچ میں پہنچا دیتے تھے۔

آخر۔۔خدا خدا کر کے وہ راستے کے ایک کنارے پہنچا۔۔۔ چراغ جل چکے تھے۔اُس کے کپڑے کہیں سے اُدھڑ

گئے تھے اور کہیں سے پھٹ گئے تھے۔۔۔بے شمار لوگوں کے پسینے اور سانسوں کا تعفّن اُس کے بدن سے چپکا ہوا تھا۔۔دِن بھر منہ زور مجمع کا مقابلہ کرتے رہنے سے پورے بدن پر تھکن کے گھاؤ پڑ گئے تھے۔ پیاس خنجر کی طرح حلق میں اور بھوک تلوار کی مانند پیٹ میں اتر آئی تھی ۔اب وہ اپنے ہی درد میں اتنا نڈھال ہو چکا تھا کہ سیمی کے خیال کا پھاہا بھی پھوڑے کی طرح دکھتے ہوئے بدن کو سکون نہیں پہنچا رہا تھا ساتھ ہی اِس منہ زور ہجوم سے جوجھنے کی اب اُس میں اور سکت نہیں رہی تھی ۔۔اتنا تو اُسے معلوم تھا اب وہ ایسی جگہ ہے جہاں سے اپنے گھر اور سیمی کے پاس جانے کے لیے فاصلہ برابر ہے۔

وہ خود کو کوشش کر کے خود کو سنبھال رہا تھا۔یہ بات اُس کو سمجھ میں آ گئی تھی اگر وہ اِس بھیڑ میں گر گیا تو قدموں تلے روند دیا جائے گا۔اب اُس کی کوشش یہی تھی کہ جتنی طاقت اور توانائی اُس میں باقی ہے۔اُس کے سہارے وہ سڑک کے ایک طرف ہو جائے ۔۔۔جب اپنی زندگی بچانے کا معاملہ ہو تو آدمی سارا حوصلہ۔۔تمام ہمت جمع کر کے بڑے سے بڑے طوفان سے مقابلہ کرنے کی ٹھان لیتا ہے۔۔۔بس اُسی لمحے ایسا لگا جیسے کسی نے ہاتھ پکڑ کے فہیم کو اپنی طرف کھینچا ہے۔۔وہ ایک دکان کے تھڑے پر جا کے کھڑا ہو گیا۔اتنی اونچی جگہ، جہاں سے یہ سارا ہجوم بہتے ہوئے پانی کی طرح لگا۔۔۔۔فہیم نے اس بھیڑ سے نکالنے والے کی طرف شکریہ ادا کرنے کے لیے دیکھا تو ایسا معلوم ہوا جیسے آئینہ دیکھ رہا ہو۔۔مگر تھکن نے پوری طرح دیکھنے کی طاقت بھی چھین لی تھی ۔اِس بھیڑ نے اُسے کمہار کے چاک پر رکھی ہوئی گیلی مٹی بنا دیا تھا۔۔دکان کے تھڑے پر پہنچ کر وہ کچّے گھروندے کی طرح ڈھے گیا۔

اِس بھنبھناہٹ بھرے شور میں جب ذرا حواس جاگے تو اُس نے آنکھیں کھول کر تھکے ہوئے لہجے اور بجھی ہوئی آواز میں کہا۔

’’میں صبح سے۔۔۔یا شاید کل سویرے سے یا کئی دنوں سے۔۔۔مجھے یاد نہیں ہے بس اتنی خبر ہے کہ آج آدمیوں کے اِس بھنور سے نکلا ہوں۔۔۔۔تھکان، بھوک اور پیاس نے یہاں لا ڈالا ہے۔۔۔‘‘ اتنا کہنے کے بعد اُس کی نظریں اجنبی نگاہوں کے ساتھ ساتھ دکان کے بند تالے پر جا ٹکیں۔۔۔۔۔مجمع سے زور آزمائی کرنے کے بعد خدا جانے اتنی طاقت کیسے باقی رہ گئی تھی کہ تالا توڑ لیا۔۔۔

اندر ایک صراحی میں پانی موجود تھا۔۔پیاس بجھی تو کھانے کی تلاش ہوئی۔۔۔بھکراندے بسکٹوں کے ایک ڈبے کے ساتھ ایک شیشی میں چنے بھی رکھے تھے۔۔۔۔اب جان میں جان آئی۔۔۔اور وہ وہیں پھر آنکھیں موند کے لیٹ گیا۔۔’’کچھ خبر ہے اِن لوگوں پر کیا افتاد پڑی ہے جو اپنے گھر بار۔۔۔بیوی بچّوں سے بے نیاز ہو کر ایک ہی طرف منہ اُٹھائے یوں بھاگے۔۔نہیں۔۔بس چلے جا رہے ہیں؟۔۔۔‘‘ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا یہ سوال اُس نے کیا ہے یا اجنبی نے پوچھا ہے۔

’’میں نے بھی یہ بات کئی لوگوں سے پوچھی تھی مگر خدا جانے وہ کون سی جناتی زبان بول رہے تھے یا اُن سب کی آوازیں گڈمڈ ہوکر اُلجھے ہوئے دھاگے کا ایک گچھا سا بن گئی تھیں۔۔کچھ پتا ہی نہیں چل رہا تھا۔۔۔اِس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ ان لوگوں کے ساتھ بلکہ ان کے بیچوں بیچ رہتے ہوئے میرا دھیان اِدھر اُدھر لگا رہا۔۔مگر ساتھ ہی ساتھ اُن کی آوازوں کے رنگ برنگے لچھے کو سلجھاتا بھی رہا۔۔۔پھر جس کو عقلِ سلیم کہتے ہیں‘ اُس کے بل بوتے پر اتنا سمجھ سکا کہ یہ سارے لوگ ایک بیماری میں مبتلا ہیں۔۔۔۔‘‘

’’بیماری۔۔۔۔۔!‘‘

’’ہاں۔۔۔اِس بیماری کی کہانی ماضی کے کئی سو سال پر پھیلی ہوئی ہے۔آجکل تو بیماریاں ملکوں ملکوں بھی سفر کرتی ہیں جیسے فِلو ہانگ کانگ سے۔۔۔سارس، چین اور کوریا سے نکل کر دوسرے ملکوں میں پہنچتے ہیں۔۔ ایڈز امریکا سے پھیلی ہے۔۔۔لیکن ہمارے ملک میں یہ بیماری آج سے صدیوں پہلے انگریز لے کر آیا۔۔۔تاجرانہ ذہنیت کے یہ جرثومے صرف ایک خاص طبقہ تک ہی پھیل سکے۔۔۔تجارت بُری چیز نہیں ہے۔۔بُری چیز ہے فراڈ جو تجارت کے نام پر کیا جاتا ہے۔۔۔ہمارے ملک کے خاص طبقے میں یہ جراثیم پھیلے۔اُس کو آج بھی اچھے نام سے نہیں پکارا جاتا۔۔۔جو لوگ اِن بیماروں کی نسل سے ہیں وہ بھی اپنا رشتہ اُن سے نہیں جوڑتے تھے۔۔۔اب نیا زمانہ ہے۔۔سماجی اور اخلاقی قدریں بدلتی چلی جارہی ہیں۔انسان ترقی کر کے اَن دیکھی دنیاؤں کی طرف نکل رہا ہے۔۔۔پہلے اُس بیماری کا نام لالچ تھا۔۔۔چند ہی لوگوں تک محدود رہی۔۔۔اب تو۔۔رشوت کھانے والا ہر شخص اِس کا شکار ہے۔۔۔۔زمیندار اور جاگیردار میں سے کوئی بھی اِس بیماری نہیں بچ سکا ہے۔جب یہ بیماری کالج اور یونیورسٹی میں پہنچی تو اِس کا نام ہی بدل دیا گیا۔۔پہلے کوئی لالچ کہتا تھا کوئی حرص وہوس۔۔۔اب اِسے (Prosperity) کہتے ہیں۔۔۔کامیابی۔۔۔خوشحالی۔۔اب سے چند سال پہلے زیادہ سے زیادہ ہزار دو ہزار لوگ اِس خوشحالی کے پیچھے بھاگے تھے۔۔اُن میں سے آدھے واپس آئے تو اُن کی جیب میں دولت ٹھنسی ہوئی تھی۔۔آتے ہی شاندار کوٹھیاں بنائیں۔۔۔مہنگی موٹر کاریں خریدیں۔۔۔بس پھر تو چھوت کی بیماری کی طرح۔۔۔خوشحالی کی خواہش میں سب ہی مبتلا ہوتے چلے گئے۔۔اچھے بُرے کی تمیز اُٹھ گئی۔۔جب اپنے ملک میں خواہش پوری ہوتے نہ دیکھی تو لوگ بیوی بچّوں کو۔۔۔بڈھے ماں باپ کو یہ آسرا دے کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے کہ جائیں گے اور دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ لائیں گے۔۔۔یہ قطار میں کھڑے لوگ۔۔۔یہ سب جانے کے انتظار میں ہیں۔خود آگے بڑھنے کے لیے دوسرے کو پیچھے کھینچتے ہیں۔۔کیا تم بھی اِس قطار میں تھے؟‘‘

یہ باتیں سنتے ہوئے فہیم کی پلک جھپک گئی۔۔جب آنکھ کھلی تو اُس نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا۔۔یہ میں کہاں ہوں۔۔؟ اور وہ کہاں ہے۔۔؟ پھر ایک ایک کر کے ساری بات یاد آنے لگی۔۔۔فوراً دکان سے باہر نکلا۔۔۔شٹر گرایا۔۔۔تالا لگایا۔سارے مجمع سے الگ ہو کے۔۔۔چھوٹی چھوٹی گلیوں میں چلتا ہوا یہ سوچتا

رہا۔۔۔وہ نازک سی لڑکی جو بانہوں میں آ کے سہم جاتی ہے۔۔۔اتنے لوگوں کو دیکھ کر ضرور ڈر گئی ہوگی۔اُس نے چلتے چلتے دیکھا۔۔بوڑھی عورتیں جانے والوں کے لیے دعا میں مصروف ہیں۔۔۔جوان اور شرمیلی عورتیں صبر کی چادر اوڑھے آنکھوں میں انتظار کا کاجل لگائے کھڑی ہیں۔کچھ بوڑھے ایسے ہیں جن کی آنکھوں میں غصے کی سرخی ہے مگر کچھ ایسے بھی ہیں جن کے چہروں پر تاسّف کی جھریاں پڑی ہیں۔۔۔۔البتہ بچّوں کے چہرے ایک سے تھے، لاپرواہی اور معصومیت کے رنگ میں رنگے ہوئے۔۔۔۔۔سیمی کا گھر قریب آتا جا رہا تھا۔۔۔۔فہیم کے خیالوں میں یکسوئی پیدا ہوتی جارہی تھی۔اب وہ سرف سیمی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔۔جدائی کے اِن لمحوں میں اُس لڑکی کو کیا کچھ خیال نہیں آئے ہوں گے۔وہ سمجھتی ہوگی‘ میں بھی اس بھیڑ کا حصہ بن کے چمڑے کے بیوپاری کا مقابلہ کرنے کے لیے کہیں چلا گیا ہوں۔۔لیکن اُسے کیا معلوم میں اُس کے خیال تک سے دور نہیں رہا۔۔۔سیمی کے گھر کا راستہ آتے ہی بھیڑ چھٹ چکی تھی۔۔خالی راستہ دیکھ کر فہیم نے تیزی سے قدم اُٹھائے۔۔۔اُس کے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔۔۔بالکل ایسے ہی جیسے دوسرے بہت سے مکانوں کے دروازے کھلے تھے۔۔۔ایک لحظہ کے لیے فہیم کا دل دھڑکا۔۔کہیں سیمی اور اُس کے گھر والے بھی تو اُس مجمع کا حصہ نہیں بن گئے۔۔اِدھر فہیم نے گھر میں قدم رکھا اُدھر سیمی بیتابی کے ساتھ کمرے کے باہر آئی۔۔۔اُس کو دیکھ کر فہیم کی ساری تھکن کافور ہوگئی۔۔۔اپنے بازو پھیلا کے سیمی کو سمٹ آنے کی دعوت دی تو اُس نے لمحہ بھر ٹھٹھک کر فہیم کے تھکے ماندے چہرے کو دیکھا۔۔۔ایک قدم آگے بڑھایا پھر فہیم کا میلا کچیلا بوسیدہ لباس دیکھ وہ جہاں تھی وہیں ٹھہر گئی۔۔۔پھر بہت ہی مرجھائے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’تم آگئے۔۔۔آج بھی۔۔۔پہلے کی طرح۔۔۔۔‘‘

اُس نے اور کیا کچھ کہا فہیم نے نہیں سنا۔۔۔اُس کے پھیلے ہوئے خالی ہاتھوں پر سیمی کے لہجے کا اتنا بوجھ پڑا کہ بازو لٹک گئے۔۔۔اور طویل عرصے کی جدوجہد نے اتنا دباؤ بڑھایا کہ وہ وہیں مٹی کی طرح ڈھیر ہوگیا۔

’’سلطان جمیل نسیم افسانہ نگاروں کی اُس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو ۱۹۵۰ء سے اب تک اُردو ادب کو اپنی فکری اور تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعے معتبر بنائے رکھنے میں مصروف ہے۔ان کی تخلیقات میں جتنی Vriety ، جتنا تنوع نظر آتا ہے وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آیا ہے۔افسانہ نگاری اور ڈرامے کے سلسلے میں ان کا نام درجۂ اعتبار حاصل کر چکا ہے۔ان کے ادبی سفر کو دیکھیں تو ان کی ایک بڑی خوبی یہ نظر آتی ہے کہ انہوں نے اپنا ادبی سفر سلامت روی اور ثابت قدمی سے طے کیا ہے، شہرت کے پیچھے بھاگنے کے بجائے عصری تقاضوں کے ساتھ رہے ہیں۔یہی سبب ہے کہ ۱۹۵۰ء سے لکھنا شروع کیا۔۱۹۵۳ء میں پہلا افسانہ شائع ہوا لیکن ۱۹۸۵ء میں افسانوں کا پہلا مجموعہ سامنے آیا۔‘‘ (ادبی اور سوانحی خاکہ از **نسیم درانی**۔بحوالہ ’’میں آئینہ ہوں‘‘)

پروفیسر خوشی محمد خان (جرمنی)

ازل سے ابد تک

(پروفیسر ڈاکٹر خان ایک عرصہ سے جرمنی میں مقیم ہیں۔یہاں کی یونیورسٹیز میں تیسری دنیا کی اقتصادیات،سوشو اکنامیکل حوالے سے پڑھا چکے ہیں۔اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ان کا ایک افسانہ جدید ادب کے شمارہ مئی ۲۰۰۰ء میں شائع کیا گیا تھا۔آپ اِس وقت اپنے افسانوں کا ایک مجموعہ اور اپنی یادوں کو ترتیب دے رہے ہیں۔ذیل میں ان کا ایک نایاب افسانہ’’ازل سے ابدتک‘‘ پیش کیا جا رہا ہے۔یہ افسانہ اسلامیہ کالج چنیوٹ کے کالج میگزین ’’البصیر‘‘ کے شمارہ دسمبر ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا۔یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسند تحریک کی ادبی یلغار کے باوجود میرزا ادیب اور دوسرے رومانوی افسانہ نگاروں کی رومانویت پسندی بھی اردو افسانے کا اہم جزو تھی۔اس افسانے میں رومانویت پسندی کے ان اثرات کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔اپنا یہ نایاب افسانہ فراہم کرنے پر ادارہ جدید ادب ان کا شکر گزار ہے۔**حیدر قریشی**)

کتنی بہاریں آئیں بھنوروں نے مدھر گیت گائے۔شاخوں پر کلیاں پھوٹیں۔دھرتی کے سینے سے کائنات کے ذرے ذرے میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔عشق نے محبت کو حسن کی بارگاہ میں پیش کیا۔ساکن زندگی میں نغموں نے جنم لیا اور پھر یہ بہاریں بھی بیت گئیں۔پھول مرجھا گئے،شدت کے الاؤ سرد پڑ گئے۔تند ہواؤں نے ہر چیز کو پامال کر کے رکھ دیا۔سازوں میں نغمے ٹھہر گئے،ڈوب گئے یا کہیں کھو گئے۔سبزے مرجھا گئے۔اور زرد سایوں نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔بہاریں آتی ہیں اور خزاؤں کو جنم دے کر چلی جاتی ہیں۔کسی اَن جانے دیس کو،شاید اُفق کے اس پار جہاں نہ پت جھڑ ہے نہ تند ہوائیں،نہ زرد سائے ہیں نہ چیخیں! اور میں ہوں کہ بس دیکھتی ہوں کچھ سوچتی رہتی ہوں۔ذہن کی ساکن سطح پر غیر واضح لکیریں اُبھرتی ہیں،پھیلتی ہیں اور پھر مٹ جاتی ہیں۔محبت انسان کو جنم دیتی ہے۔محبت ہی کے سایہ میں انسان پروان چڑھتا ہے۔محبت محبوب کا سایہ اوڑھ لے تو انسان ایک ہمہ گیر وسعت اختیار کر لیتا ہے اور جب یہ محبت سماج کی ظالم زنجیروں میں جکڑ لی جائے تو وسعتیں سمٹ جاتی ہیں۔اندھیرے پھیل جاتے ہیں اور انسان مرجاتا ہے اور جب اتھاہ تاریکی ہر چیز کو نگلنے لگتی ہے تو ہم ماضی کا

سہارا لیتے ہیں۔ماضی جو حال کو جنم دیتا ہے،جس سے ہم کبھی علیحدہ نہیں ہو سکتے۔جسے ہم بھول جاتے ہیں لیکن ہمیں کبھی نہیں بھولتا،کبھی نہیں چھوڑتا۔جس کے لمبے سائے حال کی حدود سے لے کر مستقبل کی وسعتوں تک پھیلے پڑے ہیں۔اور بعض لمحے ایسے بھی آتے ہیں جب ذہن پیچھے کی طرف پلٹ جاتا ہے۔وقت ٹھہر جاتا ہے اور غیر ارادی طور پر ہم روندی ہوئی راہوں میں کھو جاتے ہیں۔

وہ سرما کی ایک خنک ترین رات تھی۔کھانے کے بعد سبھی لوگ بڑے کمرے میں اپنی مخصوص جگہوں پر آ بیٹھے۔ابا میاں منہ میں حقہ لئے اخبار دیکھنے لگے۔امی گڈو کے لئے پُل اوور تیار کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گئیں۔آپا کوثر حسبِ معمول آرام کرسی پر نیم دراز نہ جانے کس دیس کی سیر کو چل نکلیں۔اور مجھے حسبِ عادت نیند آنے لگی۔مگر ابھی تو دو روزہ رپورٹ پیش کرنی تھی،ہدایات لینی تھیں۔لیکن ابا میاں کمال اشتیاق سے اخبار میں محو تھے۔ابھی اونگھنے ہی لگی تھی کہ خوشخبری ملی،اگلے روز ماسٹر جی آ رہے تھے۔انہوں نے وقت کی پابندی کے لئے خاص تاکید کی تھی۔گرمیوں کی چھٹیوں کے لئے اسکول سے اتنا کام ملتا تھا کہ پڑھائی سے نفرت ہونا لازمی بات تھی۔اور ابا میاں برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ہمیں پڑھائی سے ذرا بھی نفرت ہو۔لہٰذا ٹیوٹر کا انتظام کر دیا گیا تھا۔

اور اگلے روز ابھی تیار بھی نہ ہو سکے تھے کہ اطلاع ملی ماسٹر جی بڑے کمرے میں ہمارے منتظر ہیں۔اور پھر پانچ منٹ کے وقفہ میں اُن کا تیسرا ابلاوا آ چکا تھا۔کہاں تو میں نے اصرار کے ساتھ پرائیویٹ ٹیچر کا انتظام کروایا اور کہاں اب گھبرا رہی تھی۔نہ جانے سخت طبیعت کے ہوں۔اگر ڈانٹ ڈپٹ ان کی عادت ہوئی تو کیسے برداشت ہو گا۔نوکر چوتھی مرتبہ آ چکا تھا اور آپا کوثر کتابیں لئے میری منتظر تھیں۔ہم دونوں دسویں جماعت میں پڑھتی تھیں۔مجھے فوراً یاد آ گیا کہ اُنہوں نے وقت کی پابندی کے لئے خاص تاکید کی تھی۔جلدی جلدی تیار ہو کر بڑے کمرے کی طرف بڑھیں۔دروازہ بند تھا۔ہم رُک گئے۔

’’وہ کپڑے بدل رہی ہیں‘‘ گڈو کہہ رہی تھی۔

’’انہیں کہو جلدی آئیں‘‘ ماسٹر جی کی آواز تھی۔

اچانک دروازہ کھلا اور گڈو ہمیں اندر کھینچنے لگی۔اتنی نڈر تھی کہ ہر اجنبی سے فوراً گھل مل جاتی۔ہم اندر جاتے ہوئے شرما رہی تھیں۔وہ بھانپ گئے۔کہنے لگے۔’’آ جایئے! طالب علموں کے وقت کا ہر لمحہ بہت قیمتی ہوتا ہے‘‘

ہماری رُکی ہوئی سانسیں پھر سے چلنے لگیں اور میرا سارا مبہم خوف جاتا رہا۔ہم اندر داخل ہوئے۔وہ اخبار دیکھ رہے تھے۔گیبرڈین کی پینٹ کے ساتھ سفید قمیص پہن رکھی تھی،جس نے ان کے سانولے رنگ کو گہرا بنا دیا تھا۔یہی ۲۰۔۲۱ سال کے ہوں گے۔بال نہایت سلیقہ سے بنے تھے اور ان کا بھرا بھرا چہرہ نہایت سنجیدگی سے اخبار پر جھکا تھا۔مجموعی طور پر انہیں خوبصورت تو نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن بدصورت بھی نہیں تھے۔

’’بیٹھ جایئے‘‘ انہوں نے اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔جس میں ادب ذرا بھی نہ تھا۔میں تو ان کے

تحکمانہ طرزِ گفتار پر چڑ سی گئی۔ ہم بیٹھ گئے اور وہ کئی منٹ تک اخبار دیکھتے رہے۔ کچا تو کئی مرتبہ نوکر بھیج چکے تھے۔ ایک عدد نصیحت بھی فرما چکے تھے اور اب اخبار میں یوں محو تھے جیسے اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔ اور جب ہم بور ہو کر اونگھنے لگیں تو انہوں نے ایک اچٹتی نگاہ سے ہمیں دیکھا اور نام پوچھے۔ کتابوں کاپیوں پر ایک سرسری سی نظر ڈالی۔ کچھ ہدایات دیں اور چلے گئے۔ اور پھر وہ روزانہ آنے لگے۔ وقت کے غیر معقول حد تک پابند تھے۔ بارش ہو رہی ہے، گلی میں پانی ہی پانی پھیل چکا ہے۔ لیکن ہاتھوں میں جوتے اٹھائے وہ وقتِ مقررہ پر دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں۔ بہت کم گو تھے، جو کچھ کہتے مجھے تو کم ہی سمجھ میں آتا تھا۔

البتہ آپا کوثر یوں سر ہلاتیں جیسے سب کچھ سمجھ رہی ہوں۔ حالانکہ گھر والوں کی نظروں میں، میں زیادہ ذہین تھی۔ ہر سال اچھے نمبروں میں پاس ہوتی اور آپا کوثر دو مرتبہ فیل ہو چکی تھیں۔ سبق سناتے وقت جب کبھی رُک جاتی تو اُن کے لبوں پر دبی دبی مسکراہٹ پھیل جاتی اور میں جھنجھلا ہی تو اٹھتی۔ جی چاہتا کتاب پھینک کر زور زور سے چیخوں اور اس طرح امی کسی اور ماسٹر کا انتظام کر دیں۔ اور سونے سے پہلے جب آپا کوثر کہتیں ''وہ بہت اچھا پڑھاتے ہیں، بی اے کر چکے ہیں نا!'' تو میں جھگڑ پڑتی۔ اور بحث کرنا آپا کے بس کا روگ نہ تھا۔ اور پھر جب مجھے سبق یاد ہونے لگے تو میری تعریف میں بھی کبھی کبھار ایک فقرہ کہہ دیتے۔ ان کی دبی دبی مسکراہٹ دیکھ کر ایسے لگتا کہ بس یونہی کہہ رہے ہیں۔

آپا کوثر کی انہوں نے کبھی تعریف نہ کی۔ جب کوئی لفظ بھول جاتا اور وہ ادھر اُدھر نظریں دوڑاتیں جیسے کچھ ڈھونڈ رہی ہوں اور وہ بھانپ جاتے۔ مطلب سمجھاتے وقت اُن کی نظریں کچھ لمحوں کے لئے آپا کوثر کے چہرے پر رُک جاتیں اور آپا کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح سُرخ ہو جاتا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر پوچھتے

''سبق یاد ہو رہا ہے نا!''

اور میں سوچنے لگتی کہ وہ بچوں کا سا سلوک کیوں کرتے ہیں؟ مجھ سے باتیں کرتے وقت بھی سنجیدہ کیوں نہیں ہو جاتے؟ مجھے کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں؟ اور کبھی کبھار آپا اُوٹ پٹانگ سوال کر بیٹھتیں تو میں اور چِڑ جاتی۔ بھلا ایسے بے تکے سوالوں کی کیا ضرورت تھی۔ ''نہ جانے زندگی کیا ہے؟'' آپا دھیرے دھیرے گنگناتیں۔

''کوئی بھی تو نہیں جانتا ہم کون ہیں، کہاں جا رہے ہیں اور کب تک ساتھ رہیں گے'' وہ جواب دیتے۔

''موت سے آگے کیا ہے؟'' آپا پھر پوچھتیں

''اتھاہ تاریکی کے علاوہ شاید کچھ بھی نہ ہو'' وہ اُسی لَے میں جواب دیتے۔

''لوگ مل کر بچھڑ کیوں جاتے ہیں؟'' نہ جانے آپا اتنے سوال کہاں سے اکٹھے کر لاتیں۔

''ہم ملتے ہی بچھڑنے کے لئے ہیں'' اُن کی آنکھیں دیوار پر ٹنگے ہوئے کلاک پر رُک جاتیں۔

''مثلاً شاید ہم پھر کبھی نہ مل سکیں؟'' آپا پھر دھیرے دھیرے گنگناتیں۔

''اکثر تو یہی ہوتا ہے'' وہ فضا میں نظریں پھیلا دیتے۔

''میں بتاؤں زندگی کیا ہے؟'' آپا اچانک کہتیں

''جی!'' وہ کہیں دور سے جواب دیتے۔

''ایک ادھورا خواب۔'' آپا پُر اعتماد لہجے میں جواب دیتیں۔ اور اُن کی نظریں پھر آپا کے چہرے پر رُک جاتیں۔ جیسے کچھ تلاش کر رہی ہوں، کچھ ڈھونڈنے کی فکر میں ہوں۔ اور آپا کا چہرہ پھر سے گلاب کے پھول کی طرح سرخ ہو جاتا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ پھر پوچھتے ''سبق یاد ہو رہا ہے نا؟''

اور میں نظریں جھکا کر پھر سوچنے لگتی کہ وہ مجھ سے بچوں کا سا سلوک کیوں کرتے ہیں۔ ایسی باتیں کرتے وقت مجھے کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں؟ اور مجھے ان سے نفرت سی ہونے لگی۔

پھر ایک شام زور کی بارش ہوئی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ جھکے ہوئے بادل کبھی نہ چھٹیں گے۔ ہماری گلی نشیب میں تھی۔ اس میں پانی اکٹھا ہو گیا۔ رات کی تاریکی میں بھیانک سناٹا پھیلتا گیا۔ ٹھنڈی ہوا کے تند جھونکے جسم میں کپکپی پیدا کرنے لگے۔ ابا میاں کسی کام سے لاہور گئے تھے۔ امی کھانے کے بعد ہی سو گئی تھیں اور بچے لحافوں میں دبکے پڑے تھے۔ آپا کوثر اور میں سبق یاد کر رہی تھیں۔ گلی میں سے ننگے پاؤں گزرنے والے چھپل چھپ۔ چھپ چھپل کرتے سنائی دے رہے تھے۔ اچانک ایسا شور ہوا جیسے کوئی گرا ہے یا گرتے گرتے بچا ہے۔

''کیچڑ میں ننگے پاؤں چلنے میں کتنی راحت محسوس ہوتی ہے'' یہ ماسٹر جی کی آواز تھی۔

''عجیب احمق ہو۔ ایسا راستہ تھا تو مجھ پر تو رحم کیا ہوتا'' یہ شاید ان کے کسی دوست کا اظہار ناراضگی تھا۔

آپا کوثر کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ میری طرف دیکھنے لگیں۔ بھلا اس میں مسکرانے کی کونسی بات تھی۔ ایک پڑھا لکھا انسان کتنی حماقت کر رہا تھا۔ دل تو چاہا کہ ان کی اس حرکت پر روؤں اور کہوں کہ کیچڑ میں کبھی راحت نہیں مل سکتی۔ لیکن وہ ماسٹر جی تھے اور آپا تو پاگل ہی تھیں جو فضا کو تکتے بس مسکرائے جا رہی تھیں۔ صبح امی سے ذکر کیا تو کہنے لگیں ''کہیں ضروری کام سے جا رہا ہو گا۔ بہت نیک لڑکا ہے''

امی بھی کبھی کبھار بے تکی بات کر جاتیں۔ ذکر تھا کیچڑ کا اور لے بیٹھیں سیرت کو۔ جیسے انہیں برسوں سے جانتی ہوں یا انہیں اپنے ہاتھوں سے کھلایا ہو۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ لوگ لڑکیوں کو تعلیم کے زیور سے محروم رکھ کر انسانیت پر بہت بڑا ظلم کرتے ہیں۔

ہمارا ملازم اکرم ''ہندوستانی پاگل'' تھا۔ بلا ضرورت، بے مقصد اور پاگلوں کی طرح ادھر اُدھر وقت ضائع کیا کرتا۔ دنیا جہان کے ذاتی معاملات کا اُسے پورا علم ہوتا۔ غیر متعلق انسانوں کی زندگی میں خاص دلچسپی کا اظہار اُس کا محبوب مشغلہ تھا۔ ہوٹلوں کے بیرے، چھابڑی والے، پوسٹ مین اور اسکول کے ماسٹر اس کے حلقۂ احباب میں داخل تھے۔ گیا ہے بچوں کی دوائی لینے اور کمپاؤنڈر دوست سے گپیں ہانکنے میں وقت ضائع کر کے لوٹ رہا

ہے۔بھیجا ہے کہ دوپہر کے لئے گوشت لے آئے اور کسی چھابڑی والے سے دنیا بھر کی بحث کر کے تیسرے پہر خالی واپس آ رہا ہے۔عذر یہ کہ قصابوں نے ہڑتال کر رکھی ہے یا ملول چہرے سے جواب ملتا نتھو کباب فروش مل گیا تھا۔ذرا دو باتیں کرنے بیٹھ گئے۔

ابا میاں اکثر دھمکاتے کہ اگر نوکری کرنی ہے تو انسانوں کی طرح کام کرنا ہوگا لیکن اس کے خاندان کی مفلسی کو مدنظر رکھتے ہوئے امی آڑے آ جاتیں۔ایک دو دن ٹھیک رہتا پھر وہی ڈھاک کے تین پات۔کسی زمانے میں آٹھویں پاس کر چکا تھا۔اگر کسی روز گھنٹوں غائب رہتا تو بلا شبہ کسی کتب فروش کی دوکان پر نئی کتابوں کی فہرست دیکھتا پایا جاتا۔اسکول کے تقریباً ہر ٹیچر سے مشورے کر چکا تھا کہ میٹرک کرنے کے لئے کون سا طریقہ بہتر رہے گا۔کون کون سی کتابیں مناسب رہیں گی۔اور جب سے ہمارے ہاں نئے ماسٹر آئے تھے ان کی تعریف میں نہ جانے کیا کچھ کہتا پھرتا۔اور پھر اختتام یہی ہوتا کہ نئے ماسٹر جی نے اسے یقین دلایا ہے کہ وہ میٹرک پاس کرائے گا۔اور پرانی کتابوں کے کئی دوکاندار اس ابدی گاہک سے اور بھی تنگ آ گئے۔

اُس شام بلا کی سردی تھی۔دوپہر کی شدید بارش کے باوجود مطلع ابر آلود تھا۔سبھی لوگ باورچی خانے میں آگ تاپ رہے تھے۔اکرم دوپہر سے کہیں غائب تھا۔امی آج اپنے قطعی فیصلے کا اظہار فرما چکی تھیں کہ اسے ملازمت سے علیحدہ کر دیا جائے گا۔گڈو بھول بھوک سے بلبلا کر دودھ کے لئے رونے لگی تو امی نے اپنے قطعی فیصلے کو زوردار الفاظ میں دہرایا۔اسی وقت اکرم سر جھکائے آ پہنچا اور دروازے میں ہی ٹھہر گیا۔

’’میں تو سمجھی تھی کہیں مر ہی گئے آج‘‘ امی پہلی مرتبہ چیخیں۔

’’مرنے والے کے جنازہ کو کندھا دینے گیا تھا‘‘ اس نے سر اُٹھائے بغیر جواب دیا۔

’’بدتمیز کیا بکتا ہے؟‘‘ امی غصے اور حیرت سے بولیں۔

’’ماسٹر جی کے چھوٹے بھائی چھت سے گر کر شہید ہو گئے ہیں‘‘ وہ اسی انداز سے بولا۔آپا کوثر کے ہاتھ سے سلائی کا رومال چولہے میں جا گرا۔اور انہوں نے دیوار کا سہارا لیا۔میرا دل بیٹھ سا گیا۔امی کے سرخ چہرے پر زردی کی ہلکی ہلکی لکیریں بکھریں اور ان کی آنکھوں میں ممتا کا پانی پھیل گیا۔آپا جلے ہوئے رومال کو سمیٹنے لگیں۔

’’بڑا ظلم ہوا۔اس کی امی کا کیا حال ہوگا؟‘‘ امی نے انتہائی دردناک لہجہ میں کہا۔

’’وہ تو پچھلے سال انتقال کر گئی تھیں‘‘ اکرم ایک ہی لے میں بولے جا رہا تھا۔اور امی کی آنکھوں میں پھیلا ہوا پانی ٹپ ٹپ بہنے لگا۔آپا کوثر چولہے میں زور زور سے پھونکیں مار کر دوپٹے سے آنکھیں مسلنے لگیں اور مجھے چکر سا آنے لگا۔’’ماسٹر جی وہیں تھے؟‘‘ نہ جانے میں نے کیسے کہہ دیا

’’ننھے بھائی کو بازار سے وہی اٹھا کر لائے تھے‘‘

’’یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟‘‘ گنگنانے والی آپا نے مجھے پہلی مرتبہ ڈانٹا۔

’’نہیں تو! چارپائی پر لیٹے ہوئے بھائی کو چپ چاپ تکتے رہے اور جب چھوٹے بچے چیخنے لگے تو کڑک کر بولے ’جانے والا تو جا چکا۔تمہارے چیخنے سے لوٹ تو نہیں آئے گا‘‘ ہم سب سہم گئے تھے۔

’’میت کو دفناتے وقت وہ بالکل خاموش تھے۔واپسی پر مجھے آہستہ سے کہا: دو تین روز تک نہیں آ سکیں گے‘‘ اور پھر اکرم بچوں کی طرح رونے لگے۔امی ساتھ دینے لگیں۔آپا کوثر چولہے میں اور زور زور سے پھونکیں مار رہی تھیں۔مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ جلتی ہوئی آگ کو بجھانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھیں اور آگ تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔

کئی روز بعد ماسٹر جی آئے تو ہم سہمے سہمے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔’’لائیے سبق کہاں چھوڑا تھا‘‘ انہوں نے کہا۔ اور ہم بے حس بیٹھے تھے۔

’’آیئے باقی ماندہ سبق بھی ختم کر لیں‘‘ انہوں نے پھر کہا۔ہم پھر بھی بے حس تھے اور انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ سر جھکا لیا۔

’’زندگی کتنی غیر یقینی ہے!‘‘ آپا کوثر دھیرے دھیرے گنگنائیں۔

’’پھر بھی اس سے چمٹے رہنے کی خواہش ہمیشہ زندہ رہتی ہے‘‘

’’یہ بے ہودگی ہی تو ہے‘‘ آپا پھر بولیں۔

’’ایسی بے ہودگی جو عام ہو کے رہ گئی ہے‘‘ انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں جواب دیا۔اور پھر ایک لمبی چُپ!

’’یہاں کوئی کسی کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا‘‘ آپا نے دکھی لہجے میں کہا۔دروازے کی آڑ سے امی غم کا اظہار کرنے لگیں، صبر کی تلقین۔وہ چپ چاپ سنتے رہے۔غم سے بوڑھے دکھائی دے رہے تھے۔

اور پھر وہ دن۔۔۔جب وہ ایم اے کے لئے لاہور جا رہے تھے اور انہیں مختصر سی الوداعی پارٹی دی جا رہی تھی۔وہ وقتِ مقررہ پر تھکے تھکے سے آئے اور چپ چاپ بیٹھ گئے۔جب میں نے بتایا کہ آپا کوثر کو بخار ہے اور ڈاکٹر نے انہیں مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے، شاید وہ نہ آ سکیں تو ان کی اداس سی نظریں میرے چہرے پر گڑ ہی تو گئی تھیں۔کہنے لگے ’’آپ کے کہنے سے آ جائیں گی۔مجھے کل ہی تو چلے جانا ہے۔‘‘ اور مجھے اٹھنا ہی پڑا۔امی کی مرضی کے خلاف آپا میرا ہی سہارا لئے آئیں۔اُن کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا اور سانس بھی معمول سے زیادہ تیز تھی۔اس شام ماسٹر جی نے بہت کم باتیں کیں۔میں نے رُکنے پر اصرار کیا تو کہنے لگے۔

’’زندگی میں برے فرائض کو سرانجام دینے کے لئے بعض ایسی بھی ہیں جنہیں اپنی مرضی کے خلاف کرنا ہی پڑتا ہے‘‘ وہ ایسی ہی باتیں کرتے جو بظاہر مہمل ہوتیں۔مثلاً ’’ایک تھا مزدور۔۔۔۔‘‘ اور پھر خاصی لمبی کہانی سنا دیتے۔

’’کیا سمجھیں؟‘‘ انہوں نے مجھ سے اچانک پوچھا۔

’’مستقل مزاجی‘‘

''بالکل ٹھیک''، انہوں نے زور دے کر کہا''تم اچھے نمبر لے کر کامیاب ہوگی۔یاد رکھنا''

اور مجھے ان پر رحم سا آنے لگا۔آپا کی نیم وا آنکھیں اُن کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔اور پھر جاتے وقت وہ اور تھکے تھکے نظر آنے لگے۔جیسے کچھ دیر آرام کرنا چاہتے ہوں۔یا کسی کشمکش میں مبتلا ہوں۔پھر اُٹھے۔کچھ منٹ کمرے کی تصویروں کو گھورا۔کچھ سوچا اور پھر سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے چلے گئے۔

کئی ماہ بیت گئے!

اور پھر ایک روز اکرم کی معرفت اچانک اطلاع ملی کہ وہ دو ہفتہ کے لئے گھر آئے ہیں۔روزانہ شام کو پڑھانے آیا کریں گے۔امی اکرم پر برس ہی تو پڑیں۔نئے ٹیچر کی موجودگی میں صرف دو ہفتہ کے لئے اُن کی کونسی خاص ضرورت تھی۔اُس سے کس نے کہا تھا کہ لوگوں سے یونہی ملتا رہے اور اُن کے یکطرفہ پیغام گھر پہنچانے لگے۔ٹیچر آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔بن بلائے مہمان کی طرح چمٹ تو نہیں جایا کرتے۔میں نے امی کا خوب ساتھ دیا آپا کوثر چپ چاپ سوئیٹر بنتی رہیں۔کبھی کبھار دزدیدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ لیتیں۔اچھی طرح بات کرنا تو وہ جانتی ہی نہ تھیں۔اس کے علاوہ وہ کرتیں بھی تو کیا؟اور پھر ایک روز گھر کی فضا یکلخت مکدر ہو گئی۔ماسٹر جی کا عید کارڈ ابا میاں کے ہاتھ لگ گیا۔کارڈ کیسے آیا؟ کیسے بھیجا گیا؟امی اور ابا میاں میں کئی روز یہی تلخ بحث ہوتی رہی۔ابا میاں کے لہجے میں بے حد ناراضگی تھی۔ان کے چہرہ پر نفرت اور غصہ کے آثار تھے۔اکرم کو گھر آنے سے منع کر دیا گیا۔اور پھر ایک روز امی نے بتایا کہ اگلے ہفتہ خالہ کے ہاں سے آپا کوثر کی بارات آرہی ہے۔یہ سب کچھ ایسے ہو رہا تھا جیسے کسی روحانی فرض کی ادائیگی کی جا رہی ہو۔ایک اداسی مسلط تھی۔دبی دبی سرگوشیاں تھیں۔مبہم مبہم اشارے تھے اور آپا کوثر کے ہونٹوں پر ابدی چپ تھی۔نہ جانے کیوں مجھے پہلی مرتبہ یہ احساس ہونے لگا کہ بہاریں بیت چکی ہیں۔پت جھڑ کا آغاز ہو چکا ہے اور طوفان آنے والے ہیں۔

شادی سے ایک رات پہلے آپا کوثر مجھے اپنے کمرے میں لے گئیں۔وہ نڈھال سی نظر آرہی تھیں۔پیشانی سرخ تھی۔چال میں گہری تھکن کے آثار تھے۔اندر سے دروازہ بند کر کے انہوں نے سرہانے سے ایک آسمانی رنگ کا خط اٹھایا اور مجھے دے دیا۔''اسے پڑھ لو'' وہ بہت آہستہ گنگنائیں۔

یہ ماسٹر جی کا خط تھا جو انہوں نے آپا کے پہلے اور شاید آخری خط کے جواب میں بھیجا تھا۔ساتھ ہی آپا کا خط تھا۔چند سطریں تھیں۔

''میرے کندھے ابھی اپنا بھی بوجھ نہیں اٹھا سکتے کوثر۔جذباتیت میں بہہ کر تمہارے مستقبل کو تاریک نہیں کر سکتا۔زندگی کے ہر قدم پر میری دعائیں تمہارے ساتھ رہیں گی۔تمہاری شادی کی اس اہم تقریب پر، تمہاری مستقبل کی زندگی کو محفوظ بنانے کے لئے، تمہاری امانت لوٹا رہا ہوں۔اس سے قیمتی اور کوئی چیز نہیں جو پیش کر سکوں۔اسے ہی تحفتاً قبول کر لینا۔''

تحریر میں گفتار سے بھی زیادہ سنجیدگی تھی۔اپنے متعلق کچھ بھی تو نہ لکھا تھا۔آپا کوثر دیوار کا سہارا لئے کھڑی تھیں۔ان کا سر مینٹل پیس پر جھکا ہوا تھا۔چہرے پر گہری زردی تھی۔انکی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے ابھر آئے۔انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پھول مرجھا گئے ہوں، تند ہواؤں نے مناظر کی جوانی لوٹ لی ہو، سازوں کے نغمے رُک گئے ہوں۔

آپا کوثر نے مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں''تمہارے سوا مجھے کوئی بھی تو نہیں جانتا۔ہمیں ایک ہی ماں نے جنم دیا ہے۔تم اتنی سطحی تو نہیں ہوسکتیں۔میرے دکھ درد میں شریک ہو جاؤ۔یہ بجھتے دیئے تمہاری موجودگی میں جلے تھے۔ان پھیلتے اندھیروں میں اب ساتھ نہ چھوڑ جاؤ۔''

میں لرز اٹھی تھی۔نفرت و بیگانگی کا وہ جذبہ جسے ابھی تک یونہی پال رکھا تھا، یکلخت بدل گیا۔دل میں ہمدردی کی شدید لہروں کو میں نے پہلی مرتبہ محسوس کیا اور زندگی میں پہلی دفعہ ایک نیا احساس، ایک نیا جذبہ اور ایک نئی چبھن لئے اپنی آپا سے یوں لپٹ گئی جیسے مدت سے بچھڑی ہوئی تھیں یا جیسے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانا ہو۔

وداع ہوتے وقت آپا کوثر کے چہرے پر زردی کی گہری تہیں تھیں۔آنکھوں میں جان سوز تلخیاں تھیں۔امی سے چمٹتے وقت سسکیاں بھرنے لگیں۔ابا سے بغلگیر ہوتے وقت ہلکی ہلکی چیخیں سنائی دیں اور مجھ سے لپٹتے وقت سسکیاں رک گئی تھیں۔گرم اور موٹے موٹے آنسوؤں کی روانی انتہا پر پہنچ چکی تھی۔وہ یوں کانپ رہی تھیں جیسے روح سے علیحدہ ہوتے وقت جسم لرز اٹھتا ہے۔اور پھر باجوں کے شور میں، گیتوں کی لہروں پر امنگوں کی لاشوں سمیت وہ بھی چلی گئیں۔

کتنی بہاریں آئیں۔کتنے بھنوروں نے مدھر گیت گائے۔شاخوں پر کلیاں پھوٹیں۔دھرتی کے سینے سے کائنات کے ذرے ذرے میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔عشق نے خود کو حسن کی بارگاہ میں پیش کیا۔ساکن زندگی میں نغموں نے جنم لیا اور پھر یہ بہاریں بھی بیت گئیں۔پھول مرجھا گئے۔حدت کے الاؤ سرد پڑ گئے۔تند ہواؤں نے ہر چیز کو پامال کر کے رکھ دیا۔سازوں میں نغمے ٹھہر گئے، ڈوب گئے یا کہیں کھو گئے۔سبزے مرجھا گئے اور زرد سایوں نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

آپا کوثر چند روز کے لئے گھر آتی ہیں تو دوپہر کو پلنگ پر دراز ہو کر پوچھنے لگتی ہیں''ریڈیو کی آواز میں تھرتھراہٹ سی کیسی ہے؟''اور میری نظریں سامنے پڑے ہوئے خالی صوفے کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔جہاں وہ روزانہ بیٹھا کرتے تھے اور نغمے تھرتھراتے محسوس ہوتے تھے۔مجھے ایک بھیانک خاموشی کا احساس ہونے لگتا ہے۔مینٹل پیس پر مزین شیشہ اسی طرح پڑا ہے جہاں وہ کبھی کبھی بال سنوارا کرتے تھے۔برسات کی بھیگی رات کو جب گلی میں پانی ہی پانی پھیل جاتا ہے اور ننگے پاؤں گزرنے والے چھپ چھپل۔چھپل چھپ، کرتے سنائی دینے لگتے ہیں تو آپا یکلخت خاموش ہو جاتی ہیں۔شاید منتظر ہوتی ہیں کہ ابھی کوئی کہے گا'' کیچڑ میں ننگے پاؤں چلنے سے

کتنی راحت محسوس ہوتی ہے''اور کوئی ساتھی ناراضگی سے جواب دے گا''عجیب احمق ہو۔ایسا راستہ تھا تو مجھ پر تو رحم کیا ہوتا''لیکن ایسی کوئی بھی آواز نہیں آتی۔گلیاں سنسان ہیں۔ایک بھیانک سناٹا ہے اور شدید تنہائی ہے۔

نہ جانے ماسٹر جی زندگی کے کن کٹھن راستوں پر تنہا بھٹک ہو رہے ہوں۔شاید ان کے ساتھ کوئی نہ ہو جو ننگے پاؤں چلنے میں راحت محسوس کر سکے۔یا شاید انہیں خود ہی ننگے پاؤں چلنے سے کراہت آنے لگی ہو۔فضائیں اُن کے مختصر سے فقروں کی ابدی مسرتوں سے محروم ہو چکی ہیں۔اس بیٹھک میں اُن کے درد بھرے الفاظ کی چاشنی ابھی تک موجود ہے۔اس صوفے میں ان کے جسم کا لمس ابھی تک پنہاں ہے۔آپا کوثر کو ان سیڑھیوں سے خوف آنے لگا ہے اور اس فرش پر یوں چلتی ہیں جیسے قدم قدم پر کانٹے ہوں۔

''کوئی بھی تو نہیں جانتا کہ ہم کون ہیں، کہاں جا رہے ہیں اور کب تک ساتھ رہیں گے''

میرے کانوں میں کوئی زور زور سے چیختا ہے۔

بہاریں آتی ہیں اور خزاؤں کو جنم دے کر چلی جاتی ہیں۔کسی اَن جانے دیس کو شاید افق کے اُس پار جہاں نہ پت جھڑ ہے، نہ تند ہوائیں۔نہ زرد سائے ہیں نہ خاموش چیخیں۔میں ہوں کہ بس دیکھتی رہتی ہوں اور سوچتی رہتی ہوں!

چند روز سے ماسٹر جی ہمارے محلے سے گزرنے لگے ہیں۔بے ترتیب سے کپڑے پہنے ہوتے ہیں۔ہمارے دروازے کے قریب آتے ہی ان کے قدم یوں سست پڑ جاتے ہیں جیسے ابھی رُک جائیں گے۔جیسے سفر ختم ہو چکا۔اب منزل آ گئی ہے۔پھر ہماری دہلیز کو گھورتے ہیں اور یکلخت تیز تیز قدم اٹھاتے چلے جاتے ہیں۔جیسے ان کا کیا تعاقب کیا جا رہا ہو۔یا جیسے ابھی اور سفر باقی ہو۔اور میرا جی چاہتا ہے کہ وقت کو واپس گھما دوں اور جب وہ قریب سے گزرنے لگیں تو ان کو آواز دوں:

''آیئے! ہم کب سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔آپا کوثر کو آج بالکل بخار نہیں''

لیکن ایسا بھی کبھی ہوا ہے؟ ایسا کبھی ہونے دیا گیا ہے؟

گلی میں بچے شور مچاتے کھیل رہے ہیں۔دودھ والے کی دوکان پر سلگتی لکڑیوں سے اُٹھتا دھواں فضا میں دھندلکوں کے جال سے بُن رہا ہے۔سرمئی رنگ کے بے رنگ سے اور غیر واضح۔۔۔جو ہواؤں کے دوش پر بکھر اس وسعتوں میں سما جائیں گے۔

آپا کوثر کی شادی ہوئے کئی برس گزر چکے ہیں۔

نہ جانے کتنے ماسٹر جی زندگی کی اداس راہوں میں تنہا بھٹک رہے ہوں۔مخصوص جگہوں پر ان کے قدم رُکتے رُکتے پھر یوں تیزی سے حرکت کرنے لگتے ہوں جیسے ازل سے یہ قدم یونہی چلتے آئے ہیں اور ابد تک یونہی چلتے رہیں گے۔

☆☆☆

رحیم انجان (کینیڈا)

اندھیروں کا سفر۔۔۔!

بیرونی دروازے کے تالے میں چابی گھمائے جانے کی آواز سن کر میں نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا۔صبح کے پانچ بجے کا عمل تھا۔''او مائی گاڈ'' کہتے ہوئے میرے چہرے پر شرمندہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔جیسے میں کوئی چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہوں۔فیصل آنکھوں سے نیند چھلکاتا ہوا گھر میں داخل ہوا، وہ رات کی شفٹ میں کام کر کے آیا تھا۔اُس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور کہا۔''آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔۔؟''میں نے اپنے سامنے رکھے کاغذات کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔''کچھ پروف ریڈنگ کا کام تھا ،جس میں لگ کے وقت کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔۔''

''اتنی ہی محنت اگر آپ کسی اور کام۔۔۔''میری آنکھوں میں دُکھ کی پر چھائیاں دیکھ کر فیصل نے اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا اور وضاحتی لہجہ ختیار کرتے ہوئے کہا۔''میرا مطب ہے، آپ کو کھانے کا ہوش ہے، نہ سونے کا اور نہ ہی اپنی صحت کا، آپ ایک ایسے کام پر محنت کر رہے ہیں، جس کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔اندھوں کے شہر میں آئینے بنانے سے کیا فائدہ۔۔؟

''لیکن۔۔۔'' میں نے کچھ کہنا چاہا، لیکن فیصل نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔''دنیا کی ساری زبانوں میں اُردو سب سے زیادہ بدنصیب زبان ہے کہ جس کے وارث اسے خرید کر پڑھنا پسند نہیں کرتے۔۔''

فیصل (جسے ہم گھر میں پیار سے مون کہتے ہیں)۔۔میرا بھتیجا ہے۔میرے انتہائی عزیز بھائی کی نشانی۔۔مجھے اُس کے ادبی ذوق اور تخلیقی صلاحیتوں پر بڑا اعتماد ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہم دونوں اکثر دوستوں ہی کی طرح بات کر لیتے ہیں۔آج بھی جب مجھ سے اس کی بات کا کوئی معقول جواب نہ بن پڑا تو میں نے زچ ہونے والے انداز میں کہا۔''یار چھوڑو بھی، اور یہ دیکھو۔! پاکستان کے''گولڈن جوبلی نمبر''کے لئے یہ ٹائٹل کیسا رہے گا۔۔؟ میرے چہرے پر ایک اعتماد بھری فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

''میں دیکھ چکا ہوں۔'' فیصل کے اندر کا نقاد بیدار ہو کر اُس کی آنکھوں سے تانک جھانک کرنے لگا۔اُس نے سرسری نظر سے ٹائٹل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بابائے قوم کی بہت ہی نایاب تصویر ہے ، جسے پینٹ کرنے کیلئے بڑی اعلیٰ فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا گیا ہے اور

ٹائٹل پر چاروں صوبوں کی تہذیبی جھلکیوں کے باڈر نے اسے چار چاند لگا دئے ہیں، لیکن۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ میں نے تجسس بھری نظروں سے فیصل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔'' مون بیٹا! بولو، بولو، لیکن کیا۔۔؟

'' آپ نے یہ تصویر رنگین کیوں بنوائی ہے۔۔؟

'' فیصل!'' میں نے دکھ بھری حیرت کے ساتھ فیصل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔'' بھئی! یہ پاکستان کا 'گولڈن جوبلی نمبر ہے۔۔''

'' وہ تو ٹھیک ہے، پاکستان کا 'گولڈن جوبلی نمبر' تو ہے یہ۔۔'' فیصل نے اپنے لہجے میں ملائمت پیدا کرتے ہوئے کہا۔'' لیکن آپ اِس کا خرچہ کہاں سے پورا کریں گے۔؟'' اُس کے اس سوال کا جواب میرے پاس تھا، مگر میں اپنے جواب پر کوئی منفی تنقید سن کر وقت سے پہلے ہی مایوس نہیں ہونا چاہتا تھا، میں نے سوچ رکھا تھا جو میگزین مفت میں آٹھ ہزار کے قریب اُٹھ جاتا ہے۔ رنگین ٹائٹل، معیاری مضامین اور افسانوں کے ساتھ نوئے سینٹ فی کاپی کے حساب سے، کیا دو تین ہزار کے قریب بھی نہیں اُٹھے گا۔؟ اپنے سوال کے جواب میں مجھے خاموش پا کر فیصل اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں بھی تھکے تھکے انداز میں کاغذ سمیٹنے میں لگ گیا۔ فجر کی نماز پڑھنے کیلئے میری بیوی کے اُٹھنے کا وقت ہو رہا تھا۔ میں اُس کے جاگنے سے پہلے ہی سو جانا چاہتا تھا۔

میرے سبھی گھر والے'' ملاقات'' کی اشاعت کی مخالفت پر کمر بستہ تھے۔ اُن سب کی ایک ہی رٹ تھی۔'' اتنی محنت اگر آپ کسی اور کام پر کریں تو اچھے خاصے پیسے بنا سکتے ہیں۔

ایک دن تو گھر بھر میں میرے خلاف اچھا خاصا ہنگامہ ہو گیا۔ ہوا یوں کہ میں کچھ اشتہاروں کے سلسلے میں کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی بیوی نے ایک فون میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔'' یہ صاحب عید کے شمارے کیلئے آپ کو پورے صفحے کا اشتہار دینا چاہتے ہیں۔'' میں نے خوشی خوشی اُس نمبر پر فون کیا اور یہ جان کر کہ وہ ہنڈی کا کاروبار کرنے والے لوگ ہیں، اشتہار لینے سے انکار کر دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ سارا گھر ایک طرف اور میں تن و تنہا ایک طرف، جس کی بات سننے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ بس ایک فیصل تھا جو ایک کونے میں اپنے سامنے چائے کان پیالہ رکھے خاموش بیٹھا میری طرف دوستانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرائے جا رہا تھا۔ بیوی نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔'' مون! تم بھی تو کچھ بولو، کیا تمہارے چچا کو اِس اشتہار سے انکار کرنا چاہیے تھا۔۔؟'' اُس نے شرارت بھری نظروں سے اپنی چچی کی طرف دیکھتے ہوئے۔'' بالکل بھی نہیں۔'' کہنے کے بعد، فیصل نے میری طرف دیکھا اور کسی کامیاب سفارت کار کی طرح اپنا کانٹا بدلتے ہوئے کہا۔'' ماں! (وہ چچی کو ماں اور مجھے ڈیڈ کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔'' ڈیڈ بے چارے بھی کیا کریں۔'' پاکستان دوستی'' کو اِنہوں نے شروع ہی سے اپنی ادارتی پالیسی کا حصہ بنا رکھا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں، اپنی اِس ادارتی پالیسی کے ساتھ یہ ہنڈی کا اشتہار کیسے شائع کر سکتے ہیں۔؟ فیصل نے چند لمحے سوالیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھنے کے بعد کہا۔'' آپ کو تو اِس اشتہار

کے بارے میں آج اتفاقیہ معلوم ہو گیا ہے۔ یہ تو شروع ہی سے ہنڈی کے اشتہاروں سے انکار کرتے آ رہے ہیں۔'' اُس کی اِس بات کے جواب میں بیوی نے کیا جواب دیا، میں سنے بغیر ہی ڈائنگ ٹیبل سے اُٹھ کے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

میں اڑھائی تین برس پرانی باتوں میں گم تھا کہ میرے حواس پر نیند نے اپنی زلفیں بکھیر کے میری سوچوں کا تسلسل توڑ دیا اور میں نے یہ سوچتے ہوئے خود کو نیند کے حوالے کر دیا کہ صبح پریس بھی جانا ہے۔

میری تین چار ماہ کی محنت رنگ لائی اور پاکستان کا گولڈن جوبلی نمبر چھپ کے مارکیٹ میں آ گیا جسے ادب سے لگاؤ رکھنے والے لوگوں نے بہت پسند کیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ اتنے محدود وسائل کے ساتھ اِس سے بہتر گولڈن جوبلی نمبر شائع ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بشیر خان ہمارے شہر کے ایک معتبر ٹی۔ وی پروگرام پرڈیوسر ہیں۔ انہوں نے بھی '' ملاقات'' کے گولڈن جوبلی نمبر کی اپنے پروگرام میں اچھی خاصی تعریف کی اور مجھے ، جیسے اپنی محنت کا پھل مل گیا، میں بہت خوش تھا۔۔

ایک دن میں جیرارڈ اسٹریٹ (ٹورونٹو کا انڈین بازار) پر پان کی ایک دوکان پر کھڑا تھا کہ ایک صاحب آئے۔ اُنہوں نے دوکاندار سے پانچ پان بنانے کیلئے کہا۔ اور ہاتھ بڑھا کر'' گولڈن جوبلی نمبر'' کی ایک کاپی اُٹھا لی۔ وہ مجھے نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے جی بھر کے'' گولڈن جوبلی نمبر'' کی تعریف کی۔ یہاں تک کہ جتنی دیر دوکاندار پان بناتا رہا وہ الٹ پلٹ کر گولڈن جوبلی نمر کو دیکھتے اور اُس کی تعریف کرتے رہے۔'' اِس میگزین میں پڑھنے کا مواد تو ہمیشہ ہی اچھا ہوتا ہے لیکن اِس بار تو بابائے قوم کی فل کلر میں تصویر اور تصویر کے گرد چاروں صوبوں کی تہذیبی جھلکیوں کا باڈر شائع کر کے رحیم انجان صاحب نے خوب پیسہ خرچ کیا ہے۔'' اُن کے پان بن گئے تو انہوں نے'' گولڈن جوبلی نمبر'' کو بغل میں دباتے ہوئے اپنے والٹ سے پانچ ڈالر کا نوٹ نکال کر دوکاندار کی طرف بڑھایا تو دوکاندار نے کہا۔'' جناب نوے سینٹ اور دیجئے۔۔'' اُن کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور انہوں نے نوئے سینٹ کیلئے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے دوکاندار سے پوچھا۔'' کیا پان کی قمت بڑھا دی ہے آپ نے۔؟'' دوکاندار نے جواب دیا۔'' پان کی قیمت تو وہی ہے، البتہ اِس بار اِس خصوصی نمبر کی قیمت نوئے سینٹ رکھی گئی ہے۔'' دوکاندار کا یہ جواب سن کر اُنہوں نے ایک لمبی سی'' اووو۔۔'' کے ساتھ گولڈن جوبلی نمبر واپس رکھ دیا اور مُنہ میں پان رکھتے ہوئے چلتے بنے۔۔

اِس واقعہ نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میں تمام رات اپنی تین ماہ کی محنت کو صفحہ بہ صفحہ دیکھتا رہا کہ آخر اِس میں کیا کمی رہ گئی ہے جو ایک پڑھا لکھا آدمی اِس کی اتنی دیر تعریف کرنے کے باوجود اس کے لئے صرف نوئے سینٹ تک دینے کیلئے بھی تیار نہیں ہوا۔؟ اُس رات میں ایک لمبی پرواز لے کر پاکستان پہنچ گیا۔ راولپنڈی کے صدر بازار (جہاں کبھی پاکستان ٹائمز کا آفس ہوا کرتا تھا) میں ایک کتابوں کی دوکان ہوا کرتی تھی۔ جس کی خصوصیت یہ تھی کہ

وہ بہت ہی معیاری کتابیں انتہائی سستے داموں پر فراہم کیا کرتے تھے۔ میں کچھ کتابوں کی تلاش میں خاص طور پر وہاں پہنچا۔ اُس دوکان کی جگہ ایک تکے کباب کی دوکان دیکھ کر یہ سمجھا کہ وہ کہیں کسی بڑی جگہ پر منتقل ہو گئے ہوں گے۔ لیکن اڑوس پڑوس کے پرانے دوکانداروں سے یہ جان کر مجھے بہت دکھ ہوا کہ وہ دوکان خسارے کا شکار ہو کر ختم ہو چکی ہے۔

میں اپنی ناکامیوں کا الزام حالات یا مختلف حیلوں بہانوں سے دوسروں پر رکھنے کا مریض نہیں ہوں، میں اپنی ناکامی کا الزام، اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں اور محنت کی کمی پر رکھتے ہوئے، خود میں مزید محنت کرنے کی ہمت پھونکتا رہتا ہوں اور اپنی ہر ناکامی کے پیچھے اپنی کوتائیاں تلاش کرنے کی کوشش کیا کرتا ہوں۔ لیکن پان کی دوکان پر پیش آنے والے واقعہ اور ڈیڑھ دو برس پہلے پنڈی کے صدر بازار میں کتابوں کی دوکان کی جگہ تکے کبابوں کی دوکان کے قیام والے قصے نے میری سوچ کا رخ ہی موڑ دیا۔

''اتنی ہی محنت اگر آپ کسی دوسرے کام پر کریں تو آپ اچھے خاصے پیسے کما سکتے ہیں۔۔'' یہ جملہ کسی ''ریکنگ بال'' کی طرح آہنی جذبوں پر مشتمل میری پہاڑ جیسی شخصیت کو توڑنے پھوڑنے لگا۔ میں نے اس جملے سے بچنے کیلئے اپنی زندگی کو دو شفٹوں میں بانٹ دیا۔ ایک شفٹ ٹی۔وی دیکھنے یا پڑھنے کیلئے اور ایک لمبی تان کر سونے کیلئے۔ ایک قومی ادارے نے گولڈن جوبلی نمبر کا Back Page فل کلر کے ساتھ ایک ہزار ڈالر میں خریدا تھا اور بعد میں پیسے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ جس انکار کے سبب پریس کے میری طرف طرف بارہ سو ڈالر کے قریب بقایا رہ گئے تھے۔ قومی ادارے کے مینجر کے انکار اور پان کی دوکان والے واقعہ نے مل کر مجھے مایوسیوں کے اندھیروں میں دھکیل دیا تھا۔ یہاں تک کہ وقت کے کتنے ہی چھوٹے بڑے پیمانے، میں نے بن پیئے ہی خود پر سوار مایوسیوں کی کیفیت کے دامن میں انڈیل دئے۔

''بھئی! کہاں ہو۔۔؟'' میرے دوست احباب فون کر کے پوچھتے۔ ''نہ ہی خود نظر آ رہے اور نہ ہی تمہارا 'ملاقات'۔۔''

''کچھ دنوں سے بیمار پڑا ہوں۔۔'' میں اپنی بیماری کا عذر پیش کر دیتا۔ دو ہی مہینوں میں، اپنی فرضی بیماری کے ذکر اور دو شفٹوں میں بے مقصد سی زندگی سے بھی میں تنگ آ گیا۔ روزمرہ کے کاموں سے مُنہ موڑ کے بیٹھ جانے کے سبب اندھیروں کی چھوٹی چھوٹی دیواریں، پھل پھول کے پہاڑ بن چکی تھیں۔ ایک دن میں نے اپنی بکھری ہوئی ہمتوں کو یکجا کرتے ہوئے اپنے ٹیبل کی طرف دیکھا، جہاں بڑی بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے کاغذات کا ایک انبار لگا ہوا تھا۔ جس کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے سوچا۔ ''اندھیروں کے اِس پہاڑ کو، کہاں سے کاٹنا شروع کروں۔۔؟ میرے دل و دماغ سے کم ہمتی اور مایوسیوں کے بادل اُٹھ اُٹھ کر، مجھ پر حملہ آوّر ہونے لگے، جن کا شکار ہو کر میں گم سم سا ہو کر پھر سے بستر میں دبک گیا۔۔ پھر ایک دن، ٹی۔وی کے سامنے بیٹھے بیٹھے اچانک

ٹی۔وی بند کر کے میں کھڑا ہو گیا۔

''دت تیرے کی۔۔'' میں نے خود کو کوستے ہوئے سوچا۔ ''یہ بھی کوئی بات ہوئی، ایک آدمی کے انفرادی روّیے سے مایوس ہو کر تم ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے ہو، اگر تمہارے ایک قومی ادارے کے مینجر نے، تمہارا بل دینے سے انکار کر دیا ہے تو لعنت بھیجو اُس پر، وہ سالا تو تھا ہی چور۔ تمہارے سامنے اُس پر محکمانہ آڈیٹرز کی ٹیم بیٹھی اور وہ شہر سے ذلیل و خوار ہو کے نکلا ہے۔'' میرے خون میں حرارت کی اک لہر سے دوڑ گئی، میں نے اک نئے عزم واستقلال کے ساتھ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اُٹھو! اور اپنے ہاتھوں میں پڑی ہوئی مایوسیوں کی ہتھکڑیوں کو کاٹ دو۔۔'' دیکھتے ہی دیکھتے چند ماہ سے، مجھے اپنی آغوش میں دبوچے ہوئے کم ہمتی اور مایوسی کے اندھیروں کے پہاڑ، روئی کے گالوں کی طرح کٹ کٹ کر فضا میں بکھرنے لگے۔ یہاں تک کہ مجھے اپنے سر پر آسماں اور آگے بڑھنے کیلئے راستہ نظر آنے لگے۔۔

دیکھتے ہی دیکھتے میری ٹیبل پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے کاغذات کا انبار صاف ہو گیا اور ''ملاقات'' ایک بار پھر مارکیٹ میں نظر آنے لگا۔ میرے دوستوں نے، مجھے صحت یاب ہو کر روزمرہ کی زندگی کے دھارے میں شمولیت پر مبارکبادی کے فون کئے اور میں اپنے میگزین پر پہلے سے بھی زیادہ محنت کرنے لگا۔

مارچ کا مہینہ تھا اور شہر میں قرار دادِ پاکستان کی تقریبات کا ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ کہیں تیس پچاس ڈالر کی ٹکٹ پر ڈنر ہو رہے تھے تو کہیں میلے۔ چونکہ میلے کی ٹکٹ ذرا کم تھی اس لئے میں ایک میلے میں چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس میلے میں ایک کتابوں کا سٹال بھی ہے۔ جس پر لوگوں کا اچھا خاصا ہجوم ہے، کتابوں کی دوکان پر ہجوم دیکھتے ہوئے یہ سوچ کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ اگر مال صاف ستھرا اور معیاری ہو تو شہر میں صاحبِ ذوق لوگوں کی کمی نہیں ہے۔'' میں اُس بک سٹال کے مالک کو جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ اپنے سٹال پر بڑی معیاری اور دنیائے اسلام کے سبھی قد آوّر علمائے دین اور مورخین کی کتابیں رکھتے ہیں۔ میں خوشی خوشی بک سٹال کی طرف بڑھنے لگا۔ بک سٹال کے قریب پہنچ کر یہ دیکھنے کے بعد کہ وہ ہجوم بک سٹال کے پڑوسی سٹال پر حلیم نان خریدنے والوں کا ہے۔ مجھے دُکھ کے بجائے اِک گونا گوں خوشی و مسرت ہوئی، میں اپنے میگزین کی ناکامی کا الزام اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں پر رکھتا چلا آ رہا تھا۔ اُج میں نے خود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔'' رحیم انجان! تم تو خواہ مخواہ اپنی ناکامیوں کا دوش، اپنی محنت اور صلاحیتوں پر رکھ کے خود کو ہلکان کرتے رہتے ہو۔ اُس بک سٹال پر رکھی ہوئی کتابوں کے معیار کو دیکھو اور اِکا دکا خریداروں کے مقابلے میں، حلیم نان کی دوکان پر ہجوم کو دیکھو۔ اُس دن مجھ پر اپنی ناکامیوں کے راز کا کھل جانا ہی، میری منزل بن گیا۔ میں نے اپنی محنت اور لگن پر تمسخرانہ انداز میں ہنستے ہوئے سوچا۔ ایسے کام پر محنت اور خرچ کرنے سے کیا فائدہ جس کا کوئی پرسانِ حال ہی نہ ہو، اگر محنت ہی کرنی ہے تو کہیں حلیم نان کی دوکان کھول لو، نان چھولے بیچنے شروع کر دوَ۔ اُس رات میں بڑی مدت کے بعد سکون کی نیند سویا، جیسے کوئی مسافر اپنی

منزل پر پہنچ کر لمبی تان کے سوتا ہے۔

''حضرت عمرؓ ابن خطاب کا قول ہے۔''میرا بہترین دوست وہ ہے جو میرے عیب، مجھے تحفے میں بھیجتا ہے۔'' اگر آپ اپنی تحریر کو اپنے قارئین میں کسی عزت مندانہ مقام پر پہنچانا چاہتے ہیں تو اپنے مخلص دوستوں کی تنقید کو اہمیت دینا سیکھیں اور مسئلہ اس بات کو نہ بنائیں کہ کیا لکھا جائے۔۔؟ مسئلہ اس بات کو بنائیں کہ کیا نہ لکھا جائے۔۔؟

مکمل ذات اللہ سبحان وتعالیٰ کی ہے۔عقلِ کل کا دعویٰ کوئی بھی ذی الشعور انسان نہیں کر سکتا اور جو کرتا ہے، اُس پر ترقی کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔تعمیری تنقید کو ہمیشہ خندہ پیشانی سے لینا چاہیے اور اپنی کسی غلطی پر نہ صرف شرمندہ ہونا چاہیے اُس سے کچھ سیکھنا بھی چاہیے۔ورنہ ؑایسی شرمندگی کس کام کی۔؟ کہ آپ شرمندگی کا اظہار بھی کریں لیکن دل و دماغ میں زہریلے پھوڑے نہ صرف پالتے رہیں، وقتاً فوقتاً وہ زہریلے پھوڑے، اپنے فن پاروں میں پھوڑتے بھی رہیں۔۔۔صحافت کے کچھ اصول ہوتے ہیں، جن میں سے کسی کی تحریر کو، خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو، صاحبِ تحریر کی اجازت کے بغیر نہ چھاپنا بھی ایک بنیادی اصول ہے۔چونکہ اُس خط میں میرے کام کی تعریف کی گئی تھی۔میں نے اُن کی اجازت کے بغیر ہی وہ خط چھاپ دیا۔جب اُنہوں نے شکایت کی کہ آپ نے تو میرا خط چھاپنے کے لئے مجھ سے پوچھا تک نہیں۔تو مجھے اُن پر بہت غصہ آیا میں نے اپنے طور پر ملاقات میں اُن کا خط چھاپ کر اُنہیں عزت دی تھی اور اپنی اِس غلطی کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا کہ میں نے اُن کا خط چھاپنے کے لئے اُن سے پوچھا تک نہیں۔میں نے بڑے بدمزہ لہجے میں کہا۔ٹھیک ہے جناب! میں اگلے شمارے میں معذرت چھاپ دوؤں گا۔اُنھوں نے بڑے ہی دوستانہ لہجے میں جواب دیا۔''ارے نہیں بھئی! جو ہونا تھا وہ ہو گیا، اب آپ کو معذرت چھاپنے کی بالکل بھی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اگر آپ نے معذرت چھاپی تو میں سمجھوں گا کہ آپ نے مجھے معاف نہیں کیا۔'' وہ اپنے جائز اعتراض پر بھی شرمندہ شرمندہ نظر آ رہے تھے۔

وہ میری نوجوانی کا دور تھا، اپنے لکھے ہوئے کو میں کبھی تنقیدی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔نہ صرف یہ کہ لکھنے کے آداب سے ناواقف تھا، اِس خوش فہمی میں بھی مبتلا تھا کہ میں ایک ہی نشست میں جو چاہوں لکھ لیتا ہوں اور بہت اچھا لکھ لیتا ہوں۔میں نے اُن صاحب کے اُس دوستانہ رویے کو، اُن کی کمزوری اور اُن کی درخواست پر معذرت نہ چھاپنے کو بھی اپنی برتری کے کھاتے میں ڈال دیا۔لیکن مجھے اپنا یہ چھوٹا پن بالکل بھی نظر نہیں آ رہا تھا کہ میرے دل و دماغ میں اُن کے خلاف زہریلے پھوڑے کسی خودرو بیل کی طرح بنتے اور میری تحریروں میں پھوٹتے رہتے ہیں۔ میں اپنی تحریروں میں اُن زہریلے پھوڑوں کے پھوٹنے کو بھی اپنی فنی صلاحیتوں سے تعبیر کیا کرتا تھا۔

(رحیم انجان کے مشہور کالم **نویدِ ملاقات** ''اپنا لکھا مٹا دینا، بہت مشکل ہوتا ہے'' سے اقتباس

بحوالہ اردو پوائنٹ ڈاٹ کام)

محمد حامد سراج (میانوالی)

افسانہ نگار نے بہت دیر کر دی

افسانہ نگار کو یہ افسانہ بہت سال پہلے لکھ لینا چاہئے تھا۔

بہت دیر کر دی اس نے

اب تو فضا میں آکسیجن کی جگہ صرف بارود کی بو ہے اور مشرق کی پوری نسلِ انسانی کو اسی بارود کی بو میں سانس کھینچنا ہے۔ہوا کا رخ یہ بتاتا ہے کہ آنے والے دنوں میں فضا میں آکسیجن کی جگہ صرف بارود لے لے گا۔

قلم میں بھی روشنائی کی جگہ اب بارود ہے۔

الفاظ بھی بارود میں ڈھل رہے ہیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ایک طالع آزما صدام حسین نے کویت کو تاراج نہیں کیا تھا۔

یہ ان لمحوں کی کہانی ہے جب امریکہ نے کویت سے عراقی افواج کو نکالنے کے بہانے ابھی دو درجن سے زائد مما لک کے اشتراک کے ساتھ بغداد پر چڑھائی نہیں کی تھی۔

یہ کتھا اس وقت کی ہے جب ابھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر سینہ اٹھائے کھڑا تھا۔اس کے انہدام نے دنیا کی کیمسٹری نہیں بدلی تھی۔ابھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ملبے سے اٹھنے والے دیوہیکل جنگی جہازوں نے افغانستان کی اینٹ سے اینٹ نہیں بجائی تھی۔

یہ اس ساعتِ بے اماں سے بھی پہلے کی بات ہے جب نام نہاد اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی دھجیاں اڑا کر امریکہ اور انگلستان نے ہنستے بستے عراق کو ابھی کھنڈرات میں نہیں بدلا تھا۔

یہ اس عہد کی روداد ہے جب ابھی شام، ایران اور پاکستان کی دیواروں پر جنگی پرندوں کا خوف نہیں منڈلایا تھا۔

اس وقت راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔

یہ ان دنوں کا قصہءِ پارینہ ہے جب اہلِ مغرب بارود تیار کر رہے تھے اور مشرق کی دنیا پرفیوم کی خوشبو میں مدہوش اپنے آپ سے بیگانہ تعیش کی پگڈنڈی پر سرپٹ بھاگی جا رہی تھی۔اسے یہ ہوش ہی نہیں تھا کہ وہ پلٹ کر دیکھتی کہ مغرب پسِ پردہ کیا کر رہا ہے۔

افسانہ نگار تلاشِ روزگار میں کویت کی سلیٹی سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا تھا۔

وہ گھر سے ملازمت کی تلاش میں صبح دم نکلتا۔ بلند و بالا عمارات کے سامنے اپنے آپ کو بونا محسوس کرتا' انہی بلند و بالا عمارات میں اسے اپنے حصے کا رزق تلاش کرنا تھا۔ وہ جب بڑی بڑی دیو قامت مارکیٹوں میں لمحے بھر کو رکتا تو اس کے دماغ کے خلیوں میں سوالات چیونٹیوں کی طرح ایک قطار باندھ کر چلنے لگتے۔ پہلے روز اس نے ایک ساتھی سے پوچھا تھا

یہ سوق کے کیا معنی ہیں۔۔۔؟

مارکیٹ کو عربی میں سوق کہتے ہیں۔

جس سوق سے بھی اس کا گزر ہوتا وہ حیرت اور استعجاب سے ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتا۔انسانی تعیش اور آرام کا وہ کون سا سامان تھا جو یہاں میسر نہیں تھا۔مغرب نے سارا سامان عربوں میں انڈیل دیا تھا۔اور ہر چیز کے عوض وہ اپنی معیشت کی بنیاد میں ایسی کنکریٹ ڈال رہے تھے جو'ان کی آنے والی نسلوں کو بھی سنوار دے۔کویت کا ہر شہری الف لیلوی دنیا میں رہتا تھا۔وہاں کے عام شہری نے بھی اپنے گھر کو محل میں بدل لیا تھا۔

اونٹ قصہ پارینہ ہو کر صرف ''ثمونے'' میں قیمے کے کام آتا تھا۔وہاں نیرو چین کی بانسری بجاتا تھا۔تعیش ہی حاصلِ زیست تھا۔ ہفتہ وار تعطیل کے روز کویت کے ساحل خوبصورت اجسام کی مدہوش کر دینے والے نسوانی خوشبو سے مہکتے تھے۔عرب امراء دادِ عیش کے دل دادہ ساحل کنارے ایئر کنڈیشن خیموں میں نوخیز کلیوں کے جسم کے زاویوں میں کھو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے۔جسم کی خوشبو انہیں اس حد تک مدہوش کر دیتی کہ وہ بھول ہی جاتے کہ کسی روز کوئی اور نامانوس خوشبو بھی ان کا مقدر ہو سکتی ہے۔

وہ تیل بیچتے اور آرام خریدتے تھے۔۔۔۔

زمین پر ہی انہوں نے جنت بسالی اور شداد کی جنت کا انجام بھول گئے۔۔۔۔!

افسانہ نگار سارا دن سڑکوں کی خاک چھانتا اور رزق تلاش کرتا تھا۔

وہ رزق کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے جب شاہراہوں سے گزرتا تو اس کے اندر موجود کیمرہ سارے عکس محفوظ کرتا چلا جاتا۔ وہ سوچتا یہ عکس کیوں محفوظ ہو رہے ہیں۔۔۔۔؟ یہ سڑے کنارے جو بڑے بڑے نارنجی رنگ کے ڈرم رکھے ہیں ان میں تو کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا ہے۔ یہ عرب امراء کے محلات میں کام پر متعین خادمائیں کہیں بھولے سے تو

ان میں روٹی' چاول اور سالن نہیں ڈال جاتیں۔

ایک دن اس نے جرات کر کے ایک خادمہ سے پوچھ ہی لیا

یہ اتنا بہت سا سالن' روٹی اور چاول کا دیگچہ اس ڈرم میں الٹتے ہوئے تمہیں خوف نہیں آتا۔۔۔؟

یہ کام تو میں روز کرتی ہوں

اس خادمہ کے ایک فقرے نے افسانہ نگار کو لرزا دیا'' وہ سوچ کی وادی میں جا اترا۔کیا واقعی انسان گناہ کا عادی ہو جائے تو اس کی حسیات مر جاتی ہیں۔قرآن کا کہا سچ ہے کہ ہم دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔آج اس نے مہر اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تھی۔ وہ اپنے اندر بھی جھانک رہا تھا۔کیا قطرہ قطرہ سیاہی دل کو اپنی لپیٹ میں تو نہیں لے چکی۔۔۔؟

اس نے جھرجھری لی۔۔۔

اسے اپنی دھرتی یاد آئی۔اس کے سامنے اس کی دادی کا چہرہ ابھرا۔اسے اس کی دادی نے روٹی کا ٹکڑا کھانے کے دوران ہاتھ سے گر جانے پر دوبارہ جھاڑ کر' چوم کر کھانا سکھایا تھا۔دستر خوان پر روٹی کے باقی ماندہ ٹکڑے اور ریزے چیونٹیوں کے بل پر ڈالنے سکھائے تھے کہ یہ ان کا رزق تھا۔بچی کھچی ہڈیاں ایک کونے میں ڈالنی سکھائی گئی تھیں جو گھر کی بلیوں کا حق تھا۔

یہ کام تو میں روز کرتی ہوں۔۔۔۔۔

خادمہ تو ایک علامت ہے۔ یہاں رزق کی بے حرمتی روز کا معمول ہے۔ہائے یہ چاول کے دیگچے' یہ روٹیاں اور یہ گوشت کا عمدہ سالن۔۔۔ہائے ہائے۔۔۔اسے کیوں مٹی میں رول دیا۔کہیں ترتیبِ وقت میں ایسا وقت نہ آجائے کہ ساری قوم روٹی کے ایک لقمے کو ترستی قطار باندھے اپنی باری کا انتظار کھینچ رہی ہو۔افسانہ نگار سوچتا اور کڑھتا رہا۔ وہ اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

اس وقت مغرب بارود تیار کر رہا تھا۔۔۔

اور عرب تیل بیچ کر پرفیوم خرید رہے تھے۔

خوشبو دونوں کی مدہوش کر دینے والی تھی۔مغرب بارود کی خوشبو اور مشرق پرفیوم کی خوشبو میں مدہوش تھا۔

اہلِ مشرق اپنی خواب گاہیں مہکا کر سدھ بدھ کھو بیٹھتے اور پرفیوم کی مہین دیوار کے اس پار کا منظر ان کی نظروں سے اوجھل رہتا۔ان کو یہ فرصت ہی نہیں تھی کہ وہ خبر رکھتے کہ وقت کو کروٹ لینے میں کتنی دیر ہے۔

راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔

آنے والا کل کس نے دیکھا ہے۔۔۔؟

افسانہ نگار بے روزگاری کے ہاتھوں تنگ آ چکا تھا۔

اس نے بجلی کی ایک دکان پر اپنے آپ کو مصروف کر لیا۔اسی وطن واپسی کے لئے زادِ راہ کی ضرورت تھی۔اسے

معمولی تنخواہ پر ملازمت مل گئی اور وہ اس پر ربِ کریم کا شکر گزار تھا۔ اس دکان پر ملازمین کی تعداد چار تھی۔ وہ اوزار تھامے سارا دن گاہک کا انتظار کھینچتے۔ جیسے ہی کوئی Complaint موصول ہوتی وہ اپنے اوزار تھامے کام پر نکل جاتے۔ ان کو گھر گھر جانے اور کام کرنے سے وہاں کے لوگوں کا بود و باش' طرزِ رہائش اور انداز و اطوار کا تجربہ ہوتا۔ افسانہ نگار کو جب حساب کر کے مہینے کی پہلی تاریخ کو تنخواہ دی گئی تو وہ ربِ کریم کے سامنے سر بہ سجود ہو گیا۔ گانٹھ لگے سلیپر ایک طرف رکھ کر اس نے نئے سلیپر خریدے۔ کپڑوں کا ایک جوڑا' قلم کاغذ اور دوسری اشیائے ضرورت کا سامان اپنے کمرے میں لا رکھا۔

اسے اس کے ساتھیوں نے محنت جاری رکھنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ ایک شاندار مستقبل سامنے کھڑا ہے۔ حالانکہ وہ کہیں بھی نہیں کھڑا تھا۔ وہ یہ بات ماننے کا تیار ہی نہیں تھا۔ جب وہ اس کے اندر نہیں کھڑا تھا تو وہ دوسروں کے کہنے پر کیسے مان لیتا۔

اس کے اندر ایک ہی خواہش بار بار سر ابھارتی کہ وہ اپنے وطن لوٹ جائے۔

کیا اپنی دھرتی پر یہ آسائشات میسر آ جائیں گی۔۔۔؟ وہ سوچتا

ایرکنڈیشن کار' بجلی کی ایسی سہولت کہ موسم گرما میں ایرکنڈیشنر دن رات چلتا رہے۔ اشیائے خورد و نوش کی ایسی فراوانی کہ مہمان کی آمد بھی گراں نہ گزرے۔ لیکن مجھے تو یہ سب نہیں چاہئے' میں ایسا کیوں سوچ رہا ہوں۔۔؟

مجھے تو دو وقت کی روٹی چاہئے اور وہ میری دھرتی پر بہت ہے۔ اس بنجر صحرا میں تو سایہ دار درخت دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ اس ریگزار میں تو تنہائی نے ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔ یہاں دادی اماں اور نانی اماں کی بوڑھے برگد ایسی ٹھنڈی چھاؤں نہیں ہے۔ میرے گاؤں میں تو شرینہہ کا درخت تھا اور یہاں بس کہیں کہیں دور صحرا میں جنگلی کیکر کی جھاڑیاں نظر آ جاتی ہیں۔

مجھے سنجیدگی سے لوٹنے کا فیصلہ کرنا چاہئے۔۔۔

افسانہ نگار وطن واپسی کے لئے پائی پائی جوڑتا رہا۔

اور ہزاروں میل کی مسافت پر مغرب بارود جوڑتا رہا۔

اہلِ مشرق سامانِ تعیش جوڑتے رہے۔

افسانہ نگار ایک روز جب اس کی جیب میں وطن کو لوٹنے کا کرایہ تھا۔ اس نے واپسی کی راہ لی۔

ابھی اس نے اسلام آباد ایرپورٹ پر زمین کو چوما ہی تھا کہ اسے اپنی پشت پر جہاز کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ وہ سمجھا جہاز نے رن وے پر اپنا رخ تبدیل کیا ہے۔ لیکن وہاں تو کئی سال سرک چکے تھے اور وہ لاہور ایرپورٹ پر کھڑا تھا۔۔۔!

افسانہ نگار نے سوچا یہ میرے ساتھ ہوا کیا ہے۔۔۔؟

میں ایک ہی جست میں یہاں کیسے پہنچ گیا ہوں۔۔؟

اس نے ایک شخص سے پوچھا

بھائی یہ لاہور ایرپورٹ ہی ہے نا۔۔۔؟

آہو۔۔۔ جی۔۔!

لیکن آج اتنا زیادہ رش کیوں ہے۔۔۔؟ کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔

وہ جی عراق پر امریکی حملے کے بعد پاکستانی اپنے گھر آ رہے ہیں نا۔۔۔

افسانہ نگار نے اپنے آپ سے سوال کیا۔۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو۔۔۔۔؟

مجھے کیا معلوم میں کیا کر رہا ہوں۔

تم تو پہلے سے موجود ہو پھر پریشان کیوں ہو۔۔۔؟ کہیں اندر بہت گہرے اندر سے آواز آئی۔

یہاں کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ جانے کس دیس کو سدھار گئے۔ سارے اہلِ دانش' سائنس دان' سیاست دان' علماء' سکالرز' حکمران اور سرفروش۔۔۔۔!

سب نے بہت دیر کر دی

اور ادھر عراق کے قصبے ناصریہ میں عرقی افواج کتنی دیر امریکی سیلابِ بلا کا مقابلہ کریں گی۔۔۔؟

افسانہ نگار ابھی کابل' قندھار اور قندوس کے بارے سوچ ہی رہا تھا۔

کہ اس کی سماعت سے جیو ٹی وی کے عملے کی آواز ٹکرائی

کویت سے آئی ہوئی فلائیٹ سے اترتے مسافروں کو گھیر کر ان سے سوال کئے جا رہے تھے۔

جو وہاں کی سرزمین ہی چھوڑ آئے تھے۔۔۔ وہ کیا خبر دیتے۔

وہ تو ایک ہی داستان سنا رہے تھے کہ جب ہمارا جہاز فضا میں بلند ہوا تو ایک ہی خوف تھا ہمیں' کہیں کوئی امریکی میزائل ہمارے جہاز کو نہ آ لے۔ ان کو کیا خبر قندوس' قندھار' مزار شریف' کابل اور قلعہ جنگی جیسے ہولناک ترین واقعات کے بعد اب ناصریہ' بغداد' موصل اور کربلا پر کیا گزرنے والی ہے۔۔۔؟

وہ تو شانت تھے کہ انہوں نے جان کی امان پائی

اور افسانہ نگار نے باہر نکل کر ایئر پورٹ کی تیز روشنیوں کے درمیان سے آسمان کو دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کی نگاہ ناکام پلٹ آئی۔

اچانک اسے ایک خیال آیا۔

اس نے اپنی جیب میں رکھے قلم کو غور سے دیکھا۔ شاید اس میں اب روشنائی کی جگہ بارود ہو۔۔۔؟

اس نے قلم جیب سے نکال کر دیکھا۔

بارود تو اپنی جگہ قلم میں تو روشنائی بھی نہیں تھی۔

اس نے قلم جیب میں واپس رکھا۔ایک ٹھنڈی سانس لی۔

اس کا جسم تڑخا۔۔۔

اس نے فضا میں گہری سانس لی

بغداد میں امریکی ٹینک داخل ہوئے۔۔۔۔

اس نے قلم جیب سے نکال کر دیکھا۔

بارود تو اپنی جگہ' قلم میں روشنائی بھی نہیں تھی۔

اس نے قلم جیب میں واپس رکھا۔ایک ٹھنڈی سانس لی۔

اور اپنے آپ سے مخاطب ہوا۔۔اور کہا

افسانہ نگار تم نے بہت دیر کر دی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

☆☆☆

''شاعری تو ایسی بھی ہوتی ہے جو نعرے ہی کے زور پر چمکتی ،گرجتی ہے مگر کہانی ایسی چھوئی موئی ہے کہ نعرے کا پرچھاواں بھی پڑ جائے تو مرجھا جاتی ہے۔ پھر کہانی کیا کرے۔ایک طرف جنگ ہے، دہشت گردی ہے، بنیاد پرستی ہے، کلاشنکوف ہے، ایٹمی دھماکے ہیں، نظریات ہیں، جن کی چھتری میں سرگرمیاں اخلاقی جواز حاصل کرتی ہیں۔دوسری طرف اس کے خلاف نعرے ہیں، خطبے ہیں، تقریریں ہیں، چکی کا ایک پاٹ وہ، دوسرا پاٹ یہ۔ جمعیت خاطر کی کوئی صورت ہی کہاں ہے۔کہیں نہیں۔۔۔۔یہ تو وہی سودا والا زمانہ آ گیا اس سے بھی برا۔ نئے بٹ مار، نئے قزاق، لوٹے ہیں دن رات بجا کر نقارہ۔نفرت کا بول بالا، حرف محبت عنقا، کلام نرم و نازک بے اثر۔کیسی شاعری، کہاں کی کہانی، دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے۔کبیر رویا، سودا نے زہر خند کیا۔ادھر قلم رک گیا۔اب میں دُبدا میں ہوں۔اس قسم کی دُبدا جو داستانوں کی کہانیوں میں وقتاً فوقتاً مہم جو شہزادے کو آ لیتی ہے کہ پیچھے کھائی، آگے سمندر، نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ پھر کیا کیا جائے۔بس اچانک خواجہ خضر نمودار ہوتے ہیں کہ میری انگلی پکڑ اور چل۔یا کوئی غیبی آواز آتی ہے کہ لوح کو پڑھ اور جو اس میں لکھا ہے اس پر عمل کر۔ میرے پاس کونسی لوح ہے۔ ہاں ہاں ہے۔الف لیلہ۔ میرے پاس یہی لوح ہے۔لوح کہو، فکشن کا اسمِ اعظم کہو۔''

انتظار حسین ۔بحوالہ سہ ماہی توازن مالے گاؤں۔شمارہ ۳۹ (مئی تا اگست ۲۰۰۳ء۔ص ۱۵۲

ڈاکٹر بلند اقبال (کینیڈا)

کارٹون

محمد شجاع دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا، کمرے میں ہمیشہ کی طرح اندھیرا تھا ،ایک لمحے کے لیے اُسے خیال آیا کہ بتی جلائے مگر پھر اس خیال سے کہ بابا کو روشنی سے وحشت سی ہوتی ہے اُس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔بابا ہمیشہ کی طرح چارپائی پہ بیٹھا سر جھکائے زمین کو تک رہا تھا۔کندھوں پہ سفید سوتی چادر سر کو ڈھکتی ہوئی چارپائی کے کناروں کو چھو رہی تھی۔کمرے میں کہنے کو ایک گہری خاموشی تھی مگر ماحول میں سکون کم، وحشت زیادہ تھی، ایسی وحشت جو کسی کے مرنے سے پہلے یا فوراً بعد ہوتی ہے۔محمد شجاع، بابا کے قریب آیا اور اُس کی چارپائی کے قریب اُکڑوں ہو کر بیٹھ گیا اور پھر اُس نے آہستگی سے بابا کے جھریوں بھرے کانپتے ہوئے ہاتھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔'بابا میری مدد کرو نا'۔ وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔'دیکھو نا بابا میں کتنا پریشان ہوں، یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ کیسی عجیب سی بیماری مجھے ہو گئی ہے جس کا علاج کسی حکیم کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں اور جب بھی میں کسی سے اس کا تذکرہ کرتا ہوں تو لوگ مجھ پہ ہنستے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ جیسے میں اُن سے مذاق کر رہا ہوں'۔بابا' مگر تم تو میرے باپ ہو نا، تم تو مجھے بچپن سے جانتے ہو، اب تو میں بھی پچاس برس کا ہو چلا ہوں۔میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے'۔ تمھے پتہ ہے بابا ،محمد شجاع نے اپنے باپ کے کان میں سرگوشی کی 'میرے اندر ایک کارٹون رہتا ہے۔ہاں بابا ایک کارٹون، جیتا جاگتا کارٹون، ناچتا گاتا، اچھلتا پھاندتا، مجھے منہ چڑانے والا کارٹون۔ بابا وہ کارٹون ہو بہو میری شکل کا ہے۔میرا جیسا ناک نقشہ، میری ہی جیسی ادائیں۔وہ اچانک مجھ میں سے نمودار ہوتا ہے۔تمھیں پتہ ہے بابا پہلی بار میں نے اُسے کب دیکھا تھا۔ میں مسجد سے نماز پڑھ کر نکل رہا تھا، میرے ہاتھوں میں تمھاری ہی دی ہوئی تسبیح تھی جس کے دانوں کو پڑھتا ہوا میں گھر آ رہا تھا کہ اچانک یہ کارٹون مجھ میں سے نکل کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا اور پھر مجھے دیکھ کر زور زور سے تالیاں بجانے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے اُس کی دم لمبی ہو گئی ہے اور شکل بندر جیسی اور پھر ایسے لگا جیسے کہہ رہا ہو یہ ساری نمازیں پڑھ کر بھی تو مجھے بندر جیسا لگتا ہے۔ہاں بابا یہ ٹھیک ہے میں ضرورتوں اور خواہشوں کا محتاج ہوں، میں بھی مصلحتوں کا مارا ہوا انسان ہوں، آسائشوں کا طلب گار ہوں، مجھ میں نمائش ہے، ظاہر داری ہے، میں غیبت بھی کرتا ہوں، رشوت بھی لیتا ہوں اور جو وقت پڑے تو دوسروں کا مال بھی کھا جاتا ہوں۔مگر بابا پھر میں دن رات عبادتیں بھی تو کرتا ہوں، اور ہاں بابا تمھیں پتہ ہے جب میں روز صبح قرآن شریف کی تلاوت کرتا ہوں، تو یہ کم بخت کارٹون مجھ میں سے نکل کر کسی طوطے کی شکل میں ڈھل جاتا ہے اور پھر مجھ

سے ٹیں ٹیں کر کے کہتا ہے تو کتاب پڑھ کر بھی طوطے جیسا لگتا ہے کیونکہ تو اُسے طوطے ہی کی طرح تو پڑھتا ہے' اور پھر وہ اپنی کریہہ آواز سے زور زور سے دُہراتا ہے۔۔'تجھے معنی مطلب سے کیا مطلب، تجھے معنی مطلب سے کیا مطلب'۔۔'اور بابا جب میں روزے رکھتا ہوں تو یہ کارٹون میرے پیٹ کا کیڑا بن جاتا ہے اور اندر سے میرے خالی پیٹ کو ڈھول کی طرح بجاتا ہے اور کہتا ہے جیسا دماغ ویسا پیٹ، بابا تمھیں کہو اگر میرے پڑوسی بھوکے سوتے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور، میں تو روزے کی پیاس جنت میں دُودھ کی نہروں سے بجھانا چاہتا ہوں۔ بابا مجھے بتاؤنا ،آخر یہ کارٹون مجھ سے کیا چاہتا ہے، تمھیں پتہ ہے بابا کل رات اس نے کیا حرکت کی؟ کل رات یہ کہیں سے ایک ترازو لے آیا اور وہ بھی ایک پلڑے کا۔اور پھر مجھ سے چیخ چیخ کر کہنے لگا تیری زندگی محض ایک پنساری کی دوکان ہے اور پھر مجھے دیکھ کر پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنستا اور قلا بازیاں کھاتا ہوا اچانک نظروں کے سامنے سے غائب ہوگیا۔اور پھر یکا یک کوئی بھوت بن کر آ گیا اور چیخ کر کہنے لگا۔۔ترازو کے ایک پلڑے پہ تیری عبادتیں اور دوسرا پلڑا جیسے بھوت۔۔بابا مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔کچھ کہونا بابا میں کیا کروں؟ کیسے اس کم بخت کارٹون سے نجات پاؤں'۔اور یہ کہہ کر محمد شجاع دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔کچھ دیر بعد بابا نے آہستہ سے اپنا سر اُٹھایا۔محمد شجاع نے دیکھا بابا کی سفید پلکوں پہ آنسو چمک رہے تھے، اُس کا چہرہ جیسے کسی اندرونی کرب سے کانپ رہا تھا۔ بابا نے روتے ہوئے کہا۔'بیٹا تو مجھ سے کیا پوچھ رہا ہے میں تو خود ہی ایک۔۔۔۔۔

اور محمد شجاع کو اچانک لگا جیسے اُس کے باپ کی روتی ہوئی شکل ہو بہو اُس کے کارٹون جیسی ہی تو ہے'۔

☆☆☆

''اصل میں مجھے باقر مہدی کے اپنے بارے میں مختلف بیانات پڑھ کر یہ اندیشہ پیدا ہوگیا ہے کہ وہ اپنے گونا گوں تعصّبات کے چکر میں کسی ایک کھونٹے سے باندھ دینا چاہتے ہیں۔ مجھے خوب احساس ہے کہ جب سے ہمارے ادب میں تحریکوں کی وبا پھیلی ہے ادیب کسی ایک کھونٹے سے بندھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔اس میں فریقین کو سہولت رہتی ہے۔بندھے ہوؤں کو بغیر تگ ودو کے مشین سے کٹا چارہ میسر آ جاتا ہے۔دوہنے والے آسانی سے دودھ دوہ لیتے ہیں۔مگر میں کسی تحریک کا ڈنگر نہیں، کوئی نظریاتی جانور نہیں۔نظریوں سے مجھے دلچسپی ہوسکتی ہے۔کسی مرغوب نظریے کی تبلیغ کی خواہش بھی ہوسکتی ہے۔مگر اس خواہش نے مجھے کبھی اتنا حیوان نہیں بنایا کہ افسانے کو پروپیگنڈے کی سطح پر لے آنے پر تل جاؤں۔میں افسانے میں نظریے کے کاندھے پر بندوق رکھ کر نہیں چلاتا۔میرے لئے تجربے کی غلیل بہت ہے۔افسانہ اس حقیر فقیر پر خیالاتِ عالیہ کی صورت میں نازل نہیں ہوتا، واردات بن کر گزرتا ہے۔باقر مہدی نے مجھے نئے افسانے کا تمغہ عطا نہیں کیا، ٹھیک کیا۔میں اس اعزاز کا مستحق نہیں ہوں۔میں تو ماقبل تاریخ زمانوں میں بھٹکتا پھر رہا ہوں اور ان بزرگوں سے کہانی کا فن سیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں جن کا فکشن کی تاریخ میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔'' **انتظار حسین کا خط** 'نئے افسانہ نگار کے نام'

وزیر آغا (لاہور)

کیوں دُکھ اوڑھ کے بیٹھے ہو!

کیوں دُکھ اوڑھ کے بیٹھے ہو
کیا سوچ رہے ہو
دُھند کو دیکھو
اُس نے اپنے سارے تھان سمیٹ لئے
پھوؤں کو دیکھا
اپنے اپنے
شاخوں اور پتّوں کے معبد
سب نے چھوڑ دیئے
کلیاں، دیکھو
کیسے کِھل کر پھول بنیں
اور بچے ہاتھ چھڑا کر
گھر سے دوڑ گئے
بھونرے، خوشیاں، نغمے، سب آزاد ہوئے
کیوں دُکھ اوڑھ کے بیٹھے ہو
تُم دُکھ کی میلی گدڑی پھینکو
آسمان کو دیکھو
تم بھی۔۔۔آسمان کو دیکھو!!

وزیر آغا

رات کے پچھلے پہر!

رات کے پچھلے پہر جب نیند
بیداری کو اپنے روبرُو پا کر
اُکھڑتے سانس لیتی ہے
سیاہی کے تسلسل کی طنابیں ٹوٹتی،
درزوں کے لب دو نیم ہوتے ہیں
تو ان درزوں سے قیدی خواب
کیڑوں کی طرح باہر نکلتے ہیں
شکستہ، ریختہ
صدیوں پرانی خواہشوں کے
ہر طرف بکھرے
مغلظ، اشتہا انگیز ریزے
چنتے پھرتے ہیں!!

حمایت علی شاعر (کراچی)

ایک نظم

دیدۂ نم، دلِ آشفتہ بختوں کی توہین
شکوۂ غم، تپشِ جذبِ دروں کی توہین
دامن چاک، شعورِ غمِ دل کی تحقیر
پاسِ اِدراک، تقاضائے جنوں کی توہین
دل کو آزادِ رسومات کروں یا نہ کروں

کیسی گھمبیر اُداسی ہے فضا پر طاری
کتنی سنسان نظر آتی ہے دنیا ساری
ذہن ساکت، نظر آوارہ، سخن بے مفہوم
کس کو معلوم یہ لمحات ہیں کتنے بھاری
نذر کچھ اشکوں کی سوغات کروں یا نہ کروں

اب کہ یہ دہر، بجز حدِ نظر کچھ بھی نہیں
اب کہ یہ زیست، بجز دردِ جگر، کچھ بھی نہیں
اب کہ ہر صبح ہے اک شعلۂ بے دُود کا نام
اب کہ ہر شام بجز دیدۂ تر، کچھ بھی نہیں
اب بھی میں دل کی مدارات کروں یا نہ کروں

صادق باجوہ (امریکہ)

انانیت

مری انا ہی مرے راستے کا پتھر ہے
اسی کے دامِ فسوں ساز میں پھنسا ہوں میں
یہ وجہِ کبر و غرور و تفاخرت بھی ہوئی
اسی سے پیدا دلوں میں مغایرت بھی ہوئی
اسی سے مہر و وفا کی کٹی ہیں زنجیریں
تمام الٹی اسی سے ہوئیں ہیں تدبیریں
اسی نے مجھ کو نکالا تھا عرشِ بالا سے
اسی نے راندۂ درگہ بنا دیا تھا مجھے
حصارِ ذات میں محصور کر دیا مجھ کو
خود اپنے آپ سے بھی دور کر دیا مجھ کو
اسی کے دامِ فریب و مکر میں ہو کے اسیر
میں اپنی ذات کے نشّے میں چور ہوتا رہا
میں دور دور خلاؤں سے بھی ورے جا کر
مقامِ پیکرِ انساں سے دور ہوتا رہا
مرا وجود کہاں کھو گیا خبر ہی نہیں
انا نے ٹکڑے جدا کر دئے اثر ہی نہیں

آفاق صدیقی (کراچی)

فوقیت

ہوا یہ چاہتی ہے
فوقیت حاصل ہو اس کو
آگ، مٹی اور پانی پر
وہ جب چاہے جلا دے یا بجھا دے
آگ مٹھی میں رہے اس کی
وہ مٹی کو کبھی اوجِ فلک دے
کبھی فرشِ زمیں پر
اپنے پاؤں سے مسل دے
وہ پانی کو کبھی بادل کبھی بارش بنائے
یہ مٹی آگ پانی اور ہوا
سب اپنی اپنی فوقیت کی دھن میں رہتے ہیں
کبھی پانی کے چھینٹے
آگ پر قبضہ جماتے ہیں
کبھی مٹی کو اپنے ساتھ لہروں میں بہاتے ہیں
یہ مٹی جو بظاہر خاکساری کی علامت ہے
دہکتی آگ کے شعلوں کو اکثر داب لیتی ہے
جو سینہ تان لے
سیلاب کو بھی روک دیتی ہے
بپھر جائے تو یہ مٹی کبھی آندھی کبھی طوفاں
ذرا سی ایک چنگاری
بھڑک اٹھے تو شعلہ ہے
یہ شعلہ
جب دہکتی آگ بن جائے
تو جو بھی سامنے ہو
اس کو خاکستر بنائے
مگر اس فوقیت کی حشر خیزی
عناصر ہی پہ کیا موقوف رکھنا
ہم انسانوں میں بھی
اس فوقیت کے روپ اور بہروپ
کتنے ہیں؟

آفاق صدیقی

شہرِ آذر بتا!

چشمِ پرنم لیے
اس کی یادوں کے اصنامِ دلگیر کو
آج دیکھا ہے یوں لب کشا
غم کا زہراب تازہ پیئے
بیتے لمحوں کی رنگیں دھنک چھوڑ کر
فکر و احساس کا 'ابرِ نیساں' گیا
موجِ ہستی 'صدف در صدف'
ڈھونڈتی پھر رہی ہے اسے
کون اس سر پٹکتی ہوئی موج سے یہ کہے
دامنِ دید کی دسترس میں مَیں نہیں
تیرے دامن کا جو انمول موتی گم ہو گیا
چاک داماں کیے
سازِ دل کی قبائے جنوں
ایک خوابِ پریشاں کی تعبیر ہے
دم بخود ہو گیا ہے 'گریباں' کہ کیا ہو گیا
بھیگی پلکوں پہ جلتے ہوئے آنسوؤں کے دیئے
کہہ رہے ہیں شبِ تار سے
اس کے خونِ جگر سے جو فکر و نظر کو ملی
وہ نکھرتی ہوئی روشنی
اپنے سورج کے اس دکھ بھرے سوگ میں
آج پہنے ہے پیراہنِ تیرگی

اے سکوتِ الم
کس اندھیرے کی آغوش میں سو گیا
اس گل اندام سورج کو کیا ہو گیا
شہرِ آذر بتا !
تیرا آذر کہاں کھو گیا

☆☆☆☆☆

(مصطفیٰ زیدی کی یاد میں)

ناصر زیدی (اسلام آباد)

عجب اِک سانحہ سا ہو گیا ہے!

میں اُس سے ہر روز ہی ملتا
اُسے سامنے بٹھاتا
مسلسل تکتا رہتا
وہ بھی بال بکھرائے
عجب ناز و ادا سے
قیامتیں ڈھاتی رہتی
اور میں اندر سے ٹوٹتا بکھرتا رہتا
دِن یونہی لمحوں میں گزرتے گئے
مگر کب تک؟
مسافر کو ایک روز جدا تو ہونا ہی تھا
اگلے روز روانگی سے پہلے
آدھی رات کو فون کیا تو
اُس کی خواہش تھی رُک جاؤں
کل پھر مل لیں

میں بھی ایسی ہی خواہش رکھتا تھا لیکن
آنکھ میں کاجل پھیلتے آخر دیکھتا کیسے؟
بوجھل دل سے
بغیر ملے، بغیر بات کیے
بغیر الوداع کہے، چلا آیا
اور اب یوں لگتا ہے جیسے
کوئی سنگین خطا کر کے آیا ہوں
جسم سلامت لے آیا ہوں
اپنا باقی سب کچھ وہیں پہ
اُس کے سیمیں قدموں میں
رکھ آیا ہوں----!

محمد فیروز شاہ (میانوالی)

ایثار کے موسم میں ایک نظم

وہ فلک کے گلے میں گلوبند تھا
یا کہ مالا تھی ست رنگ ہیروں کی----------یا
آسمانوں کے آنگن میں
رنگوں کی منڈی سجی تھی--------وہ قوسِ قزح!
ہاں! وہ قوسِ قزح
کہ جس کے دھنک رنگ آنچل کو اوڑھے
اُفق سج گیا دلہنوں کی طرح!
جمالِ فلک کی یہ ثروت
مری آنکھ اور میرے دل کی ریاست
میں---'فاتح کی صورت جو اتری
تو میں نے یہ سوچا
کہ رنگوں کی یہ اصل اور نسلِ حقیقی ہے کیا
تب یہ مجھ پر کھلا
کہ جب روشنی آ کے لمحوں کی دہلیز پر
خود کو قربان کر دیتی ہے سر بسر
تو اجالے کی قربانیوں کا ثمر
رنگ و رعنائی کا یہ طلسمی ہنر
فتح کرتا ہے دنیائے قلب و نظر!

اور مسرّت بھی تو روشنی کی طرح
ہے سخّی -------اور ایثار کی مدّعی!
میں نے دیکھا ہے اکثر کہ جب بھی خوشی
غمگساری کی چوکھٹ پہ واری گئی
تو سکوں سا ملا قلبِ مضطر کو بھی
صحنِ گل میں سفیرِ بہار آ گیا
سایۂ گل میں بیٹھے ہوئے یوں لگا
جیسے خوشبو کی رُت پر نکھار آ گیا!
یوں خوشی ایک خوشبو کا پیکر بنی
روشنی ٹوٹ کر رنگ میں ڈھل گئی
اور خوشی
اپنی جاں، اپنا تن وار کر
زندگی کے نئے ڈھنگ میں ڈھل گئی
مطمئن قلب کے انگ میں ڈھل گئی!!!

عارف فرہاد (راولپنڈی)

موج میں آ کر ہم دونوں مٹ جائیں

پہلے دن ہی
آپ اپنی پوشاک پہن کر
میں نے وقت کو مار دیا تھا
یہ ہی وجہ ہے
صدیوں کے اس لمبے سفر میں
میں باطن اور تُو ظاہر تھا
تجھ کو تیرا اپنا ظاہر چاٹ گیا ہے
اور میں اندر کی آنکھوں سے
پیاس کے دریا پی کر پھیل گیا ہوں
دیکھ میں کتنا پھیل گیا ہوں
تیرا بوڑھا اور ادھورا جسم مجھے اب کیا ڈھانپے گا
اب تو میرا اندر ظاہر ہونے لگا ہے
ہو سکتا ہے اب کے بار اندر کی آنکھیں
مجھ کے پی جائیں
اور پھر موج میں آ کر یوں لہرائیں
ہم دونوں مٹ جائیں !
انانیت

رؤف خیر (حیدرآباد۔دکن)

دہشت پسند

یہ مصنوعی بندوق لے کر
سڑک پر نہ جا میرے بیٹے
مِرے دیش کے یہ بہادر جواں
ان کھلونوں سے واقف نہیں ہیں
کہیں تجھ پہ دہشت پسندی کا لیبل نہ لگ جائے
اور ان کے سینوں پہ اک اور تمغہ نہ بڑھ جائے !

رکھشا بندھن

یہ کس کو بھائی بنا رہی ہو؟
تمھیں درندوں سے کیا بچائیں گے
خود درندے ہیں !

فیصل ہاشمی (ناروے)

وقت کی دھول ہوں مَیں

مجھے اب یقیں ہو چلا ہے
میں خلقت سے پیچھے کہیں رہ گیا ہوں
اور اب میں زمانے کے قدموں سے
اپنے قدم کو ملانے کی کوشش میں تھک بھی چکا ہوں
جہاں بھیڑ میں
لوگ ہنستے چلے جا رہے ہیں
وہاں پر
سڑک کے اُس اگلے کنارے پہ رُک کر
فلک پر رواں
بادلوں سے الجھتی
کئی خواب بُنتی نظر
کے تماشے میں مشغول ہوں میں
گزرتے ہوئے وقت کی دھول ہوں میں !

ایوب راز (کویت)

آدمی تنہا کبھی پہلے نہ تھا

ایسی تنہائی کہ اپنی نبض بھی خاموش ہے
ایسا سناٹا کہ جیسے وقت پتھر ہو گیا
اب گلی کوچوں سے کوئی شور بھی اُٹھتا نہیں
اب در و دیوار سے کوئی صدا آتی نہیں
اب پرندے بھی یہاں نغمہ سرا ہوتے نہیں
مسجد و محراب بھی،
اب کے یہاں خاموش ہیں
ساری فکریں منجمد ہیں
سب دیے خاموش ہیں
آج جتنا آدمی خاموش ہے، بے جان ہے
اس قدر تنہا کبھی پہلے نہ تھا
اس قدر گونگا کبھی پہلے نہ تھا
اس قدر مُردہ کبھی پہلے نہ تھا
آدمی تنہا کبھی پہلے نہ تھا!

رفیق شاہین (علی گڑھ)

ترائیلے

تجھے سجتا نہیں دلگیر ہونا
خوشی کو رنج سے تعبیر کر
اُمیدیں حلقۂ زنجیر مت کر

تجھے سجتا نہیں دلگیر ہونا
اگر ٹوٹا بھی ہے دل کا کھلونا
تو رو کر عشق کی تحقیر مت کر

تجھے سجتا نہیں دلگیر ہونا
خوشی کو رنج سے تعبیر مت کر

سیما عابدی (امریکہ)

من وتو

اس کمرے میں اندھیرا ہے
شمع نہ ہو روشن جب تک
آنکھ کا تل بھی اندھا ہے

بچھڑے لمحے

ان وجدانی لمحوں کا
ادراک اگر ہو جاتا مجھے
تو چوم کے تیری آنکھوں کو
میں بھی جوگن بن جاتی
تیرے رنگ میں رنگ جاتی

دنیا

دنیا کتنی چھوٹی ہے!
تم تک آ کر
میرے لئے
ختم ہو جاتی ہے!

طاہر مجید (جرمنی)

اپنا اپنا کام

اس کو میرے قتل کے
جب احکام ملے تھے
اس نے مجھ کو
رحم بھری نظروں سے دیکھا
دبی ہوئی آواز میں
وہ بس اتنا بولا
''اگر میں تجھ کو قتل نہیں کرتا ہوں
میرے جیسا اور کوئی
یہ کام کرے گا
لیکن پھر میرا انجام وہی ہوگا
جو تیرا ہے''

میں نے اس سے اتنا کہا تھا
میں نے اپنا کام کیا ہے
تم بھی اپنا کام کرو!

سریندر بھوٹانی زاہدؔ (پولینڈ)

خود سے ایک سوال

وہ جو دشتِ خواہش وخواب تھا
بے آب تھا
کوئی رہگذر، نہ ہی سنگِ میل جہاں ملے
تو یہ دل کا قصہ بھی شاعری میں ہوتا کیے؟
بھلا کس سے کہتے یا پوچھتے جو محبتوں کے ہیں سلسلے
کسی داستانِ طلب میں آئے تھے جو گلے!
جو بچھڑ گیا کوئی خواب تھا
جو اجڑ گیا وہ سراب تھا
مرا خود شناسی کا سلسلہ بھی عذاب تھا
ابھی دشتِ عمر کی خامشی نے کہا مجھے
کبھی دل کے تہہ خانے میں بھی
جاتے، مگر تم نہ گئے، بے سود خاموشی
کہیں اب روح کی گہرائی میں
چھپ کر بلاتی ہے
مگر میں سوچتا ہوں اب
تجسس تو فقط وہم وگماں کا ایک صحرا ہے
تو اس صحرا میں آخر کیا کیا جائے؟

شمسہ اختر ضیا (خانپور)

موجِ آرزو

یہ آرزو ہے
کہ اپنے جذبوں کی روشنی سے تمہارے گھر میں کروں
چراغاں
یہ ہے تمنّا
کہ چاند بن کر تمہارا آنگن اُجال دوں میں
میں اپنے حصّہ کی ساری صُبحیں
تمہارے چہرے پہ آج لکھ دوں
اگر ہو بس میں
تو اپنی خوشیوں سے دامنِ دل تمہارا بھر دوں

میں اپنے گلشن کی سب بہاریں
چٹکتی کلیاں، حسین غنچے
محبتوں کے امین غنچے
تمہارے آنگن میں ڈال دونگی
کہ چاہتوں کے گلاب سے پھر
مشامِ جاں عطر بیز ہو گی
میں بن کے جگنو
تمہاری راہوں کو جگمگا دوں
تمہارے رستے کے سارے کانٹے
میں اپنی پلکوں سے آج چن لوں
تمہاری راہوں کی دھول سے میں
نہا کے افشاں سے مانگ بھر لوں
دعا ہے حق سے، سدا ہی خوشیوں کا راج پاؤ!
تمہارے آنگن میں ہو چراغاں
یہ یاد رکھنا!۔
--- میری دعائیں سدا تمہارے لیے رہیں گی!

شمسہ اختر ضیا (خانپور)

وہ خواب لمحے

وہ خواب لمحے
سُراب لمحے
حسین یادیں۔گلاب لمحے
وہ خواب لمحے
وہ جن کی یادیں امر ہیں اب بھی
وہ ساعتیں جو گزر چکی ہیں
خیال لمحے، وہ خواب لمحے
وہ فرقتوں کے عذاب لمحے
سُراب لمحے
وہ بیتی باتیں شتاب لمحے
ہوا کی صورت گزر گئے ہیں
وہ خواب بن کر بکھر گئے ہیں
بہار بن کر جو چھا گئے تھے
قرار بن کر جو آ گئے تھے
نہ جانے اب وہ کدھر گئے ہیں
وہ خواب گھڑیاں، وہ خواب لمحے
وہ عمر کے بے حساب لمحے
وہ جلوتوں کے گلاب لمحے
وہ خواب لمحے
سراب لمحے!

شمسہ اختر ضیاء (خانپور)

کڑوا سچ

میرے جذبوں میں گہرائی بہت تھی
اُدھر سے بھی پذیرائی بہت تھی
میرے ہر سمت تھے خوشیوں کے پہرے
دھنک، خوشبو، ہوا، تھا راج سب پر
بہت ہی سبز تھا اندر کا موسم
بہاریں ہر طرف بے تاب رقصاں
خیالوں میں بھی گیرائی بہت تھی
اچانک ایک دن بالکل اچانک
یہ موسم اس قدر تیزی سے بدلا
ہوا محسوس کچھ دھوکا ہوا ہے
وہ سب کچھ خواب تھا اب تک جو دیکھا
کڑی ہے دھوپ اور ناپید سایہ
وہ جو کچھ تھا مگر سچ یہ ہے شمسہؔ
کہ جو سچ سامنے ہے وہ ہے کڑوا!

شفیق مراد (جرمنی)

زندگی

دوپہر کی دھوپ میں
پتھروں کے ڈھیر پر
کوہکن بیٹھا ہوا ہے،
دُور صحرا کی طرف
زندگی کے ساز پر
مجنوں محوِ رقص ہے
زندگی ہے اس کا نام!

رات کے پچھلے پہر
بادلوں کی اوٹ سے
چاند چھپ کے دیکھتا ہے
ایک بوسیدہ گلی میں
آرزو کا اک دیا
جل رہا تھا۔۔بجھ گیا

زندگی کا اختتام!

اکمل شاکر (پسنی)

پتھر کے اُوپر پھول

آنکھوں میں کچھ خواب سجا کر
دور نگاہوں کی سرحد سے
ہجر نظارہ چلاتا ہے
آؤ۔۔۔۔۔۔۔۔۔آؤ
میری بھیگی شامیں
کب سے سورج کو الجھا کر
پچھلا رستہ بھول گئی ہیں
اس تعبیر کے بکھرے آنسو
خشک ہیں شاید
یا میں پورا پتھر ہوں۔

مسعود منور

قصیدہ

مُحی الدین عربی شیخِ اکبر
تیرے افکار سے جاں ہے معطّر
فصوص الحِکم سے روشن محافل
فضائے عشق مشکین و معنبر
درِ دل وا ترا سب صورتوں پر
چراگاہِ غزالانِ ستم گر
مسیحی راہبوں کی خانقہ تو
اِدھر عیسیٰؑ اُدھر مریمؑ کا پیکر
ترا سینہ گھبے کعبہء حجاج
گھبے تورات کی لوحوں کا منظر
تو ہے ذوقِ اِرادت میں سرافراز
رُخِ قرآن کی مدحت میں برتر
متاعِ کارِرواں ہرسمت ہر گام
قدم دینِ محبّت سے مُنّور
محی الدین عربی شیخِ اکبرؒ
خُدا آگاہ و خود آگاہ رہبر

مسعود منور

اوسلو کی ایک سڑک پر درختوں کا نوحہ

کرم داد!
بِگڈ وئےؔ ایلیے پہ کستانیہ کے برہنہ درختوں
کا نوحہ سنو گے؟
سُنو! وہ طباشیر کی برف کفنی پہن کر بہت رو رہے ہیں
سُنا ہے کوئی مر گیا ہے
وہ سورج ہے یا آسماں کا محافظ فرشتہ ہے یا اسپِ زریں
کوئی نہ کوئی برف کے گھاٹ اُترا ہے اور مر گیا ہے
خزاں آشنا فوروؔں پر
سدا سبز قامت گرانوؔں پہ
سیرؔین کی منحنی جھاڑیوں کی قطاروں پہ
چاندی کے طناز پھول آ گئے ہیں
نئی برف کے پھول زیبائیوں کا مرقع ہیں
رعنائیوں سے مُرصع ہیں
لیکن مرے پاس فطرت کی تعظیم کا وقت کب ہے
میں خود دینِ فطرت پہ قائم ہوں
ربِّ سماوات کو خالقِ دو جہاں مانتا ہوں
وہ رزاق ہے، رزق دیتا ہے
میں بھی اِسی رزق کے واسطے
صبح سے شام تک
خوک و خنزیر اور آبِ جو بیچتا ہوں
کرم داد! آؤ چلیں

مسعود منور (ناروے)

سکیچ بک

میں ہوں آذرِ شبِ ہجرِ جاں
میرا کاروبار صنم گری
مری کارگاہِ خیال میں
صنمِ سخن کی پیمبری
وہ لباسِ زیبِ برہنگی
وہ گدازِ نخوتِ شعلگی
تیرے ہونٹ چھو کے تڑپ اُٹھا
سرِ بامِ صُبح کا دھندلکا
مجھے کوئی خواب دکھا گیا

وہ اُبھار گوئے انار کے
وہ فشارِ فصلِ بہار کے
وہ کمالِ قوسِ مصوری
خطِ روئے نکہتِ عنبریں
کبھی بوسہ گردنِ نور پر
کبھی لمسِ بازوئے مرمریں
کبھی قربِ پہلوئے خشمگیں
کبھی ایک چہرا حباب سا
کہیں دور کوئی سراب سا
کوئی نقش دل کی کتاب سا
میری عشق پیشہ قلندری
تیری غمزہ غمزہ سکندری!

مسعود منور

ایک تصویر کا کیپشن

تیری تصویر کو سینے سے لگا کر رکھّا
عمر بھر کے لیے تعویذ بنا کر رکھّا
لگ نہ جائے کسی بے مہر کی مسموم نظر
تیری آنکھوں کو کتابوں میں چھپا کر رکھّا
تُو تو اِک خواب ہے راتوں میں رہا کرتی ہے
تجھ کو نیندوں کے شبستاں میں سجا کر رکھا
شعلہ بن کر تُو چراغوں میں جلا کرتی ہے
اِک دیا تیرے لیے روز جلا کر رکھّا
کانچ بِلّور میں رکھّا نہ کبھی قید تجھے
تو محبّت تھی تجھے دل میں بسا کر رکھّا
میرا چہرا تیرے چہرے ہی کا آئینہ ہے
اپنی صورت میں ترا عکس ملا کر رکھّا

☆

جانے کب عکس کا مفہوم بدل جائے گا
خواب خود اپنی ہی تعبیر میں ڈھل جائے گا

دوہے:

عتیق احمد عتیق (مالے گاؤں)

سایہ سایہ کون یہ ، مجھ پر پھیلا ہے
دامن اجلی دھوپ کا، میلا میلا ہے

میرے انگ کو بھینچ کر ایک دھنک رنگ انگ
چشمِ زدن میں کر گیا، مجھ کو بھی ست رنگ

ہووے اپنی ذات ، سے جو روشن قندیل
اپنی کمر سے باندھ کر ، لٹکاوے مندیل

گھٹتی بڑھتی چھاؤں لے، چڑھتی اترتی دھوپ
دونوں کی تحلیل سے ،متھ لے اپنا روپ

اپنی سانسیں گھول کر ، میری سانسوں میں
کون اضافہ کر گیا، دل کی پھانسوں میں

جس کا پھل چکھ کر ہمیں،چاٹے چھپتی ٹیس
اُس ممنوعہ پیڑ سے، خوش ہے بہت ابلیس

لَو دے اُٹھا آج پھر، دل کا پرانا گھاؤ
جل نہ اٹھے اس روگ سے،جسم کا سرد الاؤ

پرلے سر کے گھاگ ہیں،وہ بھی جن کے پاس
اپنی اپنی بھوک ہے،اپنی اپنی پیاس

گل بوٹے جو بو گیا، سب کے آنگن میں
کانٹے ہی کانٹے رہے،اُس کے دامن میں

لے کر سرتا سر مری نظروں سے محصول
دے نہ سکے خوشبو مگر ،کاغذ کے یہ پھول

چاہت ہو ہر رنگ کی،جن کے منتھن میں
اُن جذبوں کی پیاس ہے ،میرے تن من میں

راہ کا پتھر جان کر، یوں وہ ہٹائے ہے
پیروں سے چھو کر مجھے ،ہاتھ لگائے ہے

یادوں کو اب یوں تری، دل سے بھلانا ہیں
جیسے گگن سے توڑ کر،تارے لانا ہیں

میری اندھی آتما ،تجھ سے روشن ہے
من نین کی جیوتی،تیرا درشن ہے

دو ہرنوں کی داستاں،اگرچہ جونی ہے
لیکن ان کی ثنویت، بو قلمونی ہے

جیون ساگر پھاندنے،کاغذ کی اک ناؤ
چلی تو اس پر کردیا ،وقت نے پتھراؤ

دوہے: فراز حامدی (جے پور)

تجھ کو کچھ منظور ہے مجھ کو کچھ منظور
وقت تو اپنے ہاتھ سے لکھے ہے دستور

کیسی تیری آس ہے کیسی تیری پیاس
دوپہری میں بھی تجھے شبنم کا احساس

تو ٹھہرا معصوم دل تجھ کو کیا سمجھاؤں
پوچھنے والے میں تجھے کون سا دکھ بتلاؤں

آنکھوں سے ہونے لگیں آنکھیں جب دو چار
کشتی میں ہلچل ہوئی، چھوٹ گئے پتوار

گاؤں میں آنے لگے شہروں سے اخبار
پنگھٹ پر ہونے لگا پردیسی سے پیار

چہرے پر شرمندگی آنکھوں میں اک آس
تم کو بھی ہونے لگا اپنوں کا احساس

مجبوری اک وہم ہے مت لے اس کی آڑ
رفتہ رفتہ کھیت کو کھا جاتی ہے باڑ

کب تک تو رکھ پائے گی تن کو من سے دور
گوری تیری مانگ میں آ بھر دوں سیندور

نسرین نقاش (سری نگر)

گیت

اڑن کھٹولے بیٹھ کے ہم تم امبر پر لہرائیں
چاند کی نگری جائیں
ہم ہیں تمہارے، تم ہو ہمارے، تاروں کو بتلائیں
چاند کی نگری جائیں
جب بھی کسی نے پیار کیا ہے دنیا نے ٹھکرایا ہے
پیار کے ماروں کو دنیا نے سولی پر لٹکایا ہے
جگ کو اپنا دشمن جانیں جگ کی ہنسی اُڑائیں
چاند کی نگری جائیں
دل والوں کو ظالم دنیا پیار نہیں کرنے دے گی
پیار میں یہ جینے دے گی نہ پیار میں مرنے دے گی
توڑ کے سب دنیا کے بندھن، دنیا کو ٹھکرائیں
چاند کی نگری جائیں
لیلیٰ مجنوں کا دنیا نے دیکھا ہے انجام یہاں
پیار کے بدلے میں ملتا ہے زہر میں ڈوبا جام یہاں
پیار اس جگ میں کرنے سے تو بہتر ہے مَر جائیں
چاند کی نگری جائیں
کوئی نہ ہوگا پیار کا دشمن چاند کی روشن دھرتی پر
پیار میں جینا، پیار میں مرنا، ہوگا اپنی مرضی پر
چاند پہ تنہائی کا موسم دے گا ہمیں دعائیں
چاند کی نگری جائیں!

صبا اکبرآبادی (مرحوم)

تضمینِ غالب

خلشِ جانِ مبتلا کیا ہے　　باعثِ نالہ و بکا کیا ہے
میں بھی سن لوں کہ مدعا کیا ہے　　دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہے یہاں شوق اور وہاں پندار　　ہم رضا جو، وہ باعثِ آزار
جذب بے سود آرزو بے کار　　ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار
یا الٰہی ! یہ ماجرا کیا ہے

آرزوئیں جوان رکھتا ہوں　　دل میں اک داستان رکھتا ہوں
خامشی کا بیان رکھتا ہوں　　میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

بے خودِ حسرتِ تماشہ ہوں　　پُرسشِ آرزو پہ مرتا ہوں
گو بظاہر خموش بیٹھا ہوں　　میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

کھول دے رازِ شاہد و مشہود　　دور کر فرقِ سجدہ و مسجود
عبدیت کس لیے ہے اے معبود　　جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ محبت کے روگ کیسے ہیں　　یہ فقیرانہ جوگ کیسے ہیں
حسن کے یہ بروگ کیسے ہیں　　یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

چاک دامان و آستیں کیوں ہے　　وحشتِ عشق جا گزیں کیوں ہے
حسن کی شان دلنشیں کیوں ہے　　شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہءِ چشم سرمہ سا کیا ہے

جدید ادب

صبا اکبرآبادی (مرحوم)

تضمینِ غالب

ساغر و مُل کہاں سے آئے ہیں　　پیچ سنبل کہاں سے آئے ہیں
سازِ یہ گُل کہاں سے آئے ہیں　　سبزہ و گُل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

جو کریں روز ظلم کی تجدید　　جن کا شیوہ ہوا ہے جورِ شدید
جن کی کرتا ہے آسماں تقلید　　ہم کو ان سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

لبِ سائل پہ اور کیا ہوگا　　لفظ جو ہوگا وہ دعا ہوگا
تونے بھی غالبًا سنا ہوگا　　ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

کیا جفائیں شمار کرتا ہوں　　عشق بے اختیار کرتا ہوں
میں فقط تم سے پیار کرتا ہوں　　جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا وفا کیا ہے

ہے ستم خوردہ و حزیں غالبؔ　　رند اور میکدہ نشیں غالبؔ
تیرا عاشق ہے اے حسیں غالبؔ　　ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اصغرؔ عابد (اسلام آباد)

اکبر حمیدی سے گفتگو

سوال: ادب میں فکری تحریکوں کے حوالے سے پوچھنا ہے کہ برِصغیر میں اِن تحریکوں کے ہمارے ادبی موسموں پر کیا اثرات بنے؟ کچّے پکّے رنگ ہمارے ذھنوں میں کیا نقش گری کر سکے؟

جواب: بڑا ادب ہمیشہ کسی نہ کسی فکری تحریک سے وابستہ ہوتا ہے مثلاً آپ جانتے ہیں کہ غالبؔ تک تمام ادب سیکولر تحریک کے زیرِ اثر رہا۔ اِس وقت تک کا ادب خواہ وہ خسروؔ ہوں۔ میرؔ صاحب ہوں۔ غالبؔ ہو یا میر امنؔ کی کہانیاں ہوں۔ وہ سب ادب شعوری یا غیر شعوری طور پر سیکولرازم سے وابستہ تھا۔ خسروؔ کے محبوب نے سب چھاپ تلک چھین کر اُنہیں محض انسان کی شکل میں پسند کیا۔ میرؔ صاحب قشقہ کھینچ کر دیر میں جا بیٹھے (قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھے کب کا ترکِ اسلام کیا) اسلام ترک کرنے سے مراد علامتی انداز میں مذہبی فرقہ واریت کو ترک کرنا ہے۔ غالبؔ نے ''ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں'' کا نعرہ لگایا۔ جوش ایمان بالانسان کی ترکیب پیش کرتے ہیں۔ یہ تحریک دراصل انسان دوستی کی تحریک تھی جو برِصغیر میں صوفیاء کا ہمیشہ سے مسلک رہا ہے اور اس انسان دوستی کے ذریعے لاکھوں لوگوں نے ان کے حلقہء ارادت کو قبول کر لیا تھا۔ یہی انسان دوستی مذھبوں، ملّتوں سے بالاتر رہ کر برِصغیر میں ہمیشہ اردو ادب کو قوت اور کشش عطا کرتی رہی۔ ادب حقیقت میں انسان کی آواز ہے اور انسان سب سے پہلے انسان ہے اور پھر اِس کے بعد وہ جو بھی ہے۔ لیکن اگر وہ انسان نہیں اور آدمی سے انسان کے مرتبے تک نہیں پہنچا تب وہ کچھ بھی نہیں۔

ترقی پسند تحریک نے ''انسان دوستی'' کے اِس نظریئے کو ترقی پسند تحریک کے نام سے اختیار کیا۔ اور یہی تحریک دراصل اردو ادب کی بڑی تحریک ہے جس نے اردو ادب کے حال کو اُس کے ماضی سے منسلک اور وابستہ رکھا، انسان دوستی کے برعکس جو بھی تحریک پیش کی گئی وہ ناکام ہوئی۔ آپ جانتے ہیں حسنؔ عسکری صاحب کی اسلامی ادب کی تحریک کیوں ناکام ہو گئی؟ اس لیے کہ وہ انسان کو لخت لخت کرنے کی تھی اور چونکہ تخلیقِ ادب کا کام ہمیشہ سے بہت پڑھے لکھے اور ذہین لوگوں کے پاس رہا ہے اس لیے انہوں نے اس تحریک کے ذریعے لخت لخت ہونے سے انکار کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں ادب میں بھی (Survival of the fittest) کا اُصول کارفرما ہے جو تحریک اپنے عہد سے زیادہ مربوط، موزوں اور طاقتور ثابت ہوئی ہے وہی زندہ رہی ہے اور اُس نے زندگی کا سفر طے کیا ہے۔ پھر جدیدیت کی تحریک نے انسانی بطون کی طرف متوجہ کیا۔ بیسویں صدی گذشتہ کئی صدیوں کی نسبت زیادہ فروغِ علم کی صدی ہے اس لیے جدیدیت بھی ایک بڑے حلقے میں مقبول ہوئی۔ ترقی پسند تحریک نے انسان کے خارج پر زور دیا اور جدیدیت نے داخل پر مگر دونوں نے اپنا اپنا کردار ادا کیا۔ پھر ایک درمیانی راستہ نئی جدیدیت کی تحریک کے ذریعے بنایا گیا جس میں پہلی دونوں تحریکوں کے اہم عناصر شامل کر لیے گئے۔ میں سمجھتا ہوں اِس وقت شعوری یا غیر شعوری طور پر نئی جدیدیت کے تحت ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ میں ذاتی طور پر پورے آدمی کے ادب کا قائل ہوں اور اِس کا اظہار میں اس سے کئی سال پہلے خصوصاً اپنے شعری مجموعے ''دشتِ بام و در'' مطبوعہ 1996ء میں کر چکا ہوں۔ غرض میں سمجھتا ہوں کہ اردو ادب کے موسم بنانے اور تبدیل کرنے میں فکری تحریکوں کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ مگر بنیادی طور پر انہی تحریکوں کا حصہ ہے جن کی بنیاد انسان دوستی کے وسیع المشرب نظریئے پر استوار ہے۔ اس کے علاوہ جو چھوٹی موٹی واعظانہ یا تبلیغی تحریکیں ہیں وہ دراصل ادبی تحریکیں نہیں ہیں کیونکہ ان کا تعلق انسان دوستی کے نظریئے سے نہیں ہے بلکہ ان کے پیچھے کچھ اور مقاصد کارفرما رہے ہیں۔ سو یہ کچّے پکّے رنگ ہمیشہ وقت کی بارشوں میں بہہ جاتے ہیں۔ زندگی کا سفر طے کرنا تو کجا شروع بھی نہیں کر پاتے۔

سوال: ہمارے ہاں ادب زوال پذیر ہے یا ادبی رجحانات کو نمائشی اثرات کی دیمک کھوکھلا کر گئی ہے؟

جواب: ہمارے ہاں ادب کبھی زوال پذیر نہیں رہا۔ آپ تاریخِ ادب پر نگاہ ڈال کر دیکھئے ادب کا ہر عہد بے حد با ثروت دکھائی دے گا۔ خسروؔ، نظیرؔ، میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فیضؔ، کرشن چندر، بیدی، منٹو، ندیم، ناصر کاظمی اور وزیر آغا۔۔۔۔ غرض ہر عہد میں یہ کارواں آپ کو رواں دواں ملے گا۔ پھر اردو ادب نے ہر زندہ ادب کی طرح نئی تحریکوں کو خوش آمدید کہا ہے۔ بیانیہ، علامت، تجرید۔۔۔ اصناف کے طور پر نئی نظم، انشائیہ، نثری نظم، ہائیکو، ماہیا، یہ کامیاب صنفی تحریکیں ہیں جنھوں نے پوری قوت سے اردو ادب میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ ابھی اور تحریکیں بھی مثلاً ماہیا زور آزمائی میں مصروف ہیں۔ اردو ادب کے ہمیشہ زندہ رہنے کی وجہ اِس کے تخلیق کار ہیں اور ہ تخلیق کار ہر عہد میں آپ کو روشن ستاروں کی طرح دکھائی دیں گے۔ ضرورت اِس بات کی ہے کہ ادب کے بہترین حصّے کو نظر میں رکھا جائے جس طرح سپورٹس میں بہترین کارکردگی کو ریفر کیا جاتا ہے۔ جہاں تک ادب پر نمائشی اثرات کا تعلق ہے تو یہ معمول کی کاروائی ہے۔ ادب لکھنا پکّے لنگوٹ والوں کا کام ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ اچھا جملہ ہو یا اچھا شعر ہو تو سو پردوں میں بھی ہو گا تو سامنے آئے گا۔ ہاں بعض اوقات ہمارے جیسے ناانصاف معاشرے میں تھوڑی تاخیر ہو جاتی ہے اور نمائشی اثرات کچھ دیر کے لیے غالب نظر آتے رہتے ہیں مگر نمائشی اثرات تو کچّے رنگ ہیں۔ یہ میک اَپ تو پانی کے دو ہی چھینٹوں سے غائب ہو جاتا ہے۔ سو اِک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔ طاقتور رجانات اور انسان سے۔۔۔ پورے انسان سے۔۔۔ وابستہ ادب کو ہی زندہ رہنا ہے۔ البتہ ضرورت اِس

بات کی بھی ہے کہ پرنٹ میڈیا اور سکرین میڈیا فروغِ ادب کے لیے کام کرے اور ذاتی مصلحتوں سے بالاتر ہوکر اپنے فرائض ادا کرے کہ میڈیا کا اس عہد پر بلاشبہ بہت اثر ہے۔

سوال: ادب اور صحافت کہاں ایک ہو سکتے ہیں؟ ہمارے سماجی رویوں نے ادب وصحافت کے منصبی تقدس کو کس حد تک مجروح یا مفتوح کیا ہے؟

جواب: ادب اور صحافت ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں۔ اور اِسی میں ادب کی زندگی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے اسکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں فارسی زبان وادب کا غلبہ تھا اور چونکہ اِس وقت تک ہمارے ادب پر بھی فارسی شعروادب کا غلبہ تھا اس لیے ہماری نئی نسلیں ادب کے مرصّع اسلوب اور دبیز اندازِ اظہار کو بخوبی سمجھ سکتی تھیں۔ خود شاعروں، ادیبوں پر اس اندازِ اظہار کا غلبہ رہا۔ اقبالؔ، ن۔م۔راشدؔ' میراجیؔ' مجید امجدؔ' اختر حسین جعفری (شاعروں پر زیادہ تر۔۔۔۔ اور افسانہ نگاروں پر کم تر) اسی فارسیت کے زیرِ اثر رہے۔ مگر پھر فارسی ہمارے تعلیمی اداروں سے غائب کردی گئی۔ عربی سے رشتہ جڑا، یا جوڑنے کی کوشش کی گئی مگر وہ کلچر ہمارے مزاجوں سے خاصہ مختلف تھا اس لیے اظہار و بیان کو متاثر نہ کر سکا جس طرح فارسی اسلوب نے متاثر کیا تھا۔ پھر انگریزی زبان وادب کے سیدھے سچّے صحافت سے قریب اسلوب کا زمانہ آ گیا۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ ہمارے فارسیّت زدہ ادب کا نئی نسلوں کے حوالے سے کیا مستقبل ہوگا؟ کیا ہماری آج کی نسل اقبال کو۔ راشد کو۔ میراؔجی کو سمجھ پائے گی؟ فی الحال اس سے بحث نہیں لیکن اردو ادب نے اظہار کے نئے تقاضوں کو بڑا خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔۔۔ انگریزی اندازِ بیان کی طرح اردو میں آج گہری سے گہری بات کو آسان زبان میں کہہ دیا جاتا ہے اور یہی صحافت کا عوامی انداز ہے۔ میں اِسے صحت مند رجحان کہوں گا جس سے ادب صحافت سے قریب آتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ آج سبھی اردو روزناموں نے ادبی صفحات شائع کرنا شروع کر رکھے ہیں۔ گویا خود صحافت بھی ادب کی طرف بازو اٹھائے ہوئے ہے۔ اردو ادب وصحافت کا ایک واضح سنگم دکھائی دینے لگا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ صحافت نے ادب کے ذریعے سے اپنی مقبولیت میں اضافہ کرلیا ہے اور دوسرے انداز سے دیکھا جائے تو صحافت نے ادب کے ساتھ مل کر کام کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ پھر یہ بھی کہ صحافت نے ادب کو ظہار کے عوامی پیرائے کی طرف متوجہ کیا ہے، فکری سطح پر ادب اپنی ادبی شان کو بحال رکھے ہوئے ہے کیونکہ آج کا ادب آسان انداز میں مشکل بات کہنے کا فن ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ادب نے محض اپنے پیرہن کو ہلکا پھلکا کیا ہے تا کہ آج کے تیز رفتار سفر کو جاری رکھ سکے اور اجنبی دکھائی نہ دے۔ ہمارے سماجی رویّے دوسرے شعبوں کی نسبت ادب کے شعبے میں نسبتاً بہتر ہیں۔ ایک پسماندہ معاشرے سے اس سے بہتر رویّوں کی توقع فی الحال بے جا ہے۔ ہمارے اس قسم کے سماجی رویّوں نے منصبی تقدس کو مجروح تو کیا ہے مگر مفتوح نہیں کیا۔ ادبی کتابوں پر اور ادبی کام پر آج بھی غیر مستحق لوگوں کو ایوارڈ دیئے جا رہے ہیں کیونکہ ان کی لابی طاقتور ہے اور بااثر ہے۔ پچھلے بیس برسوں کے

ایوارڈ یافتہ ناموں کی فہرست دیکھنے سے بعض نام بار بار نظر آئیں گے۔ آخر کیوں؟ کیا ان کے علاوہ اور لوگوں نے معیاری ادب نہیں لکھا؟ بعض نام دیکھ کر آپ ویسے ہی حیران ہو جائیں گے کہ ان کا سرے سے کوئی قابل ذکر کام ہی نہیں۔ تاہم بہت سے غیر مستحق لوگوں میں دو تین مستحق نام بھی نظر آنے لگے ہیں۔ میرے خیال میں پرائڈ آف پرفارمنس صرف ایک بار دیا جانا چاہئے۔ اور کسی مصنف کو ایک ہی صنف کی کتاب پر دوبار ایوارڈ دس سال سے پہلے نہیں دیا جانا چاہئے۔ سکرین میڈیا پر جس طرح چند لوگوں نے قبضہ کر رکھا ہے یہ اہلِ اختیار کے لیے سوچنے کی بات ہے۔ بہر حال ایسے سماجی رویّوں کی نشاندہی تسلسل سے ہونی چاہئے۔ اور ان کے خلاف لکھا جانا چاہیئے۔ جنگل میں راستہ بنانے کے لیے وقت بھی چاہیئے اور مسلسل جدوجہد بھی۔ میرے خیال میں پرنٹ میڈیا کا رویّہ قدرے بہتر ہے اور ابھی مزید بہتر ہونا چاہیئے۔

سوال: کتاب ہمارے ہاں بے حیثیت شے بن گئی ہے اور صاحبِ کتاب بے قیمت فردِ معاشرہ۔ اگر نہیں تو پھر کیا صورت ہے؟

جواب: نہیں جی کتاب بھی بے حیثیت شے نہیں بنی ہے اور صاحبِ کتاب بھی بے قیمت فردِ معاشرہ نہیں ہے۔۔۔ آپ خود سوچیئے جس معاشرے میں لوگوں کو روٹی کے لالے پڑے ہوں۔ سامنے دنیا بھر کے خوانِ نعمت بچھے ہوں اور وہاں سے اپنی پسند کے دو لقمے بھی اُٹھا نہ سکیں تب کتاب کہاں سے خریدیں اور کس وقت بیٹھ کر پڑھیں۔ لوگوں کو ذرا سی معاشی سہولتیں دیجیے۔ تھوڑی سی فراغت عطا کیجئے تب آپ دیکھیں گے ان کے ہاتھ سب سے پہلے کتاب کی طرف بڑھیں گے۔ قاری ہمارا بہت قابلِ رحم ہے۔ ہم اُسے روٹی تک تو دیتے نہیں اور اُس سے تقاضہ کرتے ہیں کہ کتاب خریدے۔ پھر بھی اس دور میں کتاب بہت چھپ رہی ہے اور پڑھی جا رہی ہے۔ میں نے لوگوں کے دلوں میں کتاب کی محبت یہاں تک دیکھی ہے کہ بے تعلق اور معمولی سے تعلق والے لوگ بھی مصنّف سے کتاب مانگ لیتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ پڑھنا چاہتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ان کے پاس خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ مصنّف سے کوئی ایسا زیادہ تعلق بھی نہیں ہے مگر سبک سر ہو کر ہی سہی، کتاب کی محبت میں وہ پھر بھی کتاب مانگنے لگتے ہیں۔ لائبریریاں کتابوں سے اور قارئین سے بھری نظر آئیں گی۔ یہی کتاب کی اور صاحبِ کتاب کی وقعت ہے۔ ہاں ناشروں کے مسائل الگ ہیں اور وہ مصنّفوں کا استحصال کر رہے ہیں۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن اور اکادمی ادبیات کو اس سلسلے میں قانون سازی کر کے مصنّفین کے ہاتھ مضبوط کرنے چاہئیں۔

سوال: آپ صاحبِ قلم بن گئے صاحبِ سیف کیوں نہ بنے یا کوئی دوسرا میدان کیوں نہ چنا؟

جواب: **اصغر عابد** میں آپ کو یہ راز بتا دوں کہ خدا کا شکر ہے کہ میں صاحبِ قلم بن گیا۔ اگر میں صاحبِ قلم نہ ہوتا تو صاحبِ سیف ہوتا اور بہت بری طرح کا صاحبِ سیف ہوتا یعنی قاتل۔ خونی۔ ظالم۔ سنگدل۔ میں جاٹوں کے اُس قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں جس کے لوگ بُٹر کہلاتے ہیں اور قتل وغارت گری کے لیے مشہور ہیں۔ میرے بچپن

اورنو جوانی تک میرے گاؤں کا ماحول (جب میں گاؤں میں رہتا تھا) بہت پرامن اور پرسکون تھا۔میرے قبیلے کے دوسرے یہاتوں میں رہنے والے لوگ ہمارے ہاں آتے اورہمیں طعنے دیتے کہ تم کیسے بُز ہو کہ سال میں پانچ سات بندے بھی نہیں مارتے۔ہم تو جب تک دس بیس بندے نہ پھڑکا لیں ہمارا گزارہ ہی نہیں ہوتا،میرے گاؤں کے لوگوں نے بہرحال اس پرامن ماحول کو بحال رکھا۔مگر اب میرے گاؤں میں چار پانچ قتل ہونے معمول بن گیا ہے اس لیے میں نے گاؤں جانا چھوڑ دیا ہے۔سال میں ایک دو بار بڑی مشکل سے اور مجبوری سے جاتا ہوں ورنہ اب گاؤں جانے کو میرا جی نہیں چاہتا ویسے بھی میں نے اپنے شیطان سے دوستی کرلی ہے۔اس نے کہا تھا ''اکبر حمیدی تم رحمان نہ بننا میں شیطان نہیں رہتا'' میں نے کہا ''تم انسان بن جاؤ میں بھی انسان رہوں گا'' اس معاہدے پر ہم دونوں بڑی شرافت سے عمل کررہے ہیں۔رہی دوسرا میدان چننے کی بات تو مجھے پروفیسر کہلوانا اچھا لگتا تھا سو میں نے اس خواہش کے لیے باقاعدہ ایگزیکٹو کی ملازمت سے انکار کیا اور اس قربانی کے باعث خداوند کریم نے میری خواہش کو پورا کردیا۔اب بھی یقین جانئے میں صرف اتنے ذرائع چاہتا ہوں جن سے میں اور میرے بچے عزت وآبرو سے زندگی بسر کرسکیں۔اگر کبھی اس سے زیادہ ملا تو میں انکار کردوں گا۔مجھ میں انکار کی طاقت اور حوصلہ ہے۔

سوال: آپ نے شعر کہے۔خاص طور پر غزل اور وہ بھی زیادہ تر چھوٹی بحر میں۔اس کی خاص وجہ یعنی کیا منصوبہ بندی کے تحت ایسا ہوا؟

جواب: میں غزل شروع سے کہہ رہا ہوں اور اب نظم بھی۔میں ان کاموں میں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کا قائل ہوں مثلاً نئی نظم کا فارمیٹ اور اسلوب غزل سے بہت مختلف ہے۔گو میں نے نظمیں بھی کہیں اور وہ چھپیں بھی مگر ابھی میں نظم کے آہنگ سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کررہا ہوں اور پوری طرح نہیں ہو پایا کیونکہ غزل فارمیٹ کے اعتبار سے زیادہ بہت روائیتی ہے اور نئی نظم اپنی وسعت کے اعتبار سے زیادہ بھیدوں بھری ہے اور میں اس کے بھید بھاؤ جاننے میں لگا ہوں۔غزل میں چھوٹی بحر مجھے زیادہ پسند ہے اور لمبی بحر میں لکھنے سے مجھے الجھن ہوتی ہے۔اگرچہ لمبی بحروں میں اوروں نے اچھّی اچھی غزلیں بھی کہی ہیں مگر یہ بحریں میرے مزاج سے ہم آہنگ نہیں اس لیے چھوٹی بحر زیادہ اختیار کی گئی مگر یہ نیچرل ہوا۔کوشش سے نہیں۔باقی ادبی کاموں میں میری منصوبہ بندی کا دخل ضرور ہے کہ میں سوچ سمجھ کر کام کرنے والا آدمی ہوں مگر چھوٹی بحر خود ہی میرے ہاں زیادہ شامل ہوئی۔چھوٹی بحریں یا میڈیم بحریں میرے لیے سہولت کا باعث بنتی ہیں اور میں اپنی توجہ اوزان کے معرکے سر کرنے کی بجائے بات کہنے پر مبذول رکھتا ہوں۔ہمارے ہاں بعض حضرات تو محض اوزان کی شاعری کررہے ہیں،یعنی نئے نئے غیر مانوس اوزان میں غزلیں کہہ کر وہ اس سے شعر کا نیا پن ظاہر کرنا چاہتے ہیں اور سادہ قاری اسے شعر کا نیا پن سمجھنے بھی لگتا ہے۔چھوٹی بحر تیز تیر کی طرح ہوتی ہے۔اس کے تاثر کو الفاظ تیز کرتے ہیں کیونکہ ان کی تعداد کم ہوتی۔لمبی

بحروں میں الفاظ کا ہجوم ہوتا ہے اور تخلیق کار کی ذرا سی کم مشقی سے یا کم فہمی سے یہ ہجوم تاثیر کا راستہ روک کر کھڑا ہوجاتا ہے۔الفاظ کو راستے سے ہٹانا۔ان سے کام لینا۔ان کی چھانٹی کرنا۔انہیں بولانا اور انہیں نچانا ایک بہت طاقتور شاعری کا کام ہے۔بعض شاعر ساری زندگی لغت کی شاعری کرتے رہتے ہیں۔اور خوشامدیوں یا غرض مندوں کی واہ واہ کے باعث وہ زندگی بھر یہ سمجھ نہیں پاتے کہ ان کے ساتھ الفاظ کیا کھیل کھیل رہے ہیں۔لفظ تو ایک جن ہے اسے فہم وفراست اور فن کے منتر سے ہی کیلا جاسکتا ہے ورنہ وہ ساری عمر سر پر سوار رہتا ہے اور شاعر کو نچاتا رہتا ہے۔لفظ کو سر سے اتارنا،اسے قابو میں لانا،اور اس سے کام لینا تین بڑے مرحلے ہیں۔اور انہیں سر کرنے کے لیے بہت طاقت بھی چاہئے اور سمجھ بھی۔فن میں لفظ دوست بھی ہے اور دشمن بھی' جب وہ اظہارِ بیگانگی کرنے لگے۔

سوال: نثر میں آپ نے انشائیے لکھے۔۔۔۔سرگودھا کے مزاج کے'۔آپ نے تنقید بھی لکھی۔۔۔۔اب خاکوں کا مجموعہ آیا۔۔۔۔بچّوں کی کہانیاں بھی شائع ہوگئیں۔۔۔اور سب سے بڑھ کر خودنوشت سوانح نگاری۔۔۔ذرا تفصیل بتائیے؟

جواب: میں نے انشائیے لکھے۔۔۔۔مگر جناب سرگودھا کے مزاج کے نہیں۔۔۔اپنے مزاج کے۔ہر شخص کا ایک مزاج ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ہاں میں نے انشائیہ لکھنے کے لیے ڈکٹر وزیر آغا سے رہنمائی حاصل کی اور اب بھی حاصل کررہا ہوں۔انشائیہ کو سمجھنے میں اور لکھنے میں یعنی اس کے پیٹرن میں مَیں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا تاہم انشائیہ لکھا' اپنے مزاج اور اپنے خیالات وافکار کے مطابق۔اس میں نئے نئے تجربات بھی کیے۔میں نے انتہائی دُکھ بھرے اسلوب میں بھی انشائیہ لکھا جیسے ''میں سوچتا ہوں'' تاریخی انشائیہ بھی لکھا جیسے ''نظام سقّہ'' فلسفیانہ،نفسیاتی،کیفیاتی انشائیے بھی لکھے۔خالص نظریاتی انشائیہ بھی لکھا اور اب ایک انشائیہ مکالماتی انداز میں لکھا ''ٹیلیفون کال'' یہ ایک مسلسل مکالمہ ہے۔یوں میں نے انشائیہ کے متن میں بھی اور متن سے باہر بھی تجربے کیے۔انشائیے میں میرے چار مجموعے شائع ہوئے ہیں۔خاکے بھی لکھے۔کچھ میرے خاندان کے لوگوں کے ہیں اور کچھ شاعر ادیب دوستوں کے۔بچّوں کے لیے کہانیاں فرصت کے دنوں میں لکھیں۔یہ کہانیاں ''عقلمند بچّوں کی کہانیاں'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئیں۔نیشنل بک فاؤنڈیشن آف پاکستان کی طرف سے ان کہانیوں پر ایوارڈ بھی دیا گیا۔اب خودنوشت سوانح حیات ''جست بھر زندگی'' شائع ہوئی ہے۔یہ قدرے بڑی کتاب ہے سوا تین سو صفحات سے کچھ زیادہ۔اس کا بہت زوردار رسپانس آرہا ہے اور یہ کتاب تیزی سے فروخت بھی ہورہی ہے۔اب تو ختم ہونے والی ہے۔کچھ ہی کاپیاں میرے پاس ہیں جو میں نے اپنی ضرورت کے لیے رکھی ہیں۔دو ماہ میں یہ ایڈیشن تقریباً ختم ہوگیا ہے۔شروع میں زیادہ اصناف میں لکھنے پر بعض لوگ خفا ہورہے تھے مگر ان کی گفتگو میں بشاشت کا اظہار ہوتا ہے۔اور یہ اس لیے کہ میری سب تحریروں نے قارئین میں اعتماد حاصل کر

لیا ہے۔ میں خود بھی اپنی تحریروں سے مطمئن ہوں۔ زیادہ اصناف میں لکھنا میری ضرورت ہے۔ ایک صنف میری اظہاری ضرورتوں کو پورا نہیں کر پاتی۔ میرے پاس زندگی کے متنوع تجربے ہیں اور رنگا رنگ سوچیں ہیں۔ میں ایک کمرے کے گھر میں رہائش نہیں رکھ سکتا۔ مجھے سب طرح کے کمروں والا گھر چاہئے سو میں اسے تعمیر کر رہا ہوں۔ خاصا تعمیر ہو گیا ہے اور میں اپنی رہائش اس بڑے گھر میں لے آیا ہوں۔ گذشتہ ایک ڈیڑھ سال میں خاکوں کا مجموعہ ''چھوٹی دنیا بڑے لوگ'' شائع ہوا۔ بچّوں کے لیے کہانیاں چھپیں۔ انشائی مجموعے ''جھاڑیاں اور جگنو'' اور ''پہاڑ مجھے بلاتا ہے'' شائع ہوا۔ کئی ایک مضامین وغیرہ لکھے۔ خودنوشت شائع ہوئی۔ غزلیں، نظمیں اور ہائیکو بھی لکھے۔

سوال: زندگی کے بارے میں آپ کیا کہیں گے۔ خاص طور پر عمرانی تہذیب کے پسِ منظر میں؟

جواب: زندگی تیز رفتار گھوڑے کی سواری ہے اور یہاں ہر لمحے پاؤں رکاب میں جمائے رکھنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں زندگی جنگل کا سفر ہو گئی ہے اور اس سفر میں مسافر کو ہر جھاڑی پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ زندگی ایڈجسٹ منٹ ہے جو جتنی اچھی ایڈجسٹ منٹ کر سکے گا اتنا ہی کامیاب رہے گا۔ جس طرح مَیں ایک وقت میں بہت سی اصنافِ ادب میں لکھ رہا ہوں اسی طرح میں ایک وقت میں بہت سی باتیں سوچ سکتا ہوں۔ بہت سے کام کر سکنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ بہت سی سمتوں میں بیک وقت دیکھ سکتا ہوں۔ میرے ذہن کی، میری ذات کی بہت سی پرتیں ہیں۔ ہر پرت میں میرا ایک دفتر ہے۔ اور میں ہر دفتر میں بیٹھا کام کرتا نظر آؤں گا۔

دوسروں کی طرح مجھے بھی زندگی کے مسائل پیش آئے ہیں اور پیش آ رہے ہیں۔ شاید بہت سے لوگوں سے زیادہ۔ مگر میں نے عام لوگوں سے بڑھ کر ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میری زندگی نے ہمیشہ مجھے راستہ دیا ہے اور میں اپنے آپ کو ایک کامیاب اور مطمئن آدمی سمجھ سکتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ دوسروں سے مل کر رہنا چاہا ہے۔ مگر اپنی پسند کے لوگوں سے۔ زندگی ضائع کرنے کے لیے نہیں ملی اور میں اپنے شیشے پتھروں پر رکھنے کا قائل نہیں ہوں۔ میں انسان دوست، روشن خیال، سیکولر، نرم دل، محبت کرنے والا بے ضرر انسان ہوں۔ ہیومن ازم اور انہی باتوں نے میری زندگی کو کامیاب بنایا ہے۔ مگر اس قسم کا فرماں بردار نہیں جو ہر حالت میں وفاداری نبھائے چلا جائے۔ میں باوفا ہوں۔ وفادار نہیں۔ دوستیاں کبھی ترک نہیں کرتا۔ بشرطیکہ کوئی دوست مجھے اُٹھا کر بحرِ الکاہل میں نہ پھینک دے۔ میرے خیال میں یہی زندگی کے صحت منداور متوازن روّیے ہیں۔ میں نے دوستی کی قیمت پر یا عزتِ نفس کی قیمت پر کبھی کوئی چیز نہیں خریدی۔ مجھے خوشی ہے کہ میری انہی اخلاقی قدروں کو میرے دوستوں اور عزیزوں نے ہمیشہ پسند کیا ہے۔

سوال: ادیب اور معاشرہ۔۔۔۔۔۔ پرانا سوال ہے۔۔۔۔ مگر آپ کی رائے کیا بنتی ہے؟

جواب: ادیب معاشرے کا سب سے زیادہ ذمہ دار فرد ہوتا ہے جو ساری زندگی اپنے معاشرے کی خدمت کے

لیے بسر کرتا ہے۔ جو ہر ظالم، منافق، غیر ہموار زمانے میں اپنے لوگوں کے لیے آواز اُٹھاتا ہے۔ جب سیاست دان ملک وقوم کے نام پر، مذہبی آدمی اللہ، رسول ﷺ کے نام پر، تاجر حب الوطنی کے نام پر استحصال کر رہا ہوتا ہے تب ایک ادیب ہی تو ہوتا ہے جو ایسی سماجی ناانصافیوں کے خلاف اپنے معاشرے کے لیے اپنا کردار ادا کرتا ہے اور وقت کے صفحے پر اپنا احتجاج ریکارڈ کرواتا ہے۔ ادیب کا احتجاج ہمارے معاشرے میں اس طرح کا نہیں ہوتا ہے جس طرح یورپ کے بعض ممالک میں، تاہم میں اپنے خصوصی معاشرتی ماحول میں ادیبوں کا عملی سیاست میں حصہ لینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر خراب زمانے میں ادب نے ہی صحت مند اپوزیشن کا کردار ادا کیا ہے۔ میں نے ایک غزل میں کہا تھا ۔

؎ غزل تو قائدِ حزبِ مخالف ہی رہی اکبؔر
ہمارے عہد میں کیوں وقت کا فرمان ہو جاتی

سوال: جدید نظم کا کیا مستقبل ہے؟

جواب: جدید نظم کا مستقبل شاندار ہے۔ جس نظم کو میؔرا جی، مجید امجؔد، ن۔م۔راشؔد، وزیر آغا جیسے شاعر ملے ہوں اس کی خوش بختی کا کیا ٹھکانہ ہے۔ میں جدید نظم کا بہت قائل ہوں۔ غزل کے مخالفین نے مجھے نظم مخالف سمجھ رکھا ہے۔ میں کسی صنف کی مخالفت کو ایک فضول بات سمجھتا ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ نئی نظم کے نئے شاعر اسے ابلاغ واظہار کی دھند سے باہر نکالیں تاکہ وہ غزل کی طرح اپنا حلقہ وسیع کر سکے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی اختلافی بات ہے، کیا وہ نہیں چاہتے کہ ان کی بات سمجھ میں آئے۔ جدید نظم کی نسبت مجھے نثری نظم (یہی نام زیادہ معروف ہے) زیادہ پرکشش نظر آتی ہے۔ اپنے عروضی سقم کے باوجود نثری نظم بہت طاقتور میڈیم ہے۔ خصوصاً کشور ناہید اور سلیم آغا قزلباش کی نثری نظمیں دل ودماغ میں اتر جانی والی ہیں۔ جدید نظم کو غزل سے نہیں کہ یہ دونوں بالکل الگ الگ میڈیم ہیں۔ حقیقت میں نثری نظم سے خطرہ ہے۔ اگر نثری نظم کو کشور ناہید اور سلیم آغا قزلباش کے پائے کے دو چار شاعر بھی اور مل گئے تب جدید نظم میں اور نثری نظم میں زندگی موت کا رَن پڑے گا۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ جب میں جدید نظم کے شاعروں کو اظہار وابلاغ کے مسائل کی طرف متوجہ کرتا ہوں تو وہ برا مانتے ہیں خصوصاً ستیہ پال آنند صاحب تو اتنے جذباتی ہو جاتے ہیں کہ غزل پر فائر کھول دیتے ہیں۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ حضور یہ فائر خود آپ کو ہی لگ رہا ہے۔ غزل کے کیا کیا مخالفین آئے اور چلے گئے۔ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت جنہیں متحارب تحریکیں سمجھا جاتا ہے۔ غزل کی مخالفت میں متحد تھیں۔ آلِ احمد سرؔور اور جوشؔ صاحب نے غزل کی مخالفت کر کے وقت ضائع کیا۔ مگر غزل ہر عہد میں آگے ہی بڑھتی رہی۔ اقبال نظم کے بہت بڑے شاعر ہیں مگر اپنی وسعتِ خیال کے اظہار کے لیے انہیں غزل کو اختیار کرنا پڑا۔ سچّی بات یہ کہ نظم کے بڑے شاعر اتنے بڑے شاعر نہیں ہیں جتنے بڑے غزل کے بڑے شاعر ہیں۔ مگر میرا موقف یہ ہے کہ ہمارے عہد میں جدید نظم اور غزل اپنے مزاج اور

ذائقے کے اعتبار سے بہت مختلف ہیں۔ان کی آپس میں کوئی مخالفت نہیں اور نہ ہی کوئی ایک دوسری کی جگہ لے سکتی ہے۔تسلسلِ خیال کے لیے جو لطف نظم میں ہے وہ غزلِ مسلسل میں نہیں آ سکتا۔اور متنوّع مضامین اور تیزیٔ طبع اور دھما کہ خیزی اور وسعتِ فکر کے لحاظ سے جو متاع غزل کو حاصل ہے ۔وہ نظم کو حاصل نہیں ہو سکتا۔نظم ایک عالمی میڈیم ہے اور غزل میں مقامیت زیادہ ہے اور یہ خصوصیات اچھّی ہیں۔ان میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔عالمی مواصلات کے لیے مقامی مسائل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی مقامی مسائل کے لیے عالمی معاملات سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے۔سو جدید نظم بہت نفیس، بہت پُرلطف میڈیم ہے جو وقت کی ضرورت ہے۔

سوال: غزل پر جو حملے ہو رہے ہیں کیا غزل واقعی ختم ہو رہی ہے؟

جواب: غزل پر ہمیشہ نظم نگاروں نے ،نقادوں نے ،متعدد ادبی تحریکوں نے حملے کیے مگر غزل نے خود ہی اپنا دفاع کیا۔نقادوں نے بہت کم دفاع کیا اور تحریکیں تو ہمیشہ غزل کو گردن زدنی قرار دیتی رہیں۔غزل ہو یا کوئی بھی اور صنفِ اظہار، جب تک اس میں اعلیٰ درجے کے تخلیق کار آتے رہیں گے۔اسے کوئی مار نہیں سکتا اور غزل سدا بہار صنفِ سخن ہے۔ہاں غزل اپنی کشش کے باعث بہت زیادہ لکھی جا رہی ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ اچھّے لوگوں سے ہر سال غزل کا انتخاب شائع کروایا جائے۔اکادمی ادبیات نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا مگر ان کے کروائے ہوئے اکثر انتخاب اچھّے نہیں ہوئے کیوں کہ اکادمی والے سفارشی لوگوں سے اور ذاتی مراسم والے لوگوں سے یہ کام کرواتے ہیں۔اسے بہتر اور غیر جانبدار لوگوں سے کروانے کی ضرورت ہے۔

سوال: دبستانِ سرگودھا ہمیشہ سخت تنقید کا نشانہ بنتا رہا؟ کیا واقعی؟

جواب: ڈاکٹر وزیر آغا اور ان کے دوستوں سے یہاں ہمیشہ ناانصافی ہوئی ہے۔یہ لوگ ہمیشہ حزبِ مخالف سمجھے گئے ۔ادب کے حزبِ اقتدار نے ہمیشہ ان کی کردار کشی کی ہے اور انہیں پروپیگنڈے اور اپنے اثر ورسوخ کے ذریعے ہمیشہ معتوب ومحروم رکھا۔اس کی ایک وجہ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کی ادبی سیاست سے کنارہ کشی ہے۔اگر وہ چاہیں تو احمد ندیم قاسؔمی کی طرح ادبی سیاست میں فعال کردار ادا کر سکتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں ان کی گوشہ گیری خود ان کے لیے اور ان کے دوستوں کے لیے بعید نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے۔

سوال: لکھنے والے کی فکر اور اس کی اپنی شخصیّت یا کردار؟ کیا یہ دونوں ایک ہونا ضروری ہیں؟ یا کوئی اور صورت بھی ہو سکتی ہے؟

جواب: اصغر عابؔد صاحب ! لکھنے والے کی فکر اور اس کی شخصیّت یا کردار ہوتے ہی ایک ہیں۔لکھنے والے کی تحریریں ہی اس کی شخصیّت اور کردار ہیں۔وہ دنیا کے سامنے کسی خارجی دباؤ یا ترغیب کے لیے جھوٹ بول سکتا ہے مگر اپنی تحریر میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔اگر آپ کسی لکھنے والے کو جاننا چاہتے ہیں تو اس کی تحریریں دیکھیں۔وہ اپنے تخلیقی گھر میں اصل حالت میں دکھائی دے گا۔لکھنے والے کا سماجی کردار ہمارے جیسے معاشرے میں اس کے اصل

کردار سے مختلف ہو سکتا ہے۔یہ اس کی مجبوری ہے۔اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو خارجی جابرانہ قوّتوں کے ہاتھوں زندہ نہیں بچّے گا۔غالؔب نے خارجی ماحول کے خلاف کردار اختیار کیا اور زندگی بھر قرضوں ،جیلوں ،نفرتوں ،محرومیوں ،دشمنیوں کا نشانہ بنا رہا۔منٹو سب کی نظروں کے سامنے بیچ لاہور کسمپرسی کی موت مرا۔مجید امؔجد بے یار ومددگار موت کا لقمہ بنا۔شکیب جلاؔلی کی خودکشی ابھی کل کی بات ہے۔سو میں سمجھتا ہوں لکھنے والے کو کوئی انفرادی سیاسی کردار ادا نہیں کرنا چاہئے۔ہمارا معاشرہ یورپ اور دوسرے ترقی یافتہ معاشروں سے بہت مختلف ہے۔ایسے کرداروں کو منفی کہہ کر جان سے مار دیا جاتا ہے۔ہمارے معاشرے میں ولّن بہت طاقتور ہے اور اس وِلّن نے کئی طرح کی نیک نامیوں اور پاک دامانیوں کے لباس پہن رکھے ہیں۔اس لیے ایک کھرے ادیب کو صرف کھرا ادب ہی تخلیق کرنا چاہئے جو ذات سے کائنات تک پھیلا ہوا ہو مگر ادب پوسٹر نہ بنے۔اپنی تخلیقی شان بحال رکھے اور زندہ رہے۔ادب کا اپنا الگ طرح کا کھرا پن ہے۔سڑک پر کھڑے ہو کر گالیاں دینا اس کا منصب نہیں۔اس نے اپنی تخلیق کا نشتر استعمال کرنا ہے۔اس طرح کہ معاشرے کو گندے خون سے پاک کر دے۔تاہم ادیب کا کھرا پن ایک عام آدمی کے کھرے پن سے بہت مختلف ہے۔

سوال: اوہ!۔۔۔اکبر حمیدؔی صاحب، آپ کی ابتدائی، وسطی اور اب موجودہ زندگی کے بارے میں تو پوچھا نہیں اب تک؟

جواب: 1978ء تک میں گاؤں فیروز والہ اور شہر گوجرانوالہ میں رہا۔1979ء میں اسلام آباد آنا شروع کیا اور 1980ء میں پورے کا پورا یہاں آ گیا 1989ء میں اور 2000ء میں لندن میں باقاعدہ ایک ماہ رہائش رکھی۔اب مستقل رہائش اسلام آباد میں ہے۔بہت سے خارزاروں، سبزہ زاروں اور گلزاروں میں سے گذرا ہوں مگر اب جو سوچتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ میں زندگی کا توانائیوں بھرا حصّہ اور دن کا بیشتر وقت صحرا سے شہر پہنچنے کے راستے میں بسر کر کے شہر اس وقت پہنچا ہوں جب شام تو نہیں مگر شام سے ذرا پہلے کا وقت ہے۔مجھے دوپہر تک تو شہر پہنچ جانا چاہئیے تھا۔تب میں شاید شہر کی رونقوں سے زیادہ لطف اندوز ہو سکتا۔کبھی میں نے شعر کہا تھا غزل میں۔

؎ نہ پہنچے تو بھی اکؔبر دُکھ نہ ہو گا
کہ ہم صحرا کے رستے جا رہے ہیں

سوال: احمد ندیم قاسؔمی کی خوبیاں تو بتایئے اور یہیں ڈاکٹر وزیر آغا کی خامیوں کی بھی نشاندہی کر دیجئے؟

جواب: (مسکراتے ہوئے) اچّھے بچّے ایسی باتیں نہیں کرتے اور آپ اچّھے بچّے ہیں۔میں دونوں شخصّیتوں کا معترف ہوں اور اُن سے جونئیر ہوں۔وہ ادب کے بڑے لوگ ہیں۔

سوال: پنجابی میں آپ نے صرف شعر میں اظہار کیا؟ کیوں؟

جواب: میں چاہتا تھا کہ پنجابی میں ایسی غزل کہوں جو پنجاب کے کلچر کی نمائندگی کرے۔میرے خیال میں

پنجابی میں اردو غزل لکھی جارہی ہے اور اس میں پنجابی کی بجائے اردو غزل کا کلچر ہے۔میری غزل کا مجموعہ ''بکّی غزل پنجاب'' چھپا جو خالص پنجابی غزل ہے۔اس کے دیباچے میں میری طرف سے کچھ ایسی سخن گسترانہ باتیں آگئی ہیں جو پنجابی شاعروں، ادیبوں کو اچھّی نہیں لگیں اس لیے کوئی میری کتاب کا ذکر کرنے پر تیار نہیں۔''بکّی غزل پنجاب'' کی غزل توجہ طلب ہے۔پنجابی میں نثر لکھنے کی توفیق نہیں ملی۔وقت بھی نہیں ملا۔

سوال: علاقائی ادب و زبان کی تہذیبی وقعت اور لوک دانش کے خصوصی حوالوں سے اس ادب کی فکری وسعتوں کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

جواب: علاقائی ادب کے سال بہ سال انتخاب شائع ہونے چاہئیں۔اکادمی کے رسالے ''ادبیات'' کے معیار کے علاقائی ادبی رسالے شائع ہونے چاہئیں۔پنجابی اور خصوصاً پشتو زبان و ادب تہذیبی اور بالخصوص لوک دانش کے معاملے میں بہت باثروت ہیں۔پشتو ضرب الامثال تھوڑی سی ترجمہ ہوئی ہیں جو لوک حکمت و دانش کا بہت قیمتی سرمایہ ہیں۔ایسے ہی تراجم سندھی، بلوچی اور پنجابی ضرب الامثال کے ہونے چاہئیں۔

سوال: وہ باتیں کیجیے جو پوچھی نہیں جاسکیں؟

جواب: آپ وہ باتیں جان جائیے جو کہی نہیں جاسکیں!۔۔۔۔ہاں اردو ماہیا کا ذکر نہیں ہوا۔میں سمجھتا ہوں اردو ماہیا کی خوش بختی ہے کہ اسے حیدر قریشی جیسا طاقتور تخلیق کار اور مستعد محرک ملا جس نے اردو ماہئے کو ایک تحریک کی شکل میں تبدیل کردیا۔حیدر قریشی نے اعلیٰ درجے کا ماہیا بھی لکھا اور تنقیدی اور تحقیقی سطح پر بھی ایک تاریخی کردار ادا کیا جو ہمیشہ زندہ رہے گا۔یہ پکّی سیاہی سے لکھا گیا ہے اب اس صنف کو اچھّے شاعروں کی ضرورت ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

''اکبر حمیدی ایک خود آگاہ شخص بھی ہے اور اسکا نقطۂ نظر یا انسانی قدروں سے کمٹمنٹ واضح ہے۔مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نظریاتی شاعری کرتا ہے۔۔۔۔۔اکثر نظریاتی شاعر کسی خاص مقصد کے حصول کی خاطر شاعری کرتے ہیں۔بالعموم ان کے لئے نظریہ زر ہے، جسے بیچ کر وہ کچھ کماتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں رَس اور بصیرت کھوکھلی اور مسخ شدہ شکل میں ہوتی ہیں۔شاعری میں رَس اور بصیرت، ہر قسم کے مقصد سے بالاتر ہوکر اپنی ذات میں غوطہ زن ہونے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں۔اکبر حمیدی کے لئے شاعری کسی مقصد، مفاد سے قطعاً مشروط نہیں۔''

ناصر عباس نیر کے مضمون **اکبر حمیدی کی غزل** سے اقتباس

بحوالہ کتاب **اکبر حمیدی کا فن**۔مرتب رفیق سندیلوی۔ص۸۱)

غزل (احمد فراز کی نذر): ابراہیم اشکؔ (ممبئی)

مثالِ موج اسے سب مچل کے دیکھتے ہیں
حسین سارے مگر اس کو جَل کے دیکھتے ہیں

گذر جو شہر کی گلیوں سے اس کا ہوتا ہے
تمام لوگ گھروں سے نکل کے دیکھتے ہیں

پڑے جہاں بھی قدم اس کے دشت وصحرا میں
زمیں سے آپ ہی چشمے اُبل کے دیکھتے ہیں

غضب کی تاب وہ رکھتا ہے اپنے جلووں میں
کہ مہر و ماہ بھی اس کو سنبھل کے دیکھتے ہیں

ذرا سا لمس جو مل جائے اس کے ہاتھوں کا
درخت سوکھے ہوئے، پھول پھل کے دیکھتے ہیں

سنا ہے بزم میں اس کی خدا کے جلوے ہیں
سماں وہاں کا چلو ہم بھی چل کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اپنی روش وہ نہیں بدلتا ہے
تو اس کے واسطے خود کو بدل کے دیکھتے ہیں

سنا ہے عشق میں جلنا بھی اک عبادت ہے
مثالِ مہر چلو ہم بھی جل کے دیکھتے ہیں

سنا ہے شیش محل میں وہ جب سنورتا ہے
سب آئینے اسے شکلیں بدل کے دیکھتے ہیں

وفا میں اس کی غضب کی ہے گرمیٔ احساس
اُسے تو راہ کے پتھر پگھل کے دیکھتے ہیں

کبھی تو آئے گا، دیکھے گا وہ دریچے سے
گلی میں اس کی ذرا ہم ٹہل کے دیکھتے ہیں

کھلے گا راز وہ معصوم ہے کہ ہے ہشیار
رہِ وفا میں ذرا اُس کو چھل کے دیکھتے ہیں

یہ کم نہیں ہے ہمیں چاہتا ہے وہ ورنہ
بڑے بڑے بھی اسے ہاتھ مل کے دیکھتے ہیں

ابھی تو ایک نظر ہی ملی ہے بس اس سے
ابھی سے خواب ہزاروں محل کے دیکھتے ہیں

سحر سے شام تلک اس کو دیکھنے والے
طلوع ہو کے، کبھی اس کو ڈھل کے دیکھتے ہیں

سراپا ناز ہے وہ، اس کو دیکھنے والے
ہر اک ادا میں اشارے غزل کے دیکھتے ہیں

بہت دنوں سے کوئی رس نہیں ہے جینے میں
تو آؤ ہم بھی زمانہ بدل کے دیکھتے ہیں

ہنسے وہ جب تو گلستاں کے پھول شرما کر
لبوں پہ اس کے نظارے کنول کے دیکھتے ہیں

تمام لفظ و معانی کی ہے یہی خواہش
کرے وہ بات تو باتوں میں ڈھل کے دیکھتے ہیں

تلاشِ یار میں نکلے تو ہر قدم پر ہم
خزانے سارے ہی علم و عمل کے دیکھتے ہیں

اُسی کی یاد میں کیوں دل تڑپتا رہتا ہے
ہو ممکنات تو یہ دل بدل کے دیکھتے ہیں

ہزاروں بار یہ سوچا، نہ کامیاب ہوئے
اگر وہ سامنے آئے تو ٹل کے دیکھتے ہیں

سنائی دیتی ہے آہٹ ہمیں زمانے کی
کہ ہم تو آج سے حالات کل کے دیکھتے ہیں

غزل تو کہنا ہے اے اشکؔ ہم کو نذرِ فرازؔ
ذرا سا قافیہ لیکن بدل کے دیکھتے ہیں

انٹرنیٹ پرصرف اردو کے واحد سائبرادبی حلقہ پر ہونے والی مراسلت

urdu_writers@yahoogroups.com

کچھ ہمت رائے شرما جی کے بارے میں

(اردو رائٹرز اردو کا پہلا سائبرادبی حلقہ ہے جوصرف اردو میں مکالمہ کرر ہا ہے۔اس حلقہ پر گزشتہ دنوں پہلے نذرخلیق صاحب کی جانب سے ہمت رائے شرما جی کی صحت یابی کے لئے دعا کی اپیل کی گئی۔اس کے جواب میں ایک طرف ہمت رائے شرما جی کونجی طور پر دنیا بھر سے شاعروں اورادیبوں کی متعددای میلزملیں دوسری طرف دو دوستوں نے ان کے بارے اپنے دعائیہ جذبات منظوم صورت میں اردو رائٹرز پر ہی پیش کئے۔اس سب کے جواب میں ہمت رائے شرما جی نے مجھے جوخط لکھا اسے میں نے ان کی اجازت سے اردو رائٹرز پر جاری کیا۔یہ سارا میٹر اردو رائٹرز سے **جدید ادب** کے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔**حیدر قریشی**)

ہمت رائے شرما کے لئے درخواستِ دعا

ہمت رائے شرما بیسویں صدی کے دوسرے رُبع میں فلمی حوالے سے نمایاں ہوئے۔اپنے بڑے بھائی کیدارناتھ شرما کے ساتھ مل کربھی اوران سے الگ ہوکربھی انہوں نے فلمی گیت نگاری اورآرٹ ڈائریکٹر کے طور پرنام پیدا کیا۔اس دوران ادبی شاعری کا سلسلہ بھی جاری رکھا لیکن اسے تب منظرِ عام پرلائے جب فلمی دنیا سے کنارا کرلیا۔ہمت رائے شرما نے **میاں آزاد کا سفر نامہ** جیسی خوبصورت پیروڈی لکھ کر رتن ناتھ سرشار کے اندازِ تحریر کو زندہ کردیا۔ان کی دو اہم کتابیں **ہندو مسلمان** اور **نکاتِ زباندانی** ہیں۔پہلی کتاب ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے جو ہندوستان میں ہندومسلم اتحاد کی اہمیت کواجاگر کرنے والی کہانیوں پر مشتمل ہے۔جبکہ دوسری کتاب ان کی اردوزبان کی لفظیات اورگرامر پر گرفت کا ثبوت ہے۔ان کا شعری مجموعہ **شہابِ ثاقب** کے نام سے شائع ہوا اس سارے ادبی کام کے ساتھ ان کا ایک اہم ادبی کریڈٹ یہ قرار پایا کہ آپ اردو ماہیے کے بانی ثابت ہوئے۔انہوں نے اوائل ۱۹۳۶ء میں فلم ''خاموشی'' کے لئے پہلی بار پنجابی لوک گیت ماہیا کواردوروپ میں پیش کرکے اردو ماہیا نگاری کی ابتدا کی۔ان کی ان ساری ادبی خدمات پرحیدرقریشی کی کتاب **اردو ماہیے کے بانی۔ہمت رائے شرما** ۱۹۹۹ء میں دہلی سے

شائع ہوچکی ہے۔اسی حوالے سے اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور سے منزہ یاسمین کے ایک تحقیقی مقالہ میں ایک پورا باب اسی عنوان کے تحت شامل کیا گیا ہے جس میں ان کی خدمات کا بجاطور پراعتراف کیا گیا ہے۔ان کے ماہیے اس وقت اردو کی کئی اہم ویب سائٹس پرآن لائن دستیاب ہیں۔

اس مختصرتعارف کے بعدعرض ہے کہ ہمت رائے شرما ایک عرصہ سے فالج کے حملہ کی وجہ سے صاحبِ فراش ہیں۔اپنے بڑے بھائی کی وفات کے بعدان کی حالت زیادہ تشویشناک ہوگئی ہے۔کچھ عرصہ پہلے تک وہ ٹیلی فون سن لیتے تھے،گفتگوبھی کرلیتے ہیں۔اب ان کے بیٹے جی۔ایچ شرما نے ممبئی سے اطلاع دی ہے کہ ان دنوں ٹیلی فون پر بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔لیکن اس کے ساتھ یہ حوصلہ افزا خبر ہے کہ وہ نہ صرف کتابیں اور رسالے پڑھ سکتے ہیں بلکہ اپنے ہاتھ سے تھوڑا بہت لکھ بھی لیتے ہیں۔ان کی اس کیفیت کے باعث اردو کے اس سائبرادبی حلقہ اردو رائٹرز کے توسط سے تمام اردوشاعروں اورادیبوں کی خدمت میں درخواست ہے کہ وہ ہمت رائے شرما کی صحت تندرستی کے لئے ،کامل شفایابی کے لئے خصوصی طور پر دعا فرمائیں۔آپ ہندوستان کے ان اہلِ دانش کی آخری کھیپ میں سے ہیں جوتہہ دل سے ہندومسلم اتحاد میں ملک کی سلامتی دیکھتے ہیں۔آپ کی دعائیہ ای میلزان کے لئے صحت کا پیغام بن سکتی ہیں۔وہ ہمارے اس ادبی حلقہ کے ممبر ہیں۔ان کا ای میل ایڈریس یہ ہے۔aptplacements@yahoo.com

ای میلز براہِ راست بھیجی جائیں یا اردو رائٹرز کے توسط سے ان تک پہنچ جائیں گی۔آپ سب کا شکریہ

نذر خلیق گورنمنٹ کالج۔خانپور(پاکستان)مورخہ ۱۰ فروری ۲۰۰۴ء

مسعود منور کا منظوم دعائیہ

ہِمّت رائے شرما کے لیے دعا

میرے مولا! بیماروں کو راحت دے

اُن کے بدن کو تاب و تواں کا صبغت دے

لوح و قلم کے مالک! مِنّت کرتا ہوں

ہِمّت رائے شرما جی کو صحت دے

مورخہ:۱۱فروری۲۰۰۴ء

ارشاد ہاشمی کے دعائیہ ماہیے

دل کی ہے دعا مولا
ہمت رائے کو
کر صحت عطا مولا

☆☆

ماہیے کی قسمت ہے
شرما صاحب کو
ماہیے سے جو نسبت ہے

مورخہ ۱۱ فروری ۲۰۰۴ء

ہمت رائے شرما جی کی جانب سے اظہار تشکر

اردو رائٹرز پر اردو ماہیے کے بانی، معروف کلاسیکل اردو شاعر اور ادیب، اور ممتاز فلمی شخصیت **ہمت رائے شرما جی** کی علالت کی خبر آئی تھی۔ اس پر ناروے سے مسعود منور اور جرمنی سے ارشاد ہاشمی نے منظوم دعائیے ریلیز کئے تھے۔ بہت سے دوستوں نے اپنے طور پر خطوط یا ای میلز کے ذریعے ان کی عیادت کی۔ ان کی حالت ابھی تک ایسی ہے کہ ٹیلی فون پر بات نہیں کر پاتے۔ لیکن مطالعہ اور تھوڑا بہت لکھنے کا کام کر لیتے ہیں۔ انہیں میں نے منزہ یاسمین صاحبہ کا اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور میں لکھا گیا تحقیقی مقالہ بھیجا تھا جس میں ان کا ذکرِ فراواں تھا۔ کتاب ملنے اور اردو رائٹرز پر اپنے لئے نیک جذبات دیکھنے اور احباب کی دعائیہ ای میلز جانے پر انہوں نے میرے نام ایک خط ارسال کیا ہے، جو نیم منظوم اور نیم نثری ہے۔ علالت کی موجودہ نازک ترین حالت میں **ہمت رائے شرما جی** کا یہ خط ان کے کاغذ اور قلم سے اور اردو زبان سے گہرے تعلق کا پتہ دیتے ہیں۔ اس میں میرے تعلق سے جو جذبات ہیں وہ درحقیقت ہم دونوں کے قلبی تعلق کے غماز ہیں، اور میرے تئیں ہمت

رائے شرما جی کی محبت کو ظاہر کرتے ہیں، وگرنہ میں گنہگار ہرگز ایسے القاب کا مستحق نہیں ہوں۔ بہرحال وہ خط اردو رائٹرز کے دوستوں کے لئے جاری کر رہا ہوں۔

آپ کی مل گئی کتاب مجھے
ہے یہ اچھی کتاب کیا کہنے — تحفۂ لاجواب کیا کہنے
منزہ یاسمیں کو داد دیجے — انہیں دل سے مبارکباد دیجے

منزہ یاسمین زندہ باد! محترمہ بہت خوب لکھتی ہیں۔ سبحان اللہ۔ مجھے تو یہ گوہرِ نایاب مل گیا ہے۔ میری صحت یابی کے لیے کی گئی دعاؤں کے سلسلے میں مجھے یورپ سے کافی پیغام ملے ہیں۔ کن الفاظ میں ان سب کا شکریہ ادا کروں۔

میرے حیدرؔ، میرے محسن میرے انمول رتن — کوئی تجھ سا نہ ملا، میں نے کئے لاکھ جتن
تُو میری روح کا سُکھ چین، میرے دل کا قرار — خط ترا آئے تو آ جاتی ہے جیون میں بہار

خدا تم کو سدا رکھے سلامت — تمہیں ہو علم و دانش کی علامت

نیا اسلوب دے اور اک نئی جوانی دے — قلم کو تیرے خدا اور بھی روانی دے

ہمت رائے شرما۔ ممبئی — مورخہ ۱۶ مارچ ۲۰۰۴ء

محمود ہاشمی (انگلینڈ)

شکریہ عجیب صاحب۔ بہت بہت شکریہ

۱۹۵۰ء کے ابتدائی سالوں میں بحری جہاز ''بوٹری'' کے ذریعے میرپور کے لوگ قطار اندر قطار انگلستان پہنچ رہے تھے اور یہاں کی فیکٹریاں جیسے بے تابی سے ان کی منتظر تھیں۔ اکا دکا یونیورسٹیوں کے پڑھے لکھے لوگ بھی آزاد کشمیر اور پاکستان کے شہروں سے قسمت آزمائی کرنے یہاں وارد ہو رہے تھے۔ لیکن ان کی اتنی مانگ نہ تھی۔ چنانچہ کچھ عرصہ بیکار ادھر ادھر گھومنے کے بعد بھی تعلیمی ڈگریوں کو اپنے سوٹ کیس میں بند کر کے کسی فیکٹری ہی کا رخ کرتے۔ پھر آہستہ آہستہ ان پڑھے لکھوں کو بسوں میں کنڈکٹر کی ملازمت ملنے لگی اور اکثر بی۔ اے اور ایم۔ اے پاس کنڈکٹر بننے لگے۔ انہیں بس کنڈکٹر کی اسمارٹ یونیفارم میں دیکھ کر ان پڑھ یا نیم تعلیم یافتہ ہم وطن بہت مرعوب ہوتے اور بس کنڈکٹر بھی ان کے درمیان اس طرح گھومتے جیسے انہیں کوئی بہت بڑی ''افسری'' مل گئی ہو۔ انہیں دنوں مجھے برمنگھم کے ایک سیکنڈری ماڈرن اسکول میں ملازمت مل گئی۔ نیا نیا ٹیچر بنا تو ایک دن فیکٹری میں کام کرنے والے میرے ایک میرپوری بھائی نے مجھ سے پوچھا ''کیا یہاں ٹیچروں کی بھی وردی ہوتی ہے؟''
جب میں نے بتایا۔ کہ ٹیچر وردی کے بغیر ہی کام کرتے ہیں تو اس نے مجھے کچھ اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔
''پھر یہ نوکری کس کام کی؟''

میں اس کی سادہ لوحی پر مسکرایا اور اس کے بعد یہ بات ایک لطیفہ کے طور پر مجھے اکثر یاد آتی رہی۔ لیکن جلد ہی یہ لطیفہ لطیفہ نہ رہا اور میں سوچنے لگا۔ کہ وردی تو اسکولوں میں بھی ہوتی ہے۔ یہاں کے قریب قریب ہر اسکول میں بچوں کے لئے ایک یونیفارم مخصوص ہے۔ ہمارے ہاں کے پگڑی بدل بھائیوں کی طرح برطانیہ میں اسکول ٹائی کے بھائی چارے بہت مشہور ہیں۔ بڑے بڑے اسکولوں میں ٹیچر لوگ کلاس روم میں اپنا یونیورسٹی گون Gown پہن کر جاتے ہیں۔ جو ایک طرح سے وردی ہی ہے۔ جن اسکولوں کے اساتذہ اپنے فرائض منصبی عام لباس میں ادا کرتے ہیں ان سے توقع کی جاتی ہے۔ کہ ان کا لباس ایک ایسے باوقار رجحان کی آئینہ داری کرے گا جس کی پیروی ان کے شاگرد اپنی آئندہ زندگی میں کریں گے۔ اس ملک میں ملکہ اور اس کے لارڈز کا بھی کوئی نہ کوئی مخصوص لباس یا وردی ہوتی ہے۔ جسے وہ سرکاری تقریبات میں پہنتے ہیں۔ سرکاری تقریبات میں ملکہ بھی ہیروں اور جواہرات سے اٹا ہوا اپنا بھاری بھرکم تاج سر پر سجاتی ہے۔ لیکن عام زندگی میں وہ اور دوسرے شاہی افراد عام

لباس پہنتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے۔ کہ ان کا یہ عام لباس کچھ اس وضع سے تیار کیا جاتا ہے کہ وہ عوام الناس کے لئے ایک مثال بنے۔ ملبوسات کے نت نئے فیشن اور جدت طرازی کا منبع ملکہ اور اس کے کنبہ کے افراد کا لباس ہی ہوتا ہے۔ فرد کی آزادی جیسے تصورات اور وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں نے ہاؤس آف لارڈز سے لارڈز کی وردی چھین لی ہے۔ تاہم خاص خاص موقعوں پر اب بھی وہ مخصوص لباس پہن کر اپنی خاندانی روایات کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

میں وردی کی اہمیت اور مخصوص لباس کی عظمت سے سب سے زیادہ متاثر اس وقت ہوا جب برطانیہ کی صدیوں پرانی روایات پر نئے جمہوری تقاضوں نے دھاوا بولا، برطانیہ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ بریڈفورڈ کے شہر میں ایک ایشیائی لارڈ میئر چنے گئے اور میں نے اپنے عجیب صاحب کو لارڈ میئر کے روایتی لباس میں دیکھا۔ معلوم ہوا کہ لارڈ میئر کا لباس ان کا خادم خاص ہر صبح انہیں بڑے اہتمام سے پہناتا ہے۔
برطانیہ کے ہر قصبے کا میئر اور سٹی کا درجہ رکھنے والے شہر کا لارڈ میئر اس قصبے یا شہر میں برطانیہ کا ذاتی نمائندہ ہوتا ہے اور اپنے شہر کے قد و قامت اور اس کے سالانہ بجٹ کے تناظر میں اسے اس طرح کی مراعات اور احترام حاصل ہوتا ہے۔ جو ملکہ کے شایان شاں ہے۔ یہی وجہ تھی۔ کہ جب ۱۹۸۵ء میں ہمارے عجیب صاحب کو یہ اعزاز ملا۔ تو برطانیہ کی تاریخ کا یہ اتنا بڑا واقعہ تھا۔ کہ ساری دنیا کے اخبارات، ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر اس کا چرچا ہوا۔ برطانیہ کے قریب قریب ہر اخبار نے اس پر اڈیٹوریل لکھا۔
میں نے عجیب صاحب کو لارڈ میئر کے ملبوس میں دیکھا تو محسوس کیا کہ وردی کے اندر چھپی ہوئی شخصیت اپنے ہم وطنوں کو جو بس کنڈکٹری ہی میں مگن تھے شاعر اقبال کے الفاظ میں یہ پیغام دے رہی ہے:

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا   ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے

وطن عزیز سے بی۔ اے۔ کرنے کے بعد عجیب صاحب جب ۱۹۵۷ء میں برطانیہ پہنچے تھے تو انہوں نے بھی نئی زندگی کا آغاز بس کنڈکٹری سے ہی کیا تھا۔ لیکن انہوں نے اس پر قناعت نہ کی۔ اور ''تنگی داماں'' کا علاج زیادہ سے زیادہ پونڈ کمانے میں ہی تلاش نہ کیا۔ ورنہ وہ زمانہ ایسا تھا جب زیادہ سے زیادہ پونڈ جمع کرنا ہی ہماری نظر میں زندگی کی سب سے بڑی حقیقت تھی۔

اسی ۱۹۵۷ء کی بات ہے۔ مجھے ایک ایسے گھر میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں صاحب خانہ کرنسی کا کاروبار کرتے تھے۔ اور اپنے ہم وطن مزدوروں کی کمائی کے پونڈ وطن عزیز میں ان کے لواحقین کو روپوں کی شکل میں پہنچاتے تھے۔ ہمارے ہاں جس طرح رشوت دینے والا صرف رشوت لینے والے ہی کو برا سمجھتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں رقم بھیجنے والا خود تو بڑے اطمینان سے اپنے پونڈ بلیک کرنسی والے کے حوالے کر کے سرکاری شرح سے زیادہ پر اپنی رقم گھر بھیج دیتا تھا۔ لیکن جس کے ذریعے یہ زرمبادلہ طے پاتا تھا اسے بلیکیا، سمگلر اور ملک اور قوم کا دشمن

بھی سمجھتا تھا ۔لیکن جب اس کے گھر میں ہر ہفتہ اور اتوار کو پونڈوں سے بھرے ہوئے سوٹ کیس اور گھر کے سامنےاس زمانے کی سب سے مہنگی کار ''ذی فر'' دیکھتا تو دل ہی دل میں اس کی قسمت پر رشک بھی کرتا تھا۔ ان دنوں بیوی بچوں کو یہاں منگوانے کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔صرف گنے چنے کنبے آرہے تھے۔ مجھے صاحب خانہ نے بتایا کہ ان کے بچے پاکستان سے یہاں آ گئے ہیں۔انہوں نے اپنے ایک سات آٹھ سال کے بچے سے میرا تعارف کرایا۔اور بتایا کہ بچہ بہت ذہین ہے۔اس کے بعد انہوں نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا کہ میں ان کے اس نونہال سے پوچھوں۔کہ وہ بڑا ہوکر کیا کرے گا۔میں نے پوچھا۔تو اس نے تن کر بڑے اعتماد سے کہا''میں بلیک کرساں''یعنی''میں بلیک کروں گا ''۔اس پر حاضرین محفل کی باچھیں کھل گئیں۔

ہم''بلیک کرنے''ہی کو زندگی کی معراج سمجھنے کے مرحلہ سے ہوتے ہوئے اور برطانیہ کی بس کنڈکٹری میں اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے کی منزلوں سے گزر کر اب بہت آگے آ چکے ہیں۔مختلف شہروں کی کونسلوں میں ہمارے کونسلروں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔بعض قصبوں میں ایشیائی میئر بھی اپنے گلے میں میئر کا روایتی طلائی ہار پہنے نظر آتے ہیں۔ سٹی کا درجہ حاصل کرنے والے شہروں میں بریڈفورڈ کے بعد اب شیفیلڈ میں راجہ قربان حسین صاحب اور ناٹنگھم میں محمد ابراہیم صاحب بھی لارڈ میئر بن چکے ہیں۔ ہاؤس آف لارڈز میں ہمارے نذیر احمد صاحب بھی پہنچ گئے ہیں۔۱۹۸۵ء میں لارڈ میئر بن کر عجیب صاحب نے جس منزل کا ہمیں نشان بتایا تھا ہم میں سے اکثر اولوالعزم اب اسی راہ پر گامزن ہیں۔لیکن یہ کہنا غلط ہوگا۔کہ عجیب صاحب نے لارڈ میئر بن کر ہمیں صرف لارڈ میئر بننے کی ترغیب دی تھی۔حقیقت یہ ہے۔کہ ان کی مثال سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے۔کہ اگر جذبہ دل صادق اور ارادے میں پختگی ہو تو آخری منزل صرف لارڈ میئر کا چیمبر ہی نہیں۔ بلکہ'' ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں''............عجیب صاحب کے اعزاز نے ہمیں بھی معزز بنا دیا۔ہم میں خود اعتمادی پیدا کی۔اور ہمیں یہ شعور دیا۔کہ اپنی دلچسپی اور شوق کے مطابق ہم اپنی منزل کا تعین کر کے اسے حاصل بھی کر سکتے ہیں۔

شکریہ عجیب صاحب۔بہت بہت شکریہ۔کہ آپ نے ہمیں راہ دکھائی!

جن دنوں عجیب صاحب نئے نئے لارڈ میئر بنے تھے اپنے ایک کونسلر نے مجھ سے کہا تھا۔کہ''اس ملک میں جمہوریت ہے۔ دیکھ لیجئے گا۔ایک دن ہم ان کی جمہوریت کے بل بوتے پر اس ملک کی سیاست پر چھا جائیں گے۔جس طرح امریکہ میں یہودیوں کو خوش رکھے بغیر کوئی شخص امریکہ کا صدر نہیں بن سکتا۔اسی طرح ایک دن آئے گا۔جب یہاں کے وزیر اعظم کی کامیابی کا انحصار ہم پر ہوگا۔اور کون جانے ایک دن ہم میں سے ہی کوئی یہاں کا وزیر اعظم ہو۔''

کون جانے؟

خدا کرے۔ایسا ہی ہو!

انشائیہ

پروفیسر سید زوار حسین شاہ (بہاول پور)

نیند

نیند سے کسی بندہ بشر کو مفر نہیں۔آپ حسبِ معمول دفتر سے بھاگ سکتے ہیں، کتابوں کو ہاتھ لگانا ترک کر سکتے ہیں، ملائے مسجد کو سات سلام کر سکتے ہیں (اگرچہ آسان نہیں) رات کا کھانا اور دن کا ظہرانہ حکم حاکم پر چھوڑ سکتے ہیں، بھاگتے چور کی لنگوٹی کو کھینچ سکتے ہیں، مگر نیند سے بے زاری کا اظہار نہیں کر سکتے۔ نیند سے اگرچہ آپ نے دوستی کر لی ہے تو سفر ہو یا حضر، دفتر ہو یا گھر، خلوت ہو یا جلوت، نیند آپ کے جلو میں ساتھ ساتھ چلتی ہے۔مگر اسے آپ گاڑی کے چلنے اور دماغ کے چل بچل ہونے سے تعبیر نہیں کر سکتے۔آپ لاکھ چاہیں کہ نیند سے چھٹکارہ ملے مگر امکان کے در آنکھوں کی طرح بند ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔پھر نیند سے نفرت کیسی؟ کہ یہ بے کاری کا بہترین مشغلہ ہے اور مشغلہ بھی ایسا کہ جس میں جان و مال کی قربانی نہیں دینا پڑتی، محنت درکار نہیں، سوچنا نہیں پڑتا اور عمل نہیں کرنا پڑتا۔ادب سے دلچسپی کے لیے کلاسیک کیا کچھ بھی نہیں پڑھنا پڑتا، مذہب سے لَو نہیں لگانا پڑتی۔دوستوں کو اکٹھا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔نیند اور بندہ تنہائی میں ہی راز و نیاز کی باتیں کر لیتے ہیں۔دشمنوں سے بچاؤ کے منصوبے نہیں بنائے جاتے یعنی یہ نیند ہی ہے جو دین و دنیا کے معاملات سے آزاد کرتی ہے۔نیند کوئی خطرناک قسم کا مشغلہ نہیں جس میں ظالم حکمران کے سامنے کلمہ حق بلند کرنا پڑے۔قلعے تعمیر نہیں کرنا پڑتے۔حتیٰ کہ ہوائی قلعوں کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔نیند ہے کہ بندے کو فکر و فقر سے آزادی عطا کرتی ہے۔کچھ صرف نہیں کرنا پڑتا۔سوائے وقت کے۔اور وقت ہر امیر غریب کے پاس یکساں ہے۔جو نہ علم کی طرح حاصل کرنا پڑتا ہے نہ رزق کی طرح کمانا پڑتا ہے۔

کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔اس کہاوت میں اتنی ترمیم کی ضرورت ہے کہ نیند آتی ہی سولی پر ہے۔بلکہ ابدی و ازلی نیند کے ذائقوں سے تو سولی پر چڑھنے والا ہی لطف اندوز ہوسکتا ہے یہ اور بات ہے کہ نیند سے پیار کرنے والا ابدی نیند سے دور بھاگتے ہیں اور بھاگتا وہی ہے جس کے پاس مقابلے کی قوت نہ ہو۔مگر ایسے شکست خوردہ کا نیند تعاقب کرتی ہے۔اور جب بھی موقع ملتا ہے دبوچ لیتی ہے کسی آسان اور کمزور شکار کی طرح۔یوں تو عمومی زندگی میں نیند اور نحوست کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔نیند آتی ہے تو نحوست اس کے ہم رکاب ہوتی ہے یا کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ نحوست پہلے آتی ہے اور نیند بن بلائے مہمان کی طرح بعد میں آتی

ہے۔اور بن بلایا مہمان تو آپ جانتے ہی ہیں نہ آتا آپ کی مرضی سے ہے نہ جاتا آپ کی مرضی سے ہے۔ نینداور نحوست جہاں رین بسیرا کرلیں وہاں سے بیداری اور بخت کوچ کر جاتے ہیں۔ جیسے تیسری دنیا کے غریب ممالک سے اہلِ علم اور ہنرمند افراد یورپ اور افریقہ سفر کر جاتے ہیں۔

نینداور بیداری دو مختلف مزاجوں کے مہمان ہیں ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ان کے تعلقات نہایت کشیدہ ہوتے ہیں کسی روایتی ساس اور بہو کی طرح۔ نیند کو گھر کی بہو اور بیداری کو ساس کہہ دیا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ ساس سمجھتی ہے کہ بہو گھر میں معزز مہمان یا مالک مکان بن کر نہ رہے بلکہ خادم بن کر رہے مگر بہو ہے کہ ساس کی ایک نہیں سنتی۔ یہی حال نیند کا ہے کہ عادت سے مجبور ہو کر گھر کی مالک بن بیٹھتی ہے۔ عادات پر قبضہ، اعصاب پر قبضہ، دماغ پر قبضہ، دن پر قبضہ، رات پر قبضہ، غرض یہ کہ نیند بندے کو بے بس کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس بیداری کو دیکھو ساری صفات معزز و محترم مہمان کی طرح رکھتی ہے کہ ذرا میزبان نے التفات میں کمی کی، ذرا میزبان کے ماتھے پر بل آیا۔ ذرا یہ دیکھا کہ میزبان کاہلی اور سستی کا شکار ہو رہا ہے، بیداری نے کوچ کا اعلان کر دیا۔ نیند کی طرح قابض اور غاصب کا روپ ہرگز نہیں دھارتی۔ نیند ہے کہ میزبان کا سارا کاروبار ہی اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ آپ لاکھ کوشش کریں نیند سے نجات ملے مگر کیا مجال نیند آپ کو آزادی کا سانس لینے دے۔ آپ بیوی اور برہمن سے معذرت کر سکتے ہیں مگر نیند سے ہرگز نہیں۔

نیند باطل کی طرح حق کا لباس پہن لیتی ہے۔ شعور کو شرارت کا نام دیتی ہے۔، اپنے شکار کو تھپکتی ہے، لوری دیتی ہے کہ سو رہو ابھی کچھ نہیں ہوا۔ نیند کے ماتوں کے لبوں پر مہر سکوت لگا دیتی ہے۔ اس کا شکار کوئی قوم ہو یا کوئی فرد واحد، خوابِ خرگوش کے مزے لیتے رہتے ہیں مگر جیسے ہی کوئی اخلاقی طور پر دیوالیہ ہوا' معاشی طور پر بدحال ہوا' ذہنی طور پر مفلوج ہوا، نیند کسی ہولے درجے کے خوشامدی اور چاپلوس کی طرح غائب ہو جاتی ہے۔ اسی کیفیت کو حکماء نے نیند اُڑنے سے تعبیر کیا ہے۔ نیند جب اپنے ماتے کی ساری قوتیں سلب کر لیتی ہے تو کسی بھرے پُرے گھر کا رُخ کرتی ہے کسی مغربی سرمایہ کار یا سفارت کار کی۔ مغربی سفارت کار یا سرمایہ کار بھی عجیب ہوتے ہیں جس ملک یا قوم کا رُخ کرتے ہیں وہاں کے ہوش مند طبقے کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں اور جن کی نیندیں حرام ہو جائیں دنیا کا کوئی مذہب یا مذہبی پیشوا انہیں حلال قرار نہیں دے سکتا۔ کیونکہ حلال کو حرام قرار دینے کی ہر کوشش اور خواہش حرام ہوتی ہے۔ چاہے حرمِ کعبہ کے اندر ہی کیوں نہ ہو۔

نیند کو معمولی اوزار یا اعزاز نہ سمجھنا یہ پل بھر میں غریب سے غریب آدمی کے لیے عیش و عشرت کے سارے سامان مہیا کر دیتی ہے۔ آسمانوں کی سیر، زمین کی تسخیر، انواع و اقسام کے میوہ جات، جدید ساز و سامان سے آراستہ و پیراستہ گھر، تابع فرمان غلام و خدام، لچکتی مٹکتی لونڈیاں، حسیناؤں کا جھرمٹ، اس جھرمٹ میں آپ یہ سب کچھ جاگتی آنکھوں سے ممکن نہیں۔ نیند یہ سب کچھ آپ کا کوئی پائی پیسہ خرچ کرائے دیتی ہے۔ سوائے خدا کے

کوئی اتنی بڑی عنایت کا روادار نہیں ہوسکتا۔ نیند ہی نیند میں دنیا کے سارے کھیل آپ کھیل سکتے ہیں۔ بہت سے کھیلوں سے تو آپ متعارف ہی نیند کے ذریعے ہوتے ہیں۔ امریکہ و یورپ کی پسپائی، رقیبوں کی رسوائی، ہاکی، کرکٹ، جمناسٹک سمیت تمام گفتہ و ناگفتہ بہ کھیلوں اور کھلاڑیوں سے ہماری آشنائی کا منظر نامہ صرف نیند کے ذریعے ممکن ہے۔ یہ نیند ہی ہے جو طالب علم سے کتاب چھین کر اُس پر آرام و آسودگی کے در وا کرتی ہے۔

اپنی اپنی سوچ اور اپنی اپنی فکر کے مصداق کوئی نیند کو تنہائی اور رسوائی کا ساتھی کہتا ہے تو کوئی اسے بلائے بے درماں کے لقب سے نوازتا ہے۔ نیند کے ستائے ہوئے کی روداد سنو تو کہتا ہے! یاوری قسمت سے صدرِ محفل بناؤ نیند کی دیوی کو منظور نہ تھا۔ نیند کی دیوی کا نزول ہوا۔ میں نے سر کو جھٹکے دیئے۔ ڈراؤنے خیالات و تصورات کو ذہن میں جگہ دی، تصور ہی تصور میں دیکھا کہ سانپ میرے بالکل قریب آ گیا ہے۔ مگر آنکھیں نہ کھلیں۔ پھر سوچا چلو شیش ناگ یا مقامی پولیس انسپکٹر کا خیال ذہن میں لاؤں مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ میں نے خود کو ہلکے ہلکے چپت بھی لگائے دوسروں کی نظر بچا کے۔ اپنے بال نوچے۔ پھر میں نے سوچا سیکرٹری پر غلط تلفظ کی پاداش میں اچانک انڈوں کی بارش ہونے لگی ہے۔ یا پھر یہ کہ میرا لاڈلا بیٹا کنویں میں گر گیا ہے، ہمسائے کے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، ہڈی پسلی ایک ہوگئی ہے۔ میری لاٹری نکل آئی ہے۔ آزاد نظم اور نثری نظم لکھنے پر دنیا بھر میں پابندی لگا دی گئی ہے۔ میرے دشمنوں پر آگ اور مجھ پر ہُن برسنا شروع ہو گیا ہے۔ پہاڑوں نے اپنے خزانے اُگل دیئے ہیں۔ عوام نے بھی اہلِ محفل کی طرح مجھے اپنا صدر منتخب کر لیا ہے۔ یہ اور اس جیسے تصورات میری نیند کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ پھر واقعات کو یوں ذہن میں لایا: ''ہائے اللہ توبہ اُس نے بندریا کو کتنا نچایا کہ ہلکان ہوگئی صرف روٹی کے واسطے۔ غریب کے ساتھ یہ ناروا سلوک۔ ارے بندریا اور بندہ کس قدر چیخ رہے تھے۔ مگر بندریا کو ناچنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ بندے کو ذرا بھی تو ترس نہیں آ رہا تھا، حیوانوں پر ظلم کرتے ہیں اُن پر کوئی آفت بھی تو نہیں آتی۔ اللہ توبہ یہ بھی کوئی زندگی ہے، ایک کا حق مار لیا دوسرے سے رقم بٹور لی۔ تیسرے کو دھوکہ دے دیا۔ اللہ توبہ! لوگ بھی کس قدر رجعت پسند ہو گئے ہیں۔ فیض جیسے عظیم شاعر کو ابھی سے بھلا دیا ہے۔ غزل و نظم کا یکساں بڑا شاعر ہے۔ مگر غالب کی بات ہی کچھ اور ہے۔ فیض کو غالب پر فوقیت دینے کا کوئی جواز نہیں۔ اقبال بھی تو کچھ کم نہیں خواہ مخواہ مغرب زدہ طبقہ انہیں رگیدتا ہے۔''

مگر سب حربے ناکام ہوئے اور میں ناکام صدر ثابت ہوا۔

اس سے پہلے کہ نیند کی دیوی کا نزول ہو اور میں بھی میٹھی نیند سو جاؤں یا پھر کوئی بندۂ خدا میری نیند چرانے اور نیت میں خلل ڈالنے کی کوشش کرے کیوں کہ ہر عمل کا دار و مدار نیت پر ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میری نیت اور اپنی ذہنی صحت پر شبہ نہ کریں گے۔ میں آپ کو نیند اور نیت کے حوالے کرتا ہوں۔

حیدر قریشی

میرا پہلا ادبی حوالہ

صادق باجوہ کی شاعری

اپنے ابتدائی بچپن میں ادبی اثرات جذب کرنے کے حوالے سے میں نے مختلف اوقات میں جن قریبی عزیز شخصیات کا ذکر کیا ہے، ان میں اباجی کا میرے اسکول جانے سے پہلے مجھے اردو پڑھنا لکھنا سکھانا، امی جی کا اردو ناول شوق سے پڑھنا اور ایک طویل پنجابی نظم لکھنا، ماموں ناصر کی گفتگو میں ادب کا گہرا تاثر ملنا شامل ہیں۔تاہم ماموں صادق میرے ننہالی خاندان میں واحد شخصیت ہیں جن کو میں نے بچپن میں ہی شاعر کے طور پر دیکھا اوران کی شاعری سمجھ میں آئی یا نہیں آئی لیکن ان سے متاثر رہا۔اس حوالے سے میں جن مختلف اوقات میں ان کا ذکر کر چکا ہوں۔، پہلے ان میں سے دو اہم حوالے یہاں پیش کرتا ہوں۔

☆☆ بچپن میں سنا کرتے تھے کہ میرے چھوٹے ماموں حبیب اللہ صادق صاحب (حال مقیم امریکہ) شاعر ہیں۔ان کی شاعری تو ہماری جوانی سے پہلے ہی ختم ہوگئی لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں بچپن میں ماموں صادق کو ہمیشہ حیرت اورخوشی کے ساتھ دیکھا کرتا تھا اوراس بات پر خوش ہوتا تھا کہ میرے ایک ماموں شاعر ہیں۔

(بحوالہ سخنور حصہ دوئم۔۱۳۳۔مطبوعہ مہر فاؤنڈیشن۔امریکہ)

☆☆ میرے بچپن ہی میں ماموں حبیب اللہ صادق کا شاعر ہونا۔میں سمجھتا ہوں میرے بچپن کے یہ سارے عوامل میری ادبی تربیت کا سبب بنتے رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے یہ۱۹۶۴ءیا۱۹۶۵ءکا زمانہ تھا۔میں چھٹی ساتویں میں پڑھتا تھا۔ماموں صادق ڈیرہ اسماعیل خاں سے ہمارے ہاں خانپور آئے تھے۔تب شام کے وقت میں نے اوراباجی نے ان سے ان کی ایک نظم سنی جو ویت نام کے موضوع پر تھی۔اس کا مرکزی مصرعہ میرے ذہن میں یوں رہ گیا ہے۔

زندہ باد اے ویت نام

ماموں صادق کا ترنم شاعرانہ انداز کا تھا۔مجھے اپنی وہ حیرت آج بھی یاد ہے جب میں ماموں صادق کی نظم سنتے ہوئے انہیں دیکھ رہا تھا اوراس دیکھنے میں ایک عجیب سی خوشی اور تفاخر کا احساس شامل تھا کہ میرے ایک ماموں شاعر ہیں! (کھٹی میٹھی یادیں۔مطبوعہ دوماہی گلبن احمد آباد)

میرے اس لکھے کا اتنا فائدہ ہوا کہ صادق باجوہ کے نام سے لکھنے والے میرے ماموں صادق کوتھوڑی تحریک

ہوئی۔میرے مسلسل اصرار کے بعد انہوں نے پاکستان سے اپنی بعض پرانی ڈائریاں تلاش کرائیں۔یوں مجھے ان کی شاعری تک رسائی کا موقعہ ملا ہے۔عام قارئین کے لئے اس شاعری میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوگی۔لیکن میرے لئے یہ اس لئے غیر معمولی ہے کہ میرے بچپن میں زندگی کا پہلا شعوری اور باقاعدہ ادبی حوالہ ماموں صادق بنتے ہیں۔ نصابی کتب سے باہر کسی دوسرے شاعر کو پڑھنے سے پہلے سب سے پہلے مجھے ماموں صادق کو سننے کا موقعہ ملا اور میرے ذہن پر ایک نقش سا بن گیا۔ان کی شاعری کو پیش کرتے ہوئے میں یہاں ان کی وہ نظم درج کر رہا ہوں جو میرے ذہن میں ''زندہ باد اے ویت نام!'' کے طور پر محفوظ تھی۔

ویٹ کانگ حریت پسندوں سے

زندہ باد اے ویٹ کانگ! اے رہنمائے ویٹنام!
زندہ قوموں میں ہو شامل مل گیا اعلیٰ مقام
ہے عدو مجبور کرنے کو تمہارا احترام
مٹ رہی ہیں سامراجی طاقتیں باطل نظام
زندہ باد اے ویٹ کانگ! اے رہنمائے ویٹنام!

خون کی ندیاں تمہاری راہ میں حائل نہیں
ایٹمی ہتھیار سے ڈرنے کے تم قائل نہیں
ہاں! غلامی بھی تمہاری سمت اب مائل نہیں
ظلم و استبداد کی تلوار ہے گو بے نیام
زندہ باد اے ویٹ کانگ! اے رہنمائے ویٹنام!

چھین لو تم غاصبوں سے وقت ہے اپنی زمیں
نوچ ڈالو ان کے جسموں سے قبائے شرمگیں
سینکڑوں جانیں نثارِ حریت! صد آفریں
ساری دنیا کی نظر میں ہے تمہارا احترام!
زندہ باد اے ویٹ کانگ! اے رہنمائے ویٹنام!

میرے لئے خوشی کی بات ہے کہ ماموں صادق نے نہ صرف اپنی پرانی شاعری تلاش کر کے مجھے فراہم کر دی بلکہ اب وہ کچھ نئی نظمیں اور غزلیں بھی کہنے لگے ہیں۔میں اپنے ماموں صادق سے بچپن سے متاثر ہونے کے اعتراف کے طور پر ان کی شاعری کا ایک حصہ (۲۰غزلیں) یہاں پیش کر رہا ہوں۔

التجا

دل میں مرے چاہت کی نئی آگ لگا دے
دیکھوں تجھے صد شوق سے پردہ تو ہٹا دے

عاصی ہوں، خطا کار ہوں تعزیر کے لائق
رحمت کا طلبگار، تلاطم سے بچا لے

ہر سمت اٹھی جاتی ہیں خاموش نگا ہیں
شاید ہو کہیں دیدۂ ور کوئی شِفا دے

ہر درد والم، فکر و بلا، جور و جفا پر
ہوتا ہے گلہ موڑ کے منہ جود و عطا سے

ہر شخص کا اندازِ تفکّر ہے نرا لا
ہوتا رہے جو ہونا ہے اب میری بلا سے

خوابیدہ ہوئے پھر سے مقدر کے ستارے
اے کاتبِ تقدیر مرے بھاگ جگا دے

ہوتی ہے دعاؤں میں بھی تاثیر تو صادق
زندہ تو دعاؤں کو کرو اشک بہا کے

☆☆

کشتیِ دل نذرِ طوفاں ہوگئی
جاگ اے قسمت! کہاں تو سو گئی

مدتوں سے نوحہ گر تھی بے بسی
کِشتِ دل میں تخمِ وحشت بو گئی

غم سے تھے لبریز اشکوں کے چراغ
روشنی ان کی بھی مدھم ہو گئی

یک بیک کیا یاد ان کی آ گئی
دل کی دھڑکن تیز تر پھر ہو گئی

کیا کروں تنہائیوں کا اب علاج
میری تنہائی بھی تنہا ہو گئی

ہر گھڑی صادق! جو تھی دل کے قریں
جانے کیوں وہ آرزو بھی کھو گئی

☆

ہر دریچے در و دیوار پہ تنویر ہوئی
بستیٔ دل میں تری جب سے ہے تعمیر ہوئی

بزمِ اغیار میں گویائی کا یارا تھا کسے
بے نوائی ہی مگر باعثِ تعزیر ہوئی

دستِ قدرت نے ہمیں دیکھئے کیا سونپا ہے
کتنے خوابوں کی حسیں ایک ہی تعبیر ہوئی

دست و بازو پہ بہت ناز مگر بھولے ہیں
پہلے تقدیر ہے پھر بعدہ تدبیر ہوئی

دور گزرے ہیں مگر حق کے لئے تو اب بھی
جاں کا نذرانہ دیا سنّتِ شبّیرؓ ہوئی

بھولنا جب بھی اسے چاہا بھلا یا نہ گیا
بھول جانے کی ادا یاد کی زنجیر ہوئی

جس نے دیکھا ہے کبھی، یاد سدا رکھا ہے
دل میں آنکھوں میں سجی روضے کی تصویر ہوئی

جرم سرزد نہ ہوا اہلِ وفا سے صادق!
خوئے تسلیم و رضا مُوجبِ تکفیر ہوئی

☆

بندگی مرضیٔ معبود ہوا کرتی ہے
اک رضاجوئی ہی مقصود ہوا کرتی ہے

سجدہ گہہ کو تو نہیں وصلِ جبیں کی حاجت
اک لگن حاصلِ مسجود ہوا کرتی ہے

ڈھونڈتے جس کو خلاؤں میں رہے، وہ ہستی
پاس شہ رگ کے ہی موجود ہوا کرتی ہے

غم و آلام و مصائب سے تعلق پیہم
خوش نصیبی ہے جو محدود ہوا کرتی ہے

ہے یہ دستور یہاں بامِ ترقی کے لئے
راہ ہر گام پہ مسدود ہوا کرتی ہے

جب براہیمؑ نما کوئی وجود آتا ہے
شعلہ زن آتشِ نمرود ہوا کرتی ہے

چند لمحاتِ مسرت بھی غنیمت صادق
ساعتِ سعد بھی محدود ہوا کرتی ہے

☆

کوئی دل میں کہیں بسا سا رہا
سارے آنگن میں رتجگا سا رہا

دل رہینِ غمِ وفا سا رہا
کس قدر اس کوحوصلہ سا رہا

وہ جو سب سے جدا جدا سا رہا
اک وہی اپنا آشنا سا رہا

اک قیامت کا شور تھا پہلے
پھر تو دل کچھ ڈرا ڈرا سا رہا

سب جہاں پالیا تو کچھ بھی نہیں
وہ اگر کچھ خفا خفا سا رہا

سن کے رُودادِ غم زمانے کی
جانے کیوں دل بجھابجھا سا رہا

عظمتیں رِفعتیں ملیں اس کو
جو ترے در پہ خاکِ پا سا رہا

جب سے صؔادق غموں کو اپنایا
حشر سینے میں کچھ بپا سا رہا

☆

لذتِ درد و غم شناسائی
ہیں علاماتِ بزم آرائی

جب بھی امید کوئی بر آئی
آرزوؤں نے لی ہے انگڑائی

کتنی محدود ہو گئی دنیا
حسنِ ایجاد کی پذیرائی

گو بہاروں سے رونقِ گلشن
ہے خزاں کی جدا ہی رعنائی

نام لیوا وفا کے ہیں اب بھی
گرچہ عنقا ہے عہد ایفائی

داستاں ظلم و خونچکاں سن کر
جانے کیوں آنکھ اپنی بھر آئی

دَور بدلے مگر رہا صؔادق
نام تہذیب، کام قبلائی

☆

زندگی نغمہ سرا ہو جائے
'درد کی کوئی دوا ہو جائے'

ہر گھڑی وقتِ دعاہو جائے
یہی مقبول دعا ہو جائے

آہ مظلوم کی جب بھی نکلے
عرش تک حشر بپا ہو جائے

منتظر لوگ تو رہتے ہیں سدا
سر پہ کب ظِلِّ ہما ہو جائے

بحرِ افکار میں غلطاں ہے بشر
سوچ ہر حد سے سَوا ہو جائے

کوئی لمحہ جو خطا میں گزرے
کاش ! وہ لمحہ خطا ہو جائے

☆

پردۂ ظلمات تا حدِّ نظر
شب کی تاریکی سے نکلے ہے سحر

کس قدر اس کی کرشمہ سازیاں
سیپیوں کی کوکھ سے پیدا گہر

وقتِ رخصت آشکارا ہو گیا
زیست کا ہر لمحہ کتنا مختصر

ہے کرم در کا سوالی ہو گیا
ہر متاعِ دو جہاں سے بہرہ ور

ہے تخیّل کی رسائی کا کمال
لمحہ بھر میں طے ہو صدیوں کا سفر

امن کی خاطر روا ظلم و ستم
عصرِ حاضر کی سیاست الحذر !

ظلم کا خوگر نئے بہروپ میں
دندناتا پھر رہا ہے بے خطر

کیاکہیں صؔادق کوئی کام آگیا
بزمِ ہستی پھر ہوئی ہے منتشر

☆

جو دل سے نکلے ہوں نغمات ان کی بات کہاں
سنانے بیٹھ بھی جائیں تو اتنی رات کہاں

عجیب دورِ اسیرِ غرض سے ہے رشتہ
خلوص و مہر و محبت وہ التفات کہاں

نَفَس نَفَس سے صدائے غرور و کِبر اٹھی
فریب و مکر و ریا ہیں نواز شات کہاں

خود اپنی ذات کے گرداب میں پھنسا ہے بشر
نصیب فرصتِ پروازِ شش جہات کہاں

تمام عمر جسے پا کے پھر بھی پا نہ سکے
وہ ایک لمحہ گراں مایۂ حیات کہاں

سکونِ قلبِ حزیں ہی میں عمر بیت گئی
حصولِ مقصدِ تخلیقِ کائنات کہاں

تلاش و فکر و امید و رجا رہی صؔادق
بسر جو چین وسکوں سے ہو وہ حیات کہاں

☆

تلخ و شیریں یادوں کے سایوں سے دل بہلایا ہے
جانے دل کو کس کی لگی اس رِیت کو کیوں اپنایا ہے

دیس بدیس کے ساتھی سنگی اک اک کر کے دور ہوئے
لاج وفا کی رکھی کس نے، کس نے غم اپنایا ہے

قوم کے درد و غم تو باہم بانٹ لیا کرتے ہیں لوگ
ہم کو دشمن کے دکھ درد نے بھی اکثر تڑپایا ہے

مہرو ماہ کی تابانی کچھ دھندلی دھندلی ہے شاید
کیا کوئی آفت ٹوٹ پڑی جس نے ان کو گہنایا ہے

اپنی ہستی سے غافل تسخیرِ جہاں میں گم ہے بشر
سوچ کے دھاروں میں غلطاں یہ سوچ بھی اک سرمایہ ہے

دنیا میں رشتے بندھن احساس سے قائم ہیں صؔادق
جب یہ مالا ٹوٹ گئی پھر ہر رشتہ کملایا ہے

☆

مرقدوں پر چراغ جلتے رہے
مفلسوں کا دِیا بجھا ہی رہا
قدر سنگ کی تو ہے مگر انساں
پسِ دیوار و در پسا ہی رہا
کس قدر قدرِ نا شنا سی ہے
نہ بچا کچھ تو پھر خدا ہی رہا
ہر گھڑی ساتھ ساتھ رہتا ہے
گھپ اندھیرے میں وہ جدا ہی رہا
کون جانے وہ کس گھڑی آئیں
منتظر راہ دیکھتا ہی رہا
روزِ محشر ہو فکر کیوں اس کو
جو ثنا خوانِ مصطفےٰ ﷺ ہی رہا
سر بلندی وہ سرفرازی کہاں
جس میں انساں کا سر جھکا ہی رہا
خوئے ایثار و بوئے صدق و رضا
گلِ وفا کا سدا کھلا ہی رہا
کتنے بت ہیں چھپے جنہیں انساں
بے خیالی میں پوجتا ہی رہا
اپنی پہچان بھول کر صؔادق
در بدر خاک چھانتا ہی رہا

☆

پتھروں سے موج ٹکراتی تو ہے
لوٹ کر پھر اپنے گھر جاتی تو ہے

زندگی کے جب دریچے بند ہوں
کوئی در پھر موت کھٹکاتی تو ہے

بیتے لمحے، دورِ غم، امیدِ نَو
جانے کیا شے دل کو بہلاتی تو ہے

ٹوٹتا ہے جب سکوتِ شب تو پھر
کوئی ہنگامہ سَحر لاتی تو ہے

رازِ ہستی سازِ غم سوزِ دروں
کچھ کسک سی دل کو تڑپاتی تو ہے

دل سے جب اٹھے صدائے اضطراب
پھر دعا تاثیر دکھلاتی تو ہے

سوچ میں صؔادق ہوں جب ہوش و خرد
کام پھر دیوانگی آتی تو ہے

☆

کچھ آرزوئے عقیدت کے خواں سجائے ہوئے
ہم آ گئے ہیں سرِ دار سر اٹھائے ہوئے

خلوص و صدق و وفا سی نوادرات کے ساتھ
رہِ وفا کے مسافر ہیں آزمائے ہوئے

ضیائے مہر و فا ماند ہو نہیں سکتی
دیئے ہیں خونِ جگر سے کئی جلائے ہوئے

انہیں کے واسطے دار و رسن وہی معتوب
زمانے بھر کے جو پہلے سے ہیں ستائے ہوئے

وفورِ شدتِ جذبات سے بھری آنکھیں
برس پڑیں نہ کہیں بارِ غم اٹھائے ہوئے

انہیں ڈرائیں گے کیا موت سے حوادثِ غم
صلیبیں کاندھوں پہ اپنی ہیں جو اٹھائے ہوئے

نویدِ صبحِ مسرت کے منتظر صآدق
چراغِ آس سرِ شام ہیں جلائے ہوئے

☆

زمانے بھر میں مجھے اور کوئی غم تو نہیں
تمہارا غم ہی کسی اور غم سے کم تو نہیں

تمہارے نام کی رکھیں گے لاج بھی لیکن
ستم رسیدہ نے کھائی کوئی قسم تو نہیں

خلوص و مہر و وفا کے تمام پیمانے
بنامِ قیس یا فرہاد ہی رقم تو نہیں

کسی خیال سے آنکھیں پروئے ہیں موتی
تمہارا وہم ہے آنکھیں یہ میری نم تو نہیں

ستم شعار ہو جس کا مآل کیا جانے
ہزاروں ظلم و ستم بھی لگیں ستم تو نہیں

فنا کے نام سے نا آشنا ہے جس کا نام
جو تھوڑی دور چلے ایسا وہ صنم تو نہیں

فریب و مکر و ریا ہوں ادا میں جس کی نہاں
کچھ اور سوچ لیں صآدق کہیں وہ ہم تو نہیں

☆

پھر سے تجدیدِ آرزو کر لیں
آیئے! کچھ تو گفتگو کر لیں

زندگی کے حسین دو راہے پر
کچھ تمنائے رنگ و بو کر لیں

دوستوں سے نباہ گر چاہیں
دشمنوں کو بھی ہم سبو کر لیں

جسم و جاں روح کو سنوار تو دیں
آنسوؤں سے اگر وضو کر لیں

لوگ فردِ وفا جفا دیکھیں
آئینہ دل کا رو برو کر لیں

عیب جو، نکتہ چیں، عدو، حاسد
اپنا دامن تو خود رفو کر لیں

خود نمائی فریب ہے صآدق
خود شناسی کی جستجو کر لیں

☆

ہر خوشی رنج و غم پہ وار آئے
جتنے قرضے تھے سب اتار آئے

کھا کے ہر وار اپنے سینے پہ
راہِ رسمِ وفا سنوار آئے

کون دیکھے بدلتے موسم کو
کب خزاں آئی کب بہار آئے

آنکھیں خوشیوں سے بھیگتی ہیں ضرور
جب بھی بھولے سے غمگسار آئے

زندگانی کا کچھ بھروسہ نہیں
کون جانے کہاں پکار آئے

یو نہی بیکار گزرا ماہِ صیام
نیکیوں میں نہ گر نکھار آئے

اس کی بخشش پہ زندہ ہیں ورنہ
کب گناہوں کا کچھ شمار آئے

ایسی کچھ راہ استوار کریں
عرض صآدق بھی کچھ گزار آئے

☆

پاس ہی سے کوئی بیتاب صدا آتی ہے
بھول جاتا ہوں انہیں یاد دلا جاتی ہے

جو کسی یاد سے وابستہ رہی تھی ہر آں
وہی خوشبو سی رگ و پے میں سما جاتی ہے

لوگ کہتے ہیں برا عشق کو لیکن پھر بھی
جس طرف دیکھ لو الفت کی صدا آتی ہے

ہر طرف دیکھ رہا ہوں میں اداسی کا سماں
دیکھئے! گردشِ دوراں ابھی کیا لاتی ہے

جانے دستور زمانے کا ہے کیسا صادق !
بھول جاتی ہے وفا یاد جفا آتی ہے

☆

بعد مدت کے کسی کی یاد پھر آئی تو ہے
تلخیاں یا حسرتیں ہمراہ کچھ لائی تو ہے

پھر بھڑک اٹھنے کو ہے شاید کسی کی جستجو
ظلمتیں شب کی ہیں میں ہوں اور تنہائی تو ہے

دشتِ وحشت میں پھرا ہے بارہا بے چین سا
دل کی حالت کیا کہیں کمبخت سودائی تو ہے

عشق کی نیرنگیاں اب اور دکھلائیں گی کیا
اک 'انا الحق' کی صدا ہی دار تک لائی تو ہے

شمع ہائے بربریت جل سکیں گی کب تلک
حریّت کی تیز آندھی چرخ پہ چھائی تو ہے

پھر سلاسل کی صدا اٹھی جنوں کی خیر ہو
پھر نویدِ فصلِ گل بادِ صبا لائی تو ہے

دیکھ کر کم مائیگی، افسردگی، دیوانگی
سنتے ہیں صادق ! کسی کی آنکھ بھر آئی تو ہے

☆

بربطِ دل کے تار نغمہ طراز
سوزِ درد و الم سے لے پر ساز

منکشف ہو نہ پائی دل کی بات
شبنمی اشک کہہ گئے سب راز

کچھ تعلق نہ واسطہ حائل
مضطرب دل رہینِ راز و نیاز

کچھ سوالی ، اسیرِ در تیرے
ہونگے جود و کرم سے سر افراز

بے پنہ لذت و سرور ملا
شوق سے جب ادا ہوئی ہے نماز

کہاں صادق ملیں اگر ڈھونڈیں
قدر دانِ وفا خلوص و نیاز

☆

تصورات کی دنیا بسائے بیٹھا ہوں
خزینہ ہائے محبت لٹائے بیٹھا ہوں

تصورات کی دنیا میں محو ہوں اتنا
کہ اپنے آپ کو دل سے بھلائے بیٹھا ہوں

کسی حسین کا چہرہ ہے سامنے میرے
اسی کو قبلہ و کعبہ بنائے بیٹھا ہوں

میں میکدے کی بہاروں کو دیکھ کر ساقی!
تمہارے جام پہ نظریں جمائے بیٹھا ہوں

سفینہ گرچہ تلاطم میں ہے مرا ، لیکن
میں نا خدا سے امیدیں لگائے بیٹھا ہوں

پہنچ ہی جاؤں گا منزل پہ ایک دن صادق
اگرچہ راہ کے نقشے مٹائے بیٹھا ہوں

۱۹۶۲ء پہلی طبع شدہ غزل

ماہیے

امین خیال

(جاپان)

بدلا وہ تمدن ہے
نہ چوپالیں، نہ
سکھیوں کا ترنجن ہے

آئی۔ٹی کا زمانہ ہے
آج بجا ہے سب
کل تک جو فسانہ تھا

تب وقت یہ بیتے گا
گیم ہے آئی ٹی کی
جو سیکھے گا، جیتے گا

یہ جو کمپیوٹر ہے
جادوگری ہے
ہم سب کا فیوچر ہے

گوروں نے کالوں نے
کام آسان کئے
انٹرنیٹ والوں نے

پھر تم کو ابھرنا ہے
پڑھ ٹیکنالوجی
کچھ جگ میں جو کرنا ہے

ماہیے

نذر خلیق

(خانپور)

میرے دل میں تُو تھی
ہر جانب میرے
نرگس کی خوشبو تھی

یہ بھول نہ جانا تم
جب بھی آؤ تو
دل ساتھ ہی لانا تم

دل نرم کرو آخر
مرہم بن جاؤ
زخمی دل کی خاطر

شب تاب نہیں آیا
نیند تو آئی تھی
پر خواب نہیں آیا

اس دور کی کیا باتیں
ہر طبقے میں ہیں
ادنیٰ اعلیٰ ذاتیں

ماہیے

اعجاز عبید

(حیدرآباد۔دکن)

حیدر قریشی کی نذر

کچھ کہہ بھی نہیں سکتے
تان جو تم نے دی
چپ رہ بھی نہیں سکتے

سرمد نہ سکندر ہوں
عشق کے مذہب کا
میں ایک قلندر ہوں

دل کاغذ سادہ ہے
خالی سہی 'ونڈو' (Window)
'کرسر' (Cursor) تو جھپکتا ہے

لو سات برس بیتے
اب اپنے قصّے
کبھی کوئی کہے نہ سنے

وہ بھی مجبور نہیں
بہت اڑانیں ہیں
اب دلّی دور نہیں

ماہیے: ترنم ریاض

(دہلی)

جھمکوں میں نگ ہیں جڑے
رو رو کر میری
آنکھوں میں حلقے پڑے

ماہی کے تصور میں
وقت کٹے کیسے
یادوں کے محشر میں

مسکان اُدھار کی ہے
ماہی کی دید بنا
میری جان اُدھار کی ہے

ان جگر کے چھالوں سے
دُکھ برہا کا کوئی
پوچھے دل والوں سے

دو دن کی جوانی کے
کتنے ہیں دُکھڑے
اس غم کی کہانی کے

جا کر سمجھائے کوئی
آنکھوں میں آ گیا دم
ماہی کو بلائے کوئی

مجھے تجھ سے حیات ملی
غم تیرا اپنا کر
مجھے غم سے نجات ملی

اُس دن سے نہ چین ملے
دل جب سے دھڑکا
اور نینوں سے نین ملے

تقدیر کی باتیں ہیں
ازلوں سے لکھی
تحریر کی باتیں ہیں

غم دل میں سمیٹ لئے
اشکوں کے سب دھبے
دامن میں لپیٹ لئے

بس اور عذاب نہیں
اب زخمی دل کو
اک دُکھ کی بھی تاب نہیں

چھیڑیں ظالم سکھیاں
لب تو نہ کچھ بھی کہیں
تجھے ڈھونڈا کریں اکھیاں

دشمن سی یہ یاری ہے
جب سے بنی دنیا
تب کی بیماری ہے

ہائے روگ لگا بیٹھا
درد پرایا تھا
گھر دل میں بنا بیٹھا

گھر سے نہ جُدا کرنا
صحن کی بیری تلے
میری قبر بنا دینا

اب یہ ہی تیرا سنسار
جاؤں کہاں مجھ کو
پنجرے سے ہوا ہے پیار

مجھے جینا عذاب ہوا
تم پردیس گئے
میرا موڈ خراب ہوا

تو جائے کہیں نہ بدل
سفر مہینوں کا
اور گذرے نہیں اک پل

ماہیے: مرتضیٰ اشعر (ملتان)

برسات پہ پہرہ تھا
ہر سُو اُداسی تھی
ہر سمت ہی صحرا تھا

امبر سے سزا برسی
اک خستہ گھر پر
اِس طور گھٹا برسی

ماہی نے بلایا تھا
سوج گئیں اکھیاں
کیا خوب رُلایا تھا

مضبوط ارادوں کو
دُھن کی وہ پکی تھی
توڑا نہیں وعدوں کو

میں اُس کا کھلونا تھا
کھیل کے توڑ دیا
اِک دن تو یہ ہونا تھا

دن رات نہیں سوتا
چاہت کا رستہ
آسان نہیں ہوتا

ہم سے نہ نبھی قسمیں
چاہ دکھاوا ہے
جھوٹی ہیں سبھی قسمیں

اِک آگ میں جلتا ہے
دید کو تیری دل
دن رات مچلتا ہے

اِک راہ نہیں چھوٹی
ٹوٹ گیا دل تو
اُمید نہیں ٹوٹی

بے کار گئی پوجا
بیل لگے پھل کا
حق دار کوئی دوجا

ماضی کے جھروکے ہیں
خواب سہانے یا
ہر گام پہ دھوکے ہیں

پھیلی رہی تنہائی
ہم سے نہ ملنے کی
تم نے بھی قسم کھائی

آسیب ہی منڈلائے
بند رَکھو گے دَر
پھر کیسے کوئی آئے

آنگن میں لگی بیلیں
رات گئے اکثر
یادوں سے تری کھیلیں

جب رشتے نہیں ٹوٹے
پھر یہ گلے کیسے؟
کیوں منتے نہیں روٹھے

آکاش پہ بادل تھا
شام اندھیری تھی
یا آنکھ میں کاجل تھا

کچھ پیڑ اناروں کے
رشتے کبھی ٹوٹے
کشتی سے کناروں کے

خوشبو مرے گاؤں کی
کیسے بھلاؤں گا؟
جھانجھر ترے پاؤں کی

ماہیے: ماہ پارہ صفدر (لندن)

دَم اُسکا بھرتی ہوں
پہلے ماہیے کو
نام اللہ کے کرتی ہوں

رکھ لینا بھرم میرا
ماہیے کہنے ہیں
یارب ہو کرم تیرا

ہر حمد میں احمد ہے
نام الٰہی کا
سب حُسن محمد ہے

مشہود ہے شاہد ہے
اللہ نے فرمایا
سب نبیوں کا قائد ہے

جی بھر کے کہو ماہیا
کہنا ہے صفدر کا
ماہ پارہ لکھو ماہیا

سینے سے لگاتے ہیں
تنہا لمحوں میں
پاپا یاد آتے ہیں

مری روح کے اندر ہے
پیار محبت کا
ماں میری سمندر ہے

بیٹی مری سانسیں ہے
شُکر خداوندا
بیٹا مری آنکھیں ہے

کچھ بات ہو ساجن کی
تاج مرے سر کا
خوشبو ہے مرے من کی

دریا ہے محبت کا
دل میں اتروں جب
اندازہ ہو وسعت کا

دل کو سمجھاؤں گی
فکر نہیں کرنا
میں لوٹ کے آؤں گی

خوشبوؤں کا سایہ ہے
درد جدائی کو
اب من میں بسایا ہے

جینے کا سوال آیا
اور اداس ہوئی
جب اُس کا خیال آیا

آنکھوں کا فسوں آنسو
سوچ رہی ہوں میں
بہہ نکلے ہیں کیوں آنسو

تمہیدِ جنوں آنسو
سچی بات کہوں
دیتے ہیں سکوں آنسو

ماہیے: اکمل شاکر

(پسنی۔بلوچستان)

کیا حال ہوا میرا
بن تیرے جیون
جنجال ہوا میرا

☆

ہنسنا ہے رونا ہے
کھو کر کچھ پایا
کچھ پا کر کھونا ہے

☆

مہندی ترے ہاتھوں میں
دلہن لگتی ہو
تم چاندنی راتوں میں

☆

عاشق میں اچھا ہوں
تو لیلی جیسی
میں مجنوں جیسا ہوں

☆

چلتی ہے ہوا ہر سو
دور تلک شاکر
پھیلے گی تری خوشبو

☆

پہلے سے یہی ڈر تھا
جب اس نے چھوڑا
بائیس دسمبر تھا

اک سال کی یاری تھی
قصہ ختم ہوا
جب بازی ہاری تھی

☆

دل ایک کھلونا ہے
ٹوٹ گیا شاکر
اب رونا دھونا ہے

☆

مت پوچھ ہوا کیا ہے
دل ہی ٹوٹ گیا
یاروں نے دیا کیا ہے

☆

تم بن کیا جینا ہے
زہر جدائی کا
ہر پل مجھے پینا ہے

☆

یوں توڑ نہ دل ماہیا
جانے سے پہلے
اک بار تو مل ماہیا

☆

ملتان کی باتیں ہیں
رنگ بھری شاکر
لاہور کی راتیں ہیں

کھیتوں میں ملو ماہیا
ساتھ مرے آؤ
کچھ دور چلو ماہیا

☆

دن رات یہی غم ہے
تیری محبت میں
یہ عمر بہت کم ہے

☆

اچھا ہے سفر ماہیا
ساتھ ہی رہ میرے
دنیا سے نہ ڈر ماہیا

☆

کیوں چھوڑ دیا تو نے
تیز ہواؤں کا
رُخ موڑ دیا تو نے

☆

دن کاٹ رہا ہوں میں
کالی راتوں میں
غم چاٹ رہا ہوں میں

☆

چلنا ہے تو چل ماہیا
موسم اچھا ہے
چل گھر سے نکل ماہیا

ہندوستانی ماہیوں کا انتخاب

ترتیب
نذیر فتح پوری

نذیر فتح پوری ایڈیٹر سہ ماہی اسباق پونہ، ہندوستانی ماہیا نگاروں کا ایک انتخاب ترتیب دے رہے ہیں۔اس انتخاب سے ۲۰ ماہیا نگاروں کے ماہیے انہوں نے بطور خاص جدید ادب کے اس شمارہ کے لئے عنایت کئے ہیں۔سو یہ ماہیے ان کی ترتیب کے مطابق ان کے شکریہ کے ساتھ پیش کئے جا رہے ہیں۔

امید ہے کہ ان کی زیرِ اشاعت کتاب اردو ماہیے کے فروغ میں اہم کردار ادا کرے گی۔

ادارہ **جدید ادب**

ناوک حمزہ پوری

(گیا)

ہر جذبہ مشینی ہے
پیار کی خوشبو کا
فقدان یقینی ہے

تشکیک کا ہے چکّر
پا نو نہیں جمتے
اک مرکز و منزل پر

بزم گل و لالہ ہے
نور کے پیکر سے
ہر سمت اجالا ہے

تاریک دماغوں کی
چیخ یہ کہتی ہے
حاجت ہے چراغوں کی

پتھر بھی پگھلتا ہے
پیار کے روغن سے
جب دیپک جلتا ہے

کلیوں کے تبسم سے
باغ میں رونق ہے
پھولوں کے تکلم سے

فرحت قادری

(گیا)

کیا کچھ نہیں ملبے میں
ہوتی ہیں تعمیریں
تخریب کے پردے میں

دل باز نہیں اچھا
آپ تو اچھے ہیں
انداز نہیں اچھا

کیا رنگ ہے محفل کا
تیرے اشارے پر
بہتا ہے لہو دل کا

ہیں موت کے بیوپاری
دونوں برابر ہیں
نیتا ہو کہ پنساری

پانی ہے نہ روٹی ہے
''امن کبوتر'' کی
تقدیر ہی کھوٹی ہے

موجوں نے بغاوت کی
خیر نہیں فرحت
کشتئ محبت کی

شکیل گوالیاری

رؤف خیر (حیدرآباد)

ناول ہو کہ افسانہ
کچھ تو کھلے پڑھ کر
کیا کہتا ہے دیوانہ

سرکاری مسلمانو!
خود سے ہو ناواقف
ملت کو تو پہچانو

مفلوج اگر ہو بھی
چلنے کی کوشش کر
تو چل نہ سکے تو بھی

مصرعے جو مساوی ہوں
ماہیے پھر کیسے
شاعر کے ثلاثی ہوں

کچھ بھی نہ کہو ضد میں
شکل میں مخبر کی
جاسوس ہیں مسجد میں

اظہار کی آزادی
میرے لیے کب ہے
ہاں تیرے لیے ہوگی

(گوالیار)

دن بھر جو سلگتا ہے
زخم وہ راتوں کو
سورج سا دمکتا ہے

ہر کام اب آساں ہے
ہاتھ بھی اپنے ہیں
اور اپنا گریباں ہے

للکار سے بادل کی
سرد نہیں ہوگی
یہ آگ ہے جنگل کی

ہر آج ہے کل جیسا
دیکھ رہا ہوں میں
اک خواب غزل جیسا

کانٹوں میں ببولوں کے
رہ نہ سکو گے تم
پابند اصولوں کے

جوگی ہے نہ بھوگی ہے
اس کو سمجھ دنیا
وہ پریم کا روگی ہے

ایس پی شرما تفتہ

بس اتنی ہے سچائی
صرف محمدؐ ہیں
ہوں جن کا میں شیدائی

کیا سحر بیانی کی
آپؐ کی کلمے سے
کنکر نے بھی خوانی کی

اپنا اسے سمجھا ہے
آپ نے اے آقاؐ
دشمن کو بھی بخشا ہے

قندیل مدینہ ہیں
ان کا ہوں پروانہ
جو نور سراپا ہیں

تعظیم محمدؐ کی
پیار کو سب سے
تعلیم محمدؐ کی

خوشیاں سبھی پاتا ہے
آپؐ کے روضے پر
اک بار جو جاتا ہے

مشتاق جوہر

(کلکتہ)

لفظوں کی گواہی پر
شعر لکھو جوہر
ذہنوں کی تباہی پر

بے باک بنادے گی
صبح کی بیداری
چالاک بنادے گی

پھر نام کماتے ہیں
خونِ جگر اپنا
لفظوں کو پلاتے ہیں

یہ بات نہیں اچھی
کھاتے ہیں اردو کا
بچہ پڑھے انگریزی

کیا خوب تماشا ہے
آج میاں پیسہ
دنیا کو نچاتا ہے

حیران نہیں ہوں میں
تیری سیاست سے
انجان نہیں ہوں میں

امینِ حزیں (پونہ)

اے مولیٰ کرم کردے
اپنی عطا سے تو
دامن کو مرے بھردے

انداز عبادت کا
تیغ کے سائے میں
سجدہ ہے سعادت کا

یہ شمس و قمر سارے
اس کی نوازش سے
خادم ہیں مرے گھر کے

کیا عظمت آدم ہے
شان سے لہراتا
توحید کا پرچم ہے

میں پیکر خاکی ہوں
تیری نوازش ہے
نوری ہوں نہ ناری ہوں

یہ علم کا درجہ ہے
حکم الٰہی کا
پیغام ہی اقراء ہے

عبدالاحد ساز (پونہ)

وہ آئی صدائے کن
حکم ہوا، لکھو
مفعول مفاعیلن

جو کچھ بھی سناؤں گا
دھیان سے سنیئے تو
میں حمد ہی گاؤں گا

باطن کے حوالوں میں
کھوئے رہے شب بھر
ہم اپنے اُجالوں میں

خوشبو کے ترانے ہیں
لفظ مرے روشن
تسبیح کے دانے ہیں

یہ جسم تو چلمن ہے
دیکھ سکو گر تو
اُس پار بھی آنگن ہے

ملنے کے لیے آیا
وقتِ فراموشی
یادوں کا گھنا سایا

میرؔ افضل (شولا پور)

ہے میری حقیقت کیا
ذاتِ خداوندی
بندہ میں ترا بندہ

قطرہ بھی سمندر ہے
خاک نشیں پیکر
عالم کا مقدر ہے

کیا یاد دلاتا ہے
ظلم کا مارا جو
زنجیر ہلاتا ہے

افلاس کے مارے ہیں
کوئی نہیں زندہ
اک قبر میں سارے ہیں

ہرگز نہ بھلا دینا
ماہیے کیسے ہیں
کوئی تو پتا دینا

کچھ اور لکھو بہتر
میرؔ کرو کوشش
کچھ اور کہو بہتر

شرون کمار ورما
(امرتسر)

اک درد اٹھا تازہ
خط یہ پرانا ہے
کانٹا سا چبھا تازہ

کیا پھول تھا سرسوں کا
توڑ دیا میں نے
یارانہ برسوں کا

سوئی ہوئی ہیروں کی
نینداڑا دے گی
آواز فقیروں کی

من چاند جو ڈوب گیا
جانے کیوں اپنا
من سب سے اوب گیا

یہ زہر نہیں چکھنا
دنیا سے کوئی
امید نہیں رکھنا

جو اپنے اندر تھا
ریت نظر آیا
اترے تو سمندر تھا

ڈاکٹر شباب للت
(شملہ)

اس بُت پہ فدا ہو کر
کیا پایا ہم نے
پابندِ وفا ہو کر

جوبن تھا اُمنگیں تھیں
ڈور تھی آشا کی
سپنوں کی پتنگیں تھیں

ہاتھ اس سے ملا آئے
دل کو سندر سا
اک روگ لگا آئے

پگ پگ ہے مجھ جھڑکا
تم نے سدا میرے
زخموں پہ نمک چھڑکا

کیا خوب بہانے ہیں
چابی ہے گم ورنہ
بھرپور خزانے ہیں

سچے فنکاروں کو
کب اعزاز ملے
اصلی حقداروں کو

سیما فریدی
(بدایوں)

یہ بھی بڑی عظمت ہے
شہر بدایوں کی
کل دہر میں شہرت ہے

میرؔا کی لگن لے کر
شعر و سخن کو میں
اپناتی رہی اکثر

رادھا مرے گیتوں میں
بستی ہے آ کر
تنہائی کے لمحوں میں

حالات سے کیا ڈرنا
آپ وہی کریئے
جو آپ کو ہے کرنا

خاموش اندھیروں میں
دیپ جلاتے تھے
ارمانوں کی ڈیروں میں

آواز نذیرؔ آئی
ماہیے کہہ سیما!
جی اچھا! مرے بھائی

ہاشم نعمانی

تاریخ کے پنّوں میں
آگ تعصب کی
محفوظ ہے ذہنوں میں

کیا خوب کہانی ہے
ہونٹ ہمارے ہیں
اور پیاس تمہاری ہے

قدموں میں لپٹ جاتا
ماں جو مری ہوتی
آنچل میں سمٹ جاتا

سوکھے ہوئے پتے ہیں
پیڑ کی شاخوں پر
مایوس پرندے ہیں

خوشبو ہے گلابوں میں
پاک محبت کے
چرچے ہیں کتابوں میں

پھولوں کی نگہہ داری
کون نہیں کرتا
بچّوں کی طرف داری

شمیم انجم وارثی
(گارولیہ، بنگال)

کہنے کو ہمارے ہیں
دل کے فسانے میں
سب رنگ تمہارے ہیں

صحرا میں دیا ڈھونڈے
گاؤں میں اک شہری
کولر کی ہوا ڈھونڈے

مہندی نہ لگا ساجن
جو نہ کبھی اترے
وہ رنگ چڑھا ساجن

کیسی مجبوری ہے
پاس ہو تم میرے
سو ہاتھ کی دوری ہے

تصویر مثالی ہے
گوری کے ہونٹوں پر
پنجاب کی لالی ہے

گُل دیکھ کے رجنی کا
یاد نہ کیوں آئے
چہرہ مجھے سجنی کا

شبیر فراز فتح پوری
(فتح پور)

آنکھوں میں جو پانی ہے
مول نہیں اس کا
یہ جھیل پرانی ہے

پلکوں پہ سجالینا
قطرے ہیں یادوں کے
دل سے نہ بھلا دینا

ٹوٹا ہوا تارا ہے
چارہ گرد چھوڑ و
یہ ہجر کا مارا ہے

پھر اُترا ہے چوری سے
چاند سمندر میں
ملنے کو چکوری سے

ہے میری بھی بینائی
مثلِ کلیم ان کے
جلوے کی تمنائی

پلکوں پہ جو موتی ہے
ہجر کے ماروں کی
پونجی یہی ہوتی ہے

علیم صبا نویدی
(مدراس)

دشمن تھا سویرے کا
نور سے ملنے تک
شیدا تھا اندھیرے کا

پھر ایک سفر جاگا
راہ ہے نورانی
ادراک کا گھر جاگا

ہم آنکھ مچولی میں
دور نکل آئے
کچھ بھی نہ تھا جھولی میں

رس ات کا ہے تازہ
آس ہے چوکھٹ پر
اب کھول دو دروازہ

سورج سا ترا پھیرا
پھونس پہ چنگاری
شعلوں نے مجھے گھیرا

چاہت کا چمن رویا
دھوپ کے کھلنے تک
برفیلا بدن رویا

اقبال آصف (بیجاپور)

کہنے کو وہ دریا ہے
کوئی نہیں جانے
اک عمر سے پیاسا ہے

یہ دور بھی کیسا ہے
جس پہ نظر ڈالو
مرتا ہے نہ جیتا ہے

خود جاگتے پہلے تھے
لوگ تھے وہ کیسے
سورج کو جگاتے تھے

مشکل ہے دیوانے کو
دشت نہ صحرا ہے
اب خاک اڑانے کو

اپنے ہوں کہ بیگانے
دیپ جلاتے ہیں
ہم پیار کے دیوانے

پھر صبح سے کچھ ایسے
آنکھ پھڑکتی ہے
شاید کوئی آجائے

جاوید اشرف فیض اکبر آبادی (راؤرکیلا)

اللہ محبت دے
دہر کے انساں کے
ہر کام میں برکت دے

میں ماہیے لکھتا ہوں
ناقدِ فن سن لے
اس واسطے زندہ ہوں

اب خوشیاں ملیں یا غم
لے کے قلم کاغذ
اشعار لکھیں گے ہم

ہر ساتھی چھوٹے گا
رشتہ کاغذ کا
اک روز تو ٹوٹے گا

جو درد بھرا ہوگا
گیت سنو گے تو
ہر زخم ہرا ہوگا

اے فیض یہیں ہے وہ
زیرِ فلک دیکھو
محبوبِ حسیں ہے وہ

حسنین عاقب
(پوسد)

اس دور جوانی میں
رکتا نہیں کچھ بھی
بہتے ہوئے پانی میں

قانون بنے ایسے
شرم سے منھ ڈھانپا
جنگل کے اصولوں نے

ہے جان ہتھیلی پر
عزم مصمّم ہے
شانوں پہ رہے نہ سر

نکلے ہیں پناہوں سے
سانپ جو لٹکے ہیں
تہذیب کی باہوں سے

جل سوکھ گیا کب سے
آنکھ میں پانی ہو
مانگو یہ دعا رب سے

اک آن میں رائی تھے
مرے ارادے تو
کاغذ کے سپاہی تھے

شاہین اجمیری
(بیکانیر)

شکوہ نہیں قسمت سے
رب نے نوازا ہے
افکار کی دولت سے

چھلنی مرا سینہ ہے
پھر بھی مجھے شاہیں
ہر حال میں جینا ہے

وہ پست نہیں ہوتے
سخت گھڑی میں بھی
جو ہوش نہیں کھوتے

غربت نے ستایا ہے
پھر بھی میاں ہم نے
ایمان بچایا ہے

جائز نہیں غدّاری
پیار کے رشتوں میں
لازم ہے وفاداری

قبضہ ہے غلاظت کا
دور گیا شاہیںؔ
افسوس، نفاست کا

کتاب گھر

کتابوں پر تبصرے

تبصرہ نگار: حیدر قریشی

پار پرے (ناول) **مصنف:** **جوگندر پال**

صفحات: 132 **قیمت:** 150 **روپے**

ناشر: **انشاء پبلی کیشنز** 25-B Zakaria Street,Kolkata-700073 , India

جوگندر پال تخلیقی ذہن رکھنے والے اردو کے انتہائی زرخیز فکشن رائٹر ہیں۔افسانہ،افسانچہ،ناولٹ اور ناول تک ان کی تخلیقات بجائے خوداردوفکشن کی کہکشاں سی بنا چکی ہیں۔**پار پرے** ان کا تازہ ناول ہے۔یہ ناول جوگندر پال تخلیقی فعالیت کا حیران کن مظہر ہے۔عمر کے اس حصے میں جہاں ہمارے بیشتر لکھنے والے یا تو لکھنے سے توبہ تائب ہوجاتے ہیں یا خودکو دہراتے چلے جاتے ہیں،جوگندر پال ایک انوکھے موضوع کے ساتھ اپنا ناول **پار پرے** لے کرآئے ہیں۔

دس ابواب اورایک پس لفظ پر مشتمل یہ ناول بنیادی طور پر بابالالوکی داستان ہے۔لیکن اس داستان میں اور بھی کئی کرداروں کی کہانیاں آتی چلی گئی ہیں۔جالم سنگھ جیسے رحم دل سنگھ سردار کی کہانی،مولوی منظور احمد کی کہانی،انڈیمان کے جاروائی قبیلے کی کہانی،شبو چور کی کہانی، بھائی شری رام کی کہانی،اور بہت ساری کہانیاں۔گوراں چاچی کی کہانی تو خود بابالالوکی کہانی سے مل کراگلی کہانیوں کوجنم دیتی ہے۔یہ ساری کہانیاں جزائر انڈیمان کے معروف اورعبرتناک مقام کالے پانی سے ابھرتی ڈوبتی ہیں۔متحدہ ہندوستان میں خطرناک مجرموں کو سزا کے طور پر کالے پانی کی سزادی جاتی تھی۔حکمران جن خطرناک مجرموں کوسزا کے طور پر وہاں بھیجا تھاان میں سے اکثر نہ صرف خطرناک نہیں تھے بلکہ اتنے معصوم تھے کہ زندگی بھراپنے معاشرے کے معززین کے استحصال کا نشانہ بنتے رہے۔اوراسی کے نتیجہ میں یہاں پھینکوادیئے گئے۔

بابالالوکواپنے آگا پیچھے کا کچھ پتہ نہیں ہے۔وہ بے سہارا تھااور ماسٹر اللہ دتہ اسے ترس کھا کراپنے گھر لے گئے۔وہاں انہوں نے اسے بیوی کی طرح رکھااور باپ کی طرح پالا۔اسکول ٹیچر کی وفات ہوئی تواسکول منیجر ستیہ وتی اسے ترس کھا کراپنے ہاں لے گئی اور وہ ماسٹر اللہ دتہ سے بھی دو ہاتھ آگے نکلی۔پھرایک بارستیہ وتی نے اپنے بوڑھے شوہر کے ساتھ جھگڑے کے دوران اسے گولی ماردی۔الزام بابالالو کے سر لگا دیا گیا۔اور جب معاملہ عدالت میں پہنچاتو بقول بابالالو’ستیہ وتی کے وکیل کی بحثیں سن کر مجھے بھی یقین آ گیا تھا کہ خونی میں ہی ہوں‘‘۔

بابالالوکا یہ ایک جملہ تیسری دنیااور بالخصوص جنوبی ایشیا کے ممالک کے نظامِ عدل پراور معاشرے کی اصلیت پرایک کاری ضرب ہے۔یوں بابالالواندھے انصاف کی بھینٹ چڑھ کر قاتل کا گناہ اپنے ذمہ لے کرکالے پانی کی سزا کے لئے بھیج دیا گیا۔یہاں اس کی ملاقات ایک طوائف گوراں چاچی سے ہوتی ہے۔گوراں چاچی کوایک گاہک نے کام کے بعد معاوضہ نہیں دیا تو اس نے اسے دھکا دیا اور وہ اوپری منزل سے نیچے گر کر ہلاک ہوگیا اور گوراں چاچی قتل کے الزام میں سزا پاکر کالے پانی بھیج دی گئی۔بہرحال دونوں کے درمیان بات بڑھتی ہےتو دونوں شادی کر لیتے ہیں۔قید سے رہائی کے بعد کالے پانی کے بیشتر سزایافتہ لوگ وہیں بس جاتے ہیں۔یوں پورٹ بلیئر ایک شہر بن کر پھیل چکا ہے۔

کالے پانی کے سزایافتہ ان لوگوں کی بڑی تعداد اپنے رہن سہن سے رام راج یاست یگ کی یاد دلاتی ہے۔پیار،محبت،ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک۔۔دینی غیرتوں اورتہذیبی بے غیرتیوں سے پاک صاف۔ مسلمان،ہندو،سکھ،مسیحی،اورمقامی جاروائی لوگ،سب تعصّبات سے پاک اچھےانسانوں کی طرح جی رہے ہیں۔ لالواور گوراں کے ہاں دو بیٹے پیدا ہوتے ہیں۔اپنے دوست جالم سنگھ کے کہنے پر وہ پہلا بیٹا واہگوروکو دے دیتا ہے۔اس کا نام بکل سنگھ رکھا گیا۔دوسرا بیٹا ہواتو اسے مسلمانوں کے حوالے کرنے کا سوچتا ہےاوراس کا نام علی رکھ دیا جاتا ہے۔میاں بیوی دونوں ہندو۔بکل سنگھ بڑا ہوکر اچھا کاروباری ثابت ہوتا ہے۔باپ کی کریانے کی چھوٹی سی دوکان کو بڑھا کر پرویژن سٹور میں بدل دیتا ہے۔چھوٹا بیٹا پڑھائی کی طرف توجہ دیتا ہےاور گریجوایشن کر کے اسکول ٹیچر بن جاتا ہے۔ذہنی طور پر وہ غور وفکر میں مبتلا رہتا ہے۔اس کا انگریز پرنسپل بھی اس کی ذہنی صلاحیتوں کی قدر کرتا ہے۔بکل سنگھ کی سادی ایک لڑکی سے ہوجاتی ہے۔علی ایک مقامی لڑکی سوکو پسند کر چکا ہے۔

اسی دوران ہندوستان سے بعض ہندو رہنما پورٹ بلیئر آتے ہیں اور وہاں کے ہندوؤں کو بتاتے ہیں کہ ماضی میں مسلمان حکمرانوں نے ان کے آباؤ اجداد پر کیا کیا مظالم ڈھائے تھے۔سنگین مقدمات میں سزایافتہ لوگوں سے بسا ہوا شہر پورٹ بلیئر سزایافتہ لوگوں کا گڑھ ہونے کے باجود امن وسکون کا گہوارہ تھااور مذہبی نفرت کے زہر سے ابھی تک پاک تھا۔لیکن ہندوستان سے آنے والے ہندو رہنماؤں نے پہلی ہی اشتعال انگیز تقریب میں زہر پھیلایا تو اسی تقریب میں بابالالواور گوراں کا بیٹا علی کھڑا ہوگیا۔اس نے مقرر کو مخاطب کر کے کہا:

’’کیا آپ اس وقت تاریخ کے پنّوں میں سانس لے رہے ہیں یا بیسویں صدی کے خاتمے پر یہاں پورٹ بلیئر میں؟ آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟۔۔۔فرقہ وارانہ فساد؟۔۔مارا پیٹی؟۔۔۔وحشیانہ قوت؟۔۔۔کیا؟۔۔۔کیا چاہتے ہیں آپ؟۔۔۔ہماری جانیں؟‘‘

علی کی اس بے ادبی پر ہنگامہ ہوگیا۔پولیس نے فائرنگ کر کے فساد پر قابو پا لیا۔لیکن اس فائرنگ سے انتہا پسندوں کا ایک ساتھی مارا گیا۔پولیس انسپکٹر نے خود کو بچانے کے لئے اس کے قتل کا الزام علی پر لگوا دیا۔مقدمہ چلا۔علی کا کہنا تھا

کہ وہ نفرت پھیلانے والے مذہبی لوگوں سے نفرت کرتا ہے لیکن اس نے کوئی قتل نہیں کیا۔ لیکن اس کی نفرت کا اعتراف اور جائے وقوعہ کے دوسرے شواہد کی بنا پر ہی اسے عمر قید سنا دی گئی۔ کالے پانی میں رچے بسے ہوئے خاندان کے نوجوان کو نئے کالے پانی کی سزا سنائی گئی۔ اسے بال ٹھاکرے جی کے شہر بمبئی کی جیل میں بھیج دیا گیا۔

بابا لالو جو خود قتل کے جھوٹے الزام میں کالے پانی کی سزا بھگت چکا تھا، اب اپنے پڑھے لکھے اور ذہین بیٹے کو قتل کے جھوٹے الزام میں سزا کے لئے جاتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ علی کے ساری بہی خواہ، سارے عزیز اس ناانصافی پر اس ظلم پر گھلنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ بابا لالو علی کے پرنسپل سے شاید من ہی من میں باتیں کر رہا ہے:

''میری کہانی تو پوری ہو لی ہے۔ پر کہاں پوری ہوئی ہے۔ پِٹ سن صاحب؟ وہ تو بمبئی جیل میں جا کھوئی ہے، اور اس کی پرچھائیاں مجھے یہاں گھیرے رکھتی ہیں۔۔۔۔ خدارا میری مدد کیجئے۔۔۔ پِٹ سن صاحب، جو ابھی ہونا ہے وہ سارے کا سارا ایکدم ہو جانے دیجئے۔

ہاں، آپ کیا کر سکتے ہیں؟۔۔۔۔ ہاں، پِٹ سن صاحب کوئی پوری کہانی بھلا کہیں پوری ہوتی ہے؟''

بابا لالو کی اسی خود کلامی پر ناول کا اختتام ہو جاتا ہے اور باقی کہانی ہم سب اپنے اپنے ذہنوں سے سوچتے ہوئے علی کی، بابا لالو کی، گوراں کی، جالم سنگھ کی، فادر ڈینئیل بخش کی، اور مقامی جار والٹر کی سُو کی، اور کئی دوسرے کرداروں کی کتنی ہی کہانیاں بنا سکتے ہیں۔

جوگندر پال اپنے مخصوص ڈکشن کے ساتھ اس ناول میں خوشیوں اور دکھوں کے کتنے ہی پھول سجائے ہوئے ہیں۔ آیئے ان کے چند جملوں کے پھولوں کو کسی حوالے کے بغیر دیکھتے ہیں۔

☆☆ ''اتنا نیک تھا، معلوم نہیں اتنا دکھی کیوں تھا۔۔۔۔''

''بابا۔۔ کسی نے اسے ٹوکا۔۔ جب اتنا نیک تھا تو دکھی تو ہوگا ہی''

☆☆ بیرکوں کی قید اور کام سے چھٹی پا کر بابا لالو کو سب سے پہلے یہ مسئلہ لاحق تھا کہ اب رہیں گے کہاں۔

''اس میں کیا مشکل ہے'' گوراں چاچی نے اُس سے کہا ''تم میرے دل میں رہو گے اور میں تمہارے دل میں''

''اس طرح تو ہم کبھی مل ہی نہ پائیں گے۔''

☆☆ ''رب کے ان نیک بندوں کو اپنی سجا بھگتنا بھی نئیں آتا بھابھی۔ ہماری تراں چور ڈاکو ہوں تو جیل کو بھی سسرال بنا لیں''

☆☆ مولوی کو بھُنے ہوئے چنے بہت مرغوب تھے۔۔۔ جالم سنگھ نے اُس کے سامنے اپنی ہتھیلی کھول دی۔

''موجھے تو ایوائی پھکر کھائی رکھدی ہے مولویا، کے جنت میں تو سِر پھ دودھ اور شہد کی ندیاں بہتی ہیں، تجھے او تھے بھنے ہوئے چنے کیسے ملیں گے''

☆☆ ''تم ایک نہاتی بہت ہو بی بی''

''تم جو نہیں نہاتے، بابا۔ تمہارا نہانا بھی نہ نہا لیا کروں تو تمہارے قریب کھڑا ہو کے سانس لینا بھی دشوار ہو جائے''

☆☆ فادر ڈینیل بخش نے لاکھ زور لگایا کہ بِلّو اور بیکل کی سادی عیسائی ریتی رواج کے مطابق چرچ میں انجام پائے، پر جالم سنگھ اڑ گیا کہ وہ اپنے بیکل کا بیان خود آپ گرنتھ صاحب کے روبرو گوردوارے میں کرائے گا۔

''اوئے میرے پیارے فادر، میری بات کان دھر کے سن'' جالم سنگھ فادر کو سمجھاتا رہا ''تمہارا یسوع، واہگورو کا ہی پتر ہے نا۔۔ بول، ہے کہ نئیں؟۔۔ ہے!۔۔۔ تو پھر اسے بھی اپنے واہگورو کے سامنے بیٹھ کے بیاہ کا نجارہ کرنے سے کیوں روکدیے ہو؟۔۔ کیسے پھادر ہو پھادر؟ باپ بیٹے کو مل بیٹھنے کا موکا مل ریا ہے تو انہوں کو مل بیٹھنے دو، کیاؤں ان کی ملاخات میں روڑا اٹکاتے ہو؟''۔۔۔ یہ اچھا ہوا جالم کی بات آخر فادر کی سمجھ میں آ گئی۔

☆☆ جب ہم آپ یادداشت کھو بیٹھیں تو ہماری یادداشت بھی ہماری تلاش میں نکلی ہوتی ہے۔

☆☆ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ گاندھی نے بات بات میں ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی کے بھائی بھائی ہونے پر اتنا زور کیوں دیا۔ جو ہوں ہی بھائی بھائی، اُنہیں کیا ایک دوسرے کو ہمہ وقت بھائی بھائی کہے بغیر اپنا رشتہ یاد نہیں رہے گا؟

وہ جی ہی جی میں یہ دیکھ کر ہنس رہا ہے کہ ہمارا علی اپنی بامنی ماں کو یقین دلا رہا ہے، ماں، ہم بھائی بھائی ہیں۔

اس ناول کا ایک کمال تو یہ ہے کہ اس میں کالے پانی کے سزا یافتہ لوگوں کی جوگندر پال نے ایسی خوبصورت تصویر کھینچی ہے کہ دل ان کی محبت سے بھرنے لگتا ہے۔ یہ ناول ہمارے معاشرے کی منافقتوں کو بالواسطہ طور پر بے نقاب کرتا ہے۔ بے قصوروں یا معمولی قصورواروں کو بڑا مجرم بنانے کے باوجود ہمارے معاشرے سے گندگی ختم نہیں ہوتی لیکن وہی لوگ جنہیں گندہ قرار دے کر پورٹ بلیئر میں بسا دیا گیا تھا وہ وہیں اپنی جنتِ ارضی بسا لیتے ہیں۔ اور پھر اس جنت ارضی میں بھی انسان کو بہکانے والے پہنچ جاتے ہیں۔

ناول کے سرورق پر چار تصاویر سلیقے سے سجائی گئی ہیں۔ ۱۔ ایبرڈین بازار پورٹ بلیئر کے سیلولر جیل کے بیرونی دروازے کی تصویر۔ ۲۔ جیل کے طویل برآمدے کی تصویر۔ ۳۔ جیل کی باہر سے اور فضا سے لی گئی تصویر اور ۴۔ بیلوں کی جگہ قیدیوں کے کولہو چلانے اور تیل نکالنے والے مقام کی تصویر۔ اسی مقام کو بطور خاص کالے پانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پورٹ بلیئر شہر کو اور کالے پانی کے مکینوں کی نفسیات کو جوگندر پال نے اتنی خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ان کی اس مہارت پر رشک آتا ہے۔ قاری نہ صرف خود پورٹ بلیئر جا پہنچتا ہے بلکہ سچ مچ وہاں جا کر کالے پانی کے صاف دل، میٹھے لوگوں سے ملنے کی خواہش کرنے لگتا ہے۔ کم از کم میرا تو بہت جی کرنے لگا ہے کہ خود کو سزا کے طور پر نہیں بلکہ جزا کے طور ایک بار کالے پانی لے جاؤں اور وہاں کے ان سارے اندر، باہر سے ٹوٹے ہوئے کرداروں سے ملوں، جو ایک دوسرے سے ٹوٹ کر پیار کرتے ہیں، جنہیں جوگندر پال نے امر کر دیا ہے۔

سخنِ ملتوی(شاعری) **شاعر**:**رؤف خیر**

صفحات:۱۲۸ **قیمت**:۱۰۰روپے

ناشر: خیری پبلی کیشن ۔9-10-202/19 رسالہ بازار۔قلعہ گولکنڈہ۔حیدرآباد(آندھراپردیش)

رؤف خیر اردو کے معروف شاعر ہیں۔''سخنِ ملتوی''ان کا چوتھا اور تازہ شعری مجموعہ ہے۔اس میں غزلیں،نظمیں،ترائیلے،ہائیکو،ماہیے اور دیگر شعری اصناف شامل ہیں۔غزل رؤف خیر کی شاعری کی اصل شناخت ہے۔ان کی نظمیں بھی بنیادی طور پر غزل کے زیرِ اثر ہیں۔یعنی پابند نظمیں۔مختلف شعری پیمانوں میں اظہار سے غالباً رؤف خیر کی قادرالکلامی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔لیکن ان کی شاعری کے بارے میں کوئی حتمی رائے ان کی غزلوں کی بنیاد پر ہی دی جا سکے گی۔یہاں ان کی غزلوں سے چند منتخب اشعار پیش ہیں۔

سمجھنے لگتا وہ دنیا کو ملکیت اپنی — جو ہمکلام کسی سے ذرا بھی ہوتی تھی

قلم کے ساتھ قلم کی روایتیں بھی گئیں — جو بے قلم ہیں قلم ان کے ہاتھ مت کرنا

بڑا سہی وہ مگر اس کی بات چھوٹی تھی — اسی لئے تو اطاعت نہ ہو سکی مجھ سے

ہر اک مقام پہ کچھ دَل بدل تو ہوتے ہیں — بدلنے والے بھی اکثر سپھل تو ہوتے ہیں

ہم اپنے شعر کا لیتے رہے مزہ پہروں — کہ چھوٹتا ہی نہیں ہے یہ آئینہ پہروں

شیشے میں بال ہے کہ انہیں خط نہیں ملا — اب تک ،کمال ہے کہ انہیں خط نہیں ملا

کاغذ پہ رکھ دیا تھا کلیجہ نکال کے — کتنا ملال ہے کہ انہیں خط نہیں ملا

اب ان کے گھر ہی سلامت نہ سر سلامت ہیں — جو مانگتے تھے دعائے سلامتی بھی بہت

وہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ کے رہے — جو لے کے پھرتے تھے دستے حفاظتی بھی بہت

ترائیلے کی صنف اپنے گھر میں بھی یادگار کے طور پر جانی جاتی ہے لیکن اردو میں اس صنف کے ساتھ رؤف خیر کی وابستگی مستقل حوالے جیسی بن گئی ہے۔رؤف خیر کی بیشتر نظمیں پابند نظمیں ہیں اور ان کے ہاں ترقی پسندوں اور علامہ اقبال کے آہنگ کا امتزاج دیکھا جا سکتا ہے۔اس نوع کی نظموں میں ''دینِ ضعیف''۔''ایڈس''اور''چلو سب خداؤں کو غرقاب کر دیں''کو ان کی نمائندہ نظمیں کہا جا سکتا ہے۔رؤف خیر کے ماہیے اور ہائیکو ان اصناف سے ان کے اخلاص کو ظاہر کرتے ہیں۔''تکونی''،اور''یک مصرعی نظموں''سے رؤف خیر کی مہم جو طبیعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔اپنی شاعری کے بارے میں رؤف خیر کا یہ دعویٰ ہے۔

اشعار نہیں ہوتے آسان زمینوں میں — ہم پھول کھلاتے ہیں بے جان زمینوں میں

میر انیسؔ آسمان سے اپنی زمینیں لاتے تھے اور اور ان کی فکر بلند بیں تھی جبکہ رؤف خیر زمین سے منسلک رہ کر شاعری کی بے جان زمینوں میں جان ڈالنے کا کام کر رہے ہیں۔اسی لئے ان کے ہاں اپنے ثقافتی مظاہر کی رنگا رنگی ملتی

ہے۔امید ہے اس شعری مجموعہ کی ادبی دنیا میں مناسب پذیرائی ہوگی۔

آنسو آنسو برکھا(اردو گیت) **گیت نگار**:**ڈاکٹر فراز حامدی**

صفحات: گیت اردو اور ہندی دونوں اسکرپٹس میں پیش کئے گئے ہیں۔اردو سیکشن ۱۰۱صفحات پر مشتمل ہے اور ہندی سیکشن ۹۶صفحات پر مشتمل ہے۔ **قیمت**200 **روپے**

ناشر:ادبی دنیا پبلی کیشنز۔۱۲۳۔جے پی کالونی۔شاستری نگر جے پور۔۳۰۲۰۱۶۔راجستھان

ڈاکٹر فراز حامدی ویسے تو شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں لیکن''گیت''کہتے وقت ان کی طبع کچھ اور رواں ہو جاتی ہے۔یوں گیت کو ان کی شاعرانہ شناخت کا پہلا اور بنیادی حوالہ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

ہندی گیت اپنے مزاج کے لحاظ سے جسم کی خواہش کا بے تابانہ اظہار ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا نے بجا طور پر اسے''جسم کی والہانہ پکار''قرار دیا ہے۔ہندی گیت جب اردو میں آیا تو اس میں مختلف رویے ابھر کر آئے۔ہندی میں گیت عورت کی آواز ہے۔اردو میں اس روایت کی پیروی بھی کی گئی اور اس کے برعکس مرد کی آواز میں گیت بھی لکھے گئے۔ہندی کے نرم و نازک الفاظ کو بھی اردو میں برتا گیا اور فارسی تراکیب کو بھی اردو گیت میں استعمال کیا گیا۔ہندی گیت دھرتی سے منسلک اور جسمانی طلب سے مملو ہے،اردو میں اس روایت کو ترک نہیں کیا گیا لیکن اردو میں بلند پروازی اور روحانی طلب کا اظہار بھی ہوا ہے۔یہ سارے رویے اردو گیت نگاروں کے ہاں جزوی طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ڈاکٹر فراز حامدی کے اردو گیتوں میں یہ سارے رویے پہلی بار یکجا دکھائی دے رہے ہیں۔یوں دیکھا جائے تو ایسے لگتا ہے کہ ہندی گیت سے اردو گیت تک کے سفر میں جتنے چشمے،ندیاں اور نالے آئے تھے وہ سب جیسے ایک دریا میں ڈھل گئے ہیں اور اردو گیت کے اس دریا کا نام ہے ڈاکٹر فراز حامدی!

مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر فراز حامدی کے گیتوں کا یہ مجموعہ گیت نگاری کی جمود سے ملتی جلتی یکسانیت کو توڑنے کا باعث بنے گا اور اس کی اشاعت سے اردو گیت،گیت کے بنیادی اوصاف کو برقرار رکھتے ہوئے مزید وسعت اختیار کرے گا۔ نمونۂ کلام کے طور پر دو گیتوں کے دو بند:

دیکھ ذرا دنیا کی چال — انہیں حوصلوں کی کہانی بنے گی

قدم قدم پر بچھے ہیں جال — یہی رسم تو زندگانی بنے گی

اپنی الگ اک راہ نکال — چلو تیز دھاروں کا رخ موڑ جائیں

پگلے من کا بھید نہ کھول — نشاں اپنا پانی پہ ہم چھوڑ جائیں

بات جو بولے۔۔۔۔ — امر ہوں گے چرچے ہمارے تمہارے جو تم اُس کنارے۔۔۔

کتاب میلہ   تعارف نگار: ریحانہ احمد

کب صبح ملن ہو گی (ماہیے)   اعزاز احمد آذر

اعزاز احمد آذر اردو اور پنجابی کے معروف شاعر اور ادیب ہیں۔صحافت سے بھی منسلک ہیں۔زیرِ نظر مجموعہ ’’کب صبح ملن ہوگی‘‘ ان کے ماہیوں پر مشتمل ہے۔چونکہ اعزاز احمد آذر اردو کے ساتھ پنجابی کے بھی شاعر ہیں،اسی لئے انہیں ماہیے کی تفہیم میں کوئی الجھن پیش نہیں آئی اور ان کے اردو ماہیے بھی اپنے ثقافتی بہاؤ میں از خود ہوتے چلے گئے ہیں۔کتاب کا پیش لفظ حیدر قریشی کا تحریر کردہ ہے۔اعزاز احمد آذر نے اپنے ماہیوں کا یہ مجموعہ اردو ماہیا کی اہم شخصیت امین خیال جی کے نام کیا ہے۔۱۴۴صفحات کی یہ کتاب گل پبلی کیشنز گوجرانوالہ نے عمدگی کے ساتھ شائع کی ہے۔☆☆☆

کسی حیران ساعت میں (نظمیں)   فیصل ہاشمی

ناروے میں مقیم اردو کے نوجوان شاعر فیصل ہاشمی کی نظموں کا مجموعہ ’’کسی حیران ساعت میں‘‘ لاہور سے کاغذی پیرہن کے زیرِ اہتمام شائع ہوگیا ہے۔۵۴نظموں پر مشتمل ۸۸صفحات کی یہ دیدہ زیب کتاب فیصل ہاشمی نے اپنے مرحوم بھائی مسعود ہاشمی کے نام انتساب کی ہے۔’’کسی حیران ساعت میں‘‘ کا پیش لفظ ڈاکٹر وزیر نے لکھا ہے اور فلیپ پر شاہد شیدائی کی رائے درج ہے۔فیصل ہاشمی کی ایک مختصر نظم سے ان کی نظم نگاری کے مزاج کا اندازہ کیا جا سکتا ہے: **حادثہ**   زندگی چابیوں کا گچھا ہے/جس میں خوشیوں کے نام کی چابی/رکھوگئی جب اسے اچھالا تھا

☆☆☆

چراغِ درد (شاعری)   احسان سہگل

احسان سہگل ہالینڈ میں مقیم ہیں۔انہوں نے ایک عرصہ سے ایک ’’مسلم اقوام متحدہ‘‘ بھی قائم کر رکھی ہے۔ان کی شاعری کے پانچ مجموعے چھپ چکے ہیں اور ’’چراغِ درد‘‘ ان کا چھٹا مجموعہ ہے۔اس کے پیش لفظ میں انہوں نے ’’دونئی بحروں کی ایجاد‘‘ کے عنوان سے اپنی دونئی بحریں بیان کی ہیں۔اور آخر میں نوٹ دیا ہے کہ بعد میں کسی ادیب نے بتایا ہے کہ ان بحروں کا ذکر بحر الفصاحت میں موجود ہے۔احسان سہگل اپنے انداز کے شاعر ہیں۔عروض و بحور پر ان کی استادانہ گرفت کمال کی ہے۔عروضی تجربات کرتے رہتے ہیں اور اس طرح اچھے بھلے لوگوں کو حیران کرتے رہتے ہیں۔یہ مجموعہ بھی ان کے مخصوص انداز کی غزلوں اور اشعار سے آراستہ ہے۔۸۰ صفحات کا یہ مجموعہ اردو کلچرل سوسائٹی۔ڈی ہیگ۔ہالینڈ نے اچھے طریقے سے شائع کیا ہے۔☆☆☆

میری گفتگو تجھ سے (غزلیں)   مدحت الاختر

ڈاکٹر مدحت الاختر ایک عرصہ سے شاعری کر رہے ہیں۔جدید غزل گو شعراء میں ان کا نام شمار ہوتا ہے۔’’میری گفتگو تجھ سے‘‘ ان کا تازہ شعری مجموعہ ہے۔جس میں زیادہ تر غزلیں ہیں صرف آخر میں چند متفرق

اشعار اور ایک سہرا شامل کیا گیا ہے۔کتاب کے شروع میں شمس الرحمٰن فاروقی اور شاہد کبیر کے مضامین بطور پیش لفظ شامل ہیں فلیپ پر محمد حفظ الرحمٰن کا تعارفی نوٹ درج کیا گیا ہے۔۱۶۰صفحات کا یہ بہت خوبصورت مجموعہ سید احمد نانتھ نے لائف ٹائمز پبلیکیشنز۔ناگپور کے زیرِ اہتمام شائع کیا ہے۔☆☆☆

وہی تازگی وہی روشنی (شاعری)   اسرار زیدی

اسرار زیدی پاک ٹی ہاؤس کے حوالے سے اور اخبارِ جہاں میں لاہور کی ادبی سرگرمیوں کی اشاعت کے حوالے سے بخوبی جانے جاتے ہیں۔دھیمے مزاج کے انسان ہیں جسے ڈاکٹر تبسم کاشمیری ان کی درویشی قرار دیتے ہیں۔یہی رویہ ان کی شاعری کے مزاج میں شامل ہے جو بقول ڈاکٹر رشید امجد ’’اسرار زیدی کے شعری مزاج میں ایک ٹھہراؤ ہے‘‘۔اسرار زیدی کے اس شعری مجموعہ میں حمد،نعت،نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔پیش لفظ ڈاکٹر رشید امجد کا تحریر کردہ ہے جبکہ فلیپ پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی رائے درج ہے۔۱۶۰صفحات کا یہ مجموعہ دستاویز مطبوعات لاہور نے اہتمام سے شائع کیا ہے۔☆☆☆

فنون آشوب (طویل نظم)   سعادت سعید

ڈاکٹر سعادت سعید کا تعلق ادب کی اس لہر سے ہے جسے ’’نئی لسانی تشکیلات‘‘ والوں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ان کی تنقید ہو یا نظمیں وہ یقینی طور پر اپنے مسلک کی عمدہ ترجمانی کرتے ہیں۔’’فنون آشوب‘‘ ڈاکٹر سعادت سعید کی طویل نظم ہے۔اس میں انہوں نے فنونِ لطیفہ میں سے فن کی گرمی کے غائب ہو جانے کا المیہ بیان کیا ہے۔اپنی نظم کا طویل مقدمہ انہوں نے خود لکھا ہے۔اس کے بعد نظم کا پہلا باب ’’تعارف‘‘ پر مبنی ہے۔اس کے بعد ان چھ فنون کے حوالے سے الگ الگ ابواب میں انہوں نے اپنے دل کی باتیں کی ہیں۔’’سنگ تراشی‘‘۔’’مصوری‘‘۔’’خطاطی‘‘۔’’شاعری‘‘۔’’موسیقی‘‘ اور ’’رقص‘‘۔نظم میں ایک ہی بحر اختیار کی گئی ہے اور نظم کا بہاؤ متاثر کن ہے۔لفظوں کے استعمال میں ڈاکٹر سعادت سعید نے ’’نئی لسانی تشکیلات‘‘ کے نعرے کو گویا پھر سے زندہ کر دیا ہے۔۷۶اصفحات پر مشتمل یہ طویل نظم ابلاغ پبلشرز،اردو بازار لاہور نے سادگی سے شائع کی ہے۔

☆☆☆

سات سمندر پار (سفرنامہ)   علی احمد فاطمی

علی احمد فاطمی ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر لکھنے والوں میں ایک اہم نام ہے۔ان کی کتاب ’’سات سمندر پار‘‘ ان کے دو سفرناموں کا مجموعہ ہے۔پہلا سفر کینیڈا کا ہے اور دوسرا سفر تاشقند کا۔ان سفرناموں میں نئے دیاروں کو حیرت سے دیکھنے کے ساتھ اپنے میزبانوں کی شکر گزاری کا احساس غالب ہے۔کینیڈا کے اقبال حیدر اور ان کے خاندان کا ذکر ایسے انداز سے ہوا ہے کہ اس فیملی سے ملنے کا شوق ہونے لگتا ہے۔۱۶۰صفحات کا یہ سفرنامہ ادارہ نیا سفر الٰہ آباد نے اہتمام سے شائع کیا ہے۔☆☆☆

شونار بنگلہ (سفرنامہ) قمر علی عباسی

قمر علی عباسی نہ خود سفر کرنے سے باز آتے ہیں نہ اپنے قارئین کو دَم لینے کی مہلت دیتے ہیں۔اب تک ان کے بائیس سفرنامے چھپ چکے ہیں۔''شونار بنگلہ'' ان کا تازہ سفرنامہ ہے۔پاکستانیوں کے لئے بنگلہ دیش کا سفر دل میں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی کئی لہروں کا سفر بن جاتا ہے۔قمر علی عباسی کو بھی ایسی ہی صورتحال درپیش رہی۔شاید اسی لئے سفرنامہ کے آغاز سے پہلے ہی کتاب پر لکھی ہوئی ''آیت کریمہ'' بجائے خود ایک اقرار بن جاتی ہے۔ انہوں نے بڑی فنی مہارت کے ساتھ نہ صرف جذبات کو قابو کئے رکھا بلکہ اپنی روایتی شگفتگی کو بھی برقرار رکھا ہے۔۱۹۰ صفحات کا یہ عمدہ سفرنامہ ویلکم بک پورٹ کراچی نے اپنے روایتی اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ان کا یہ سفرنامہ بھی ان کے قارئین میں مقبول رہے گا۔☆☆☆

جانشین داغؔ...بھائی جان عاشق مرتب: سنجئے گوڑ بولے

راجستھان کے شہر ٹونک میں ایک شاعر ہوا کرتے تھے ''بھائی جان عاشق''۔آپ حضرت داغؔ کے شاگرد رہے۔سنجئے گوڑ بولے جنہیں نوادرات جمع کرنے کا شوق ہے ادبی دنیا میں بھی نوادرات جمع کرتے رہتے ہیں۔انہوں نے بھائی جان عاشق کے بارے میں بہت ساری معلومات حاصل کیں،ان کا دستیاب کلام جمع کیا اور یہ کتاب مرتب کر دی۔ابتدائیہ سنجئے گوڑ بولے نے خود لکھا ہے جبکہ ایک طویل مضمون ''حضرت داغؔ دہلوی کے نورتنوں میں سے ایک رتن اور تلمیذ: عاشق ٹونکوی'' کے زیرِ عنوان سید منظورالحسن برکاتی نے لکھا ہے۔اس مضمون کو اس کتاب کا مقدمہ کہا جا سکتا ہے۔آخر میں بھائی جان عاشق کا کلام یکجا کیا گیا ہے۔۸۸ صفحات کی اس کتاب کو تکششیلا پبلی کیشنز پونہ نے شائع کیا ہے۔انتساب نذیر فتح پوری کے نام کیا گیا ہے جو راجستھان کے آج کے معروف شاعر ہیں اور اب پونہ میں مقیم ہیں۔☆☆☆

امینِ حزیںؔ شخص،شاعر اور استاد مرتب: نذیر فتح پوری

پونہ میں جن چند لوگوں نے اردو کی شمع کو روشن رکھا ہوا ہے ان میں امینِ حزیں ایک اہم نام ہے۔سہ ماہی اسباق پونہ کے مدیر اور معروف شاعر نذیر فتح پوری نے امینِ حزیں کے بارے میں یہ کتاب مرتب کر کے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔امینِ حزیں کی اردو خدمات کا سلسلہ استاد کی حیثیت سے لے کر صحافت اور ادب تک پھیلا ہوا ہے۔اس کتاب میں ان ساری خدمات کا اختصار کے ساتھ احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ادبی دنیا کے ڈاکٹر محبوب راہی،قاضی مشتاق احمد،حیدر قریشی،ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی،ساحر شیوی،اسلم حنیف،نذیر فتح پوری اور دیگر کے تاثرات اور مضامین شامل ہیں جبکہ ان کے بہت سے جاننے والے علمی دوستوں اور شاگردوں کی ایک خاص تعداد نے ابھی اپنے پُرخلوص خیالات کا اظہار کیا ہے۔۱۴۴ صفحات کی یہ عمدہ کتاب اسباق پبلی کیشنز پونہ نے شائع کی ہے۔نذیر فتح پوری کی یہ کاوش لائقِ ستائش ہے۔☆☆☆

پروفیسر آفاق صدیقی (کراچی)

''انت سے آگے'' = انت سے آگے کا سفر

نصف صدی پہلے کا ذکر ہے ماہنامہ ادب لطیف لاہور کا سالنامہ ۴۸ء شائع ہوا تو اس میں گیت پر مختار صدیقی کا مقالہ دیکھا اور اس بات پر بڑا دکھ ہوا کہ اردو میں گیتوں کے حوالے سے عظمت اللہ خاں،حفیظؔ جالندھری اور میرا جیؔ پر صاحبِ مضمون نے بہت کچھ لکھا مگر آرزو لکھنوی کا نام تک نہ لیا۔اس کوتاہی کی تھوڑی سی تلافی میں نے اپنے طور پر علامہ آرزو لکھنوی کے گیتوں پر ایک مضمون لکھ کر کی۔وہ مضمون ادبِ لطیف ہی کو بھیجا مگر اس کی اشاعت نہ ہوئی۔کچھ عرصے بعد خیر پور میرس کے ایک کل پاکستان مشاعرے میں شرکت فرمانے آرزو صاحب تشریف لائے اور میں نے اپنے مضمون کا ذکر کرتے ہوئے ان کے سریلے گیتوں کی تعریف میں کچھ کہنا چاہا تو میری بات سنے بغیر وہ چہک اٹھے ''پہلے یہ غزل سنو''

آج بے آپ ہو گئے ہم بھی
آپ کو پا کے کھو گئے ہم بھی
دانے کم تھے دکھوں کی سمرن میں
تھوڑے موتی پرو گئے ہم بھی
روئیں بھی گر تو جگ ہنسائی ہو
کرتے کیا چپ سے ہو گئے ہم بھی

میں نے پورے دھیان سے غزل سنی اور چپ رہ گیا۔اب ایسی ہی چپ نگار صہبائی کی گیتوں کی تیسری کتاب ''انت سے آگے'' نے لگائی ہے۔یہ کتاب کسی شاعر کا ایسا مجموعہ کلام نہیں کہ آسانی سے لب کشائی کا حوصلہ دے اس کی لفظیات اور لفظ لفظ کی تہہ داریوں میں اتری ہوئی گہری معنویت گیان،دھیان اور ماورائے امکان کی سوچوں میں گم کر دینے والی معنویت ہے۔اس لیے بار بار سوچا اور محسوس کیا کہ نگار صہبائی کی نواہائے راز کا محرم کیسے بنا جائے۔خیر سے ہندی تو میں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں خوب پڑھی اور طرح طرح کے گیتوں سے بھی لطف اندوز ہوتا رہا اس لیے ''انت سے آگے'' کا مطالعہ کرنے اور الفاظ کی ظاہری سج دھج کو سمجھنے میں

دشواری نہ ہوئی مگر مشکل یہ کہ ان محسوسات کو بیان کیسے کریں۔

گوئٹے نے کہا تھا ''بہترین اور اعلیٰ شعری تخلیق محیط امواج ہوتی ہے تم جس طرح چاہو مطالعہ کرو'' ٹھیک ہے مطالعہ تو کرلیا اب اس ''محیط امواج'' کو اپنے الفاظ کی گرفت میں لانا چاہتا ہوں تو سلیم احمد، انجم عظمی اور ڈاکٹر ذکاء الدین شایان کی نثری تحریریں بھی گنو پکڑنے کا حوصلہ تو دیتی ہیں جگنو پکڑ کر میری مٹھی میں دینے سے گریز کر رہی ہیں۔

یہ بھی غنیمت ہے کہ ان ممتاز اہل قلم اور نگار صہبائی کے گیتوں سے شناسائی رکھنے والوں نے ڈھیر بندھائی تو آیئے سب سے پہلے سرورق پر جمیل نقش کے رنگوں کی شاعری کو دیکھتے ہیں جو تجریدی فنِ مصوری کا نقشِ جمیل ہے۔ بڑے صوفیانہ رنگ جو زمانی و مکانی حدود سے بالا تر اور محدود فکر و خیال سے الگ تھلگ بصارت وبصیرت کو یہ درس دے رہے ہیں کہ ''صد جلوہ رو برو ہے جو مژگاں اٹھایئے'' کوئی سدا سہانا گیت آنکھوں سے سنایا جائے یا کوئی سندر ناری گائے اس میں جو روحانی انبساط محسوس ہوتا ہے کچھ ویسی ہی غیر مادی نشاط آفرینی اپنے جمالیاتی رکھ رکھاؤ کے ساتھ سرورق کی مصوری میں موجود ہے جس کی داد نگار صہبائی نے بہت ہی من موہنے الفاظ میں دی ہے۔

سند ر تا کیا ہے
من میں تن کے پھول کھلے
کس نے د یکھا

میں گنگنا رہا تھا کہ دور سے آواز آئی میں نے دیکھا ہے۔

میں نے اس آواز کی طرف گھوم کر دیکھا تو خوشی سے پاگل ہوگیا۔ میرے عہد کے مہا چتر کار جمیل نقش میرے گیتوں کے اپنے دل کے رنگ سے گل بوٹے بنا رہے تھے اور پھر انہوں نے یہ گل بوٹے مجھ پر نچھاور کر دیئے۔ میرا دل بھر آیا اور پھر میں نے اپنے لفظوں سے بنائی ہوئی تصویر ان کے سواگت کے لیے جمیل نقش کے چرنوں میں رکھ دی۔ جمیل نقش مہا چتر کار اور نگار صہبائی مہا کوی۔ حساب برابر ہوگیا اور اب سلیم احمد کے یہ الفاظ میرے سامنے ہیں

''اردو گیت کی روایت میں نگار صہبائی پہلا شاعر ہے جس نے اس صنف کو اردو کی سنجیدہ تخلیقی صنف بنا دیا۔ نگار صہبائی گیتوں میں اتنی تازہ اور نادر امیجز سے اپنے نگار خانۂ فن کو سجاتا ہے کہ گویائی کی حدود اس فضائے سکوت کو چھونے لگتی ہیں جو ماورائے سخن وجود رکھتی ہے۔''

اس میں شک نہیں کہ اب نگار صہبائی کی پہچان ان کے گیت ہیں اور یہ گیت سطحی سوجھ بوجھ سے قابو آنے والے نہیں کیونکہ ان کا سفر انت سے آگے کا سفر ہے۔ سوال یہ کہ سورج ہمیں سمجھانے والا کون ہوتا ہے؟ اور میری دانست میں جواب یہ ہے کہ خدائے نادیدہ نے سورج کے ذریعے ہمیں روشنی دی ہے کہ تاحدِ نظر بلکہ افق تا

افق ہم اس دنیا کو دیکھ سکیں جس میں رہتے بستے ہیں۔ سورج کا سفر بھی ہماری طبعی عمر رواں کی طرح محدود ہے مگر اسے یہ برتری حاصل ہے کہ وہ ۲۴ گھنٹے میں ساری دنیا میں گھوم لیتا ہے۔ اس لیے جہاں دیدہ کہلانے کا مستحق اور اس کی یہ بات دل کو لگتی ہے کہ انت سے آگے بھی اک سفر ہے۔ وہ کیسا ہے، کیوں ہے اور کب تک ہے؟ اس کا حال کون بتائے؟

آیئے اب پیڑ کے نیچے شام کا ڈھلنا دیکھتے ہیں۔ عوامی کلچر سے نابلد لوگوں کو بھلا کیا معلوم کہ پیڑ صرف کسی درخت یا شجر کا نام نہیں بلکہ پیار، محبت، بھائی چارے، مشفقانہ سرپرستی، بزرگی اور سکون وعافیت کی علامت ہے۔ بچپن میں جب ہم بیل گاڑی میں اپنے گھر والوں اور عزیز واقارب کے ساتھ دور کسی گاؤں میں جاتے تھے تو تپتی دھوپ میں سفر کرتے کرتے شام ہو جاتی تھی۔ شام ڈھلنے کا منظر اور وہ بھی پیڑ کے نیچے تھکے ماندے گاڑی بان کو کیسا لگتا ہوگا۔ اس احساس کو نگار صہبائی نے بڑے سجل لفظ ''بھایا'' میں سمو دیا ہے۔ غور کیجئے کہ جیون کے سفر میں ایسے پڑاؤ ہمیں کیسے لگتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ نگار صہبائی کے گیتوں کے ساتھ اسی کتاب میں ایک شرح بھی شامل اشاعت ہونی چاہیے کیوں کہ پہلے گیت سے لے کر آخر کے گیتوں تک ایسے بول بہت سے ہیں جو اردو شعر وادب کے رواجی قارئین اور عمومی غزلوں کے شائقین کی سمجھ میں نہیں آسکتے مثال کے طور پر کچھ بول پیش کرتا ہوں۔

تن سے من تک میں ہی میں تھا
رات نے پردے اٹھا دیئے
پل نے پل کو دکھا کے درپن
سمے کے دو جگ بنا دیئے
شام ابھی سے گوندھ رہی ہے
گجرے تیری راتوں کے
جنگل میں بازار لگے ہیں
بھولی بسری باتوں کے
پچھلے پہر کو آ کر کوئی
میری چوکھٹ سے کہتا ہے
کوئی بھی رت ہو سمے کا درپن
پون کے ہاتھوں میں رہتا ہے
اک دیپک کی چھاؤں کے نیچے

سمٹ گئی ا نگنا ئی
کتنی سندر ہے جیون کی شام
لکھ دیا میں نے مٹی پہ نام
گھائل من میں لو دیتے ہیں

کسی مغربی مفکر کا کہنا ہے We are moving ashes to ashes گویا ہمارے جیون کا یہ سفر خاک کے ڈھیر سے خاک کے ڈھیر تک ہے۔ لیکن شاعر مشرق علامہ اقبال کی یہ بات ہمارے من درپن کو انت سے آگے آگے لے جاتی ہے۔

پریشاں ہو کے میری خاک آ کر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

میں نے گیتوں کی جو چند ٹکڑیاں پیش کیں ان گیتوں کو مجموعی طور پر نگار صہبائی نے ''من رچنا'' کہا ہے۔ پھر وہ گیت ہیں جو ''سمے کویتا'' کے زیرِ عنوان ہیں پھر ایک گیت کا مکھڑا یہ ہے کہ ''جانے کیا سپنے دیکھے تھے''۔ اس کے بعد ''رت سنگیت'' کے گیت ہیں ''میں سورج کے ساتھ چلا جاتا'' اور پھر ''گیان گیتا'' کے ۲۵ گیت جن میں آتما' پرماتما کے گیان دھیان میں ڈوبی ہوئی کہیں ''اندھیارے کی سونی اٹریا پر'' رین کوڑے کھولنے والے'' ملن کے لیے بے کل ہے۔ کہیں پل کے جھروکے سے جھانک کرانت سے آگے کی کھوجنا میں بے چین ہے۔ کہیں ''من ہے آشا انگ تراشا'' کے دو بڑے سنسار یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ''کس رت سے ہے کس کا ناتا۔''

سوچتا ہوں کہ ''ماورائیت'' کا سفر تو نگار نے ''جیون درپن'' ہی میں شروع کر دیا تھا جس کے لیے سلیم احمد نے کہا تھا کہ ''وہ بھگتی تحریک میں اسلامی روایت کے ایک ایسے رنگ کا آغاز کر رہا ہے جو صرف نگار ہی کر سکتا ہے۔''

سلیم احمد زندہ ہوتے تو دیکھتے اور محسوس کرتے کہ نگار نے ''انت سے آگے'' کا سفر کس رکھ رکھاؤ سے کیا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس سفر کی روداد کو ہمارے اس دیس میں سمجھنے والے کتنے ہیں؟ کتنوں کو یہ معلوم ہے کہ غیر منقسم وشال بھارت اور خصوصاً بالائی ہند میں جو بھگتی تحریک پروان چڑھی تھی اس میں اسلامی فلسفہ توحید کا کیا عمل دخل تھا؟ ہندومت میں گیت سنگیت ازلی وابدی روحانی سوز وسرور کا سرچشمہ رہے ہیں۔ ویدانتی فلسفہ حیات میں ''شام وید'' کو سنگیت کے اولین تحفے کی حیثیت حاصل ہے۔ اس طرح سنسکرت سے یہ فن مذہبی امانت اور وراثت کے طور پر مختلف علاقوں اور وہاں کی بولیوں میں آیا جہاں آریوں کی آمد سے پہلے بھی لوک گیتوں کا رواج تھا اور وہ لوگ گیت اور سنگیت کی روایات سینہ بہ سینہ اس عہد تک آئی تھیں جب آریوں نے شمالی ہند پر قبضہ کر کے آریہ ورت میں جنگ وجدل کی جلالی صفات سے مصلحتاً دست بردار ہوتے ہوئے امن وآشتی، میل ملاپ اور دین دھرم کے وہ

پہلو اپنائے جن میں افقی وعمودی وسعتیں گلے ملنے لگیں۔ تاریخی تناظر میں صنم یاتی، میتھولوجی اور ہندومت کی رنگا رنگ صورتیں دیویوں اور دیوتاؤں کی شکلوں میں نمودار ہوتی رہیں۔ برہمنوں کی بالا دستی اور مذہبی برتری اپنا رنگ جماتی رہی۔ مندروں اور تیرتھ گاہوں میں بھجن منڈلیاں عروج پاتی گئیں پھر بودھ مت اور جین مت کے انقلابی دھارے بھی عوامی کلچر کو ایک نیا روپ سروپ دے گئے۔

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد اور فتوحات پیہم نے ایک ایسے کلچر کو جنم دیا جس میں صوفی بزرگوں کی خانقاہوں کے خدا دوست اور انسان دوست جذبے مقامی ثقافتوں میں گھل مل گئے اور اس طرح پریم رس نے باہمی رواداری کی وہ صورتیں پیدا کیں جو سدا بہار جمالیاتی نکھار کے ساتھ حضرت امیر خسرو کے گیتوں نے بہت دور دور تک پہنچائیں۔ پچھلے سات آٹھ سو برسوں سے ہماری دیسی زبانوں اور بولیوں میں گیتوں کا بہت بڑا سرمایہ موجود ہے ان میں وہ لوک گیت بھی ہیں جو ابھی تک تحریری شکلوں میں محفوظ نہیں کیے گئے اور وہ گیت بھی جو بلند پایہ صوفی شعراء کے کلام میں جلوہ گر ہیں مثلاً پاکستانی حدود میں شاہ لطیف' سچل سرمست، بلھے شاہ، خواجہ غلام فرید، شاہ حسین، رحمان بابا، مست توکلی اور کئی دوسرے صوفی بزرگوں کی زبانیں تو مختلف ہیں مگر ان سب کے کلام میں قدرِ مشترک کے طور پر کچھ ایسی ہی روح پرور کیفیات ملتی ہیں جن کا رچاؤ نگار صہبائی کے گیتوں میں ہے۔

پروفیسر انجم اعظمی نے نگار صہبائی کو عہدِ حاضر کی ایک اہم آواز قرار دیا تھا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب ان کے گیتوں کی پہلی کتاب ''جیون درپن'' کی دھوم مچی تھی اور ان کے گیتوں کا دوسرا مجموعہ (من گاگر) شائع ہو رہا تھا۔ جس کے بارے میں انجم اعظمی نے یہ کہا کہ ''شاداب امیجز کی بھرپور عنائیت نظر کی گہرائی، عشق کے مسحور کن انداز، قلندرانہ روش اور زندگی سے والہانہ لگاؤ کو ''من گاگر کو سمو کر نگار نے اپنے لہجے کی دھار نمایاں کی ہے اور امر کویتا لکھی ہے۔ تاریخی تسلسل میں امیر خسرو اور آرزو لکھنوی کے بعد اردو گیت لکھنے والوں میں نگار صہبائی تیسرا بڑا نام ہے۔''

''من گاگر'' کے گیتوں پر ڈاکٹر ذکاء الدین شایان کا تبصرہ بھی نگار کی اس تیسری تصنیف یعنی ''انت سے آگے'' میں شامل اشاعت ہوا ہے اور تبصرہ نگار کی یہ بات دل کو لگتی ہے کہ ''من گاگر'' میں زندگی کی دیکھی اور ان دیکھی سچائیاں ہمیں روحانی اور حقیقی سطح دونوں پر برابر ملتی ہیں اور ہمارے ذہن واحساس کو ہر لمحہ چونکاتی اور جگمگاتی گزر جاتی ہیں۔''

میں نے نگار صہبائی کے گیتوں کی تینوں کتابوں کو بغور پڑھا ہے اور میرا تاثر یہ ہے کہ کسی ایک مضمون اور کسی ایک تبصرے میں ان تمام کیفیات اور اچھوتی من ترنگ کو سمویا ہی نہیں جا سکتا جو نگار کی لفظیات سے عبارت ہیں۔ یہ اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پانے کا عمل ہے۔ یہ عالم موجودات کو ظاہری آنکھوں سے نہیں بلکہ آنکھیں موند کے دیکھنے اور محسوس کرنے کی سچی لگن ہے، یہ گیان دھیان اور وجدان کی ان منزلوں کے نشان ہیں جو

منزلیں اپنا مادی وجود اگر رکھتی بھی ہیں تو خود اپنے وجود سے بے نیاز ہیں ۔نگار صہبائی کے گیت لب و لہجے کی غنائیت میں طربیہ ہیں مگران گیتوں میں تن اورمن کی نبرد آزمائی سرد جنگ کا سماں پیش کرتی ہے۔ عالم آب وگل اور اپنے وجود خاکی سے بالاتر ہوکرالوہیت کا سفرکوئی آسان کام نہیں۔ میں تو حیرت زدہ ہوں کہ ان گیتوں کی شاعری کوکس کس زاویے سے سمجھوں اورمحسوس کروں۔ ڈاکٹر آئی اے رچرڈ نے سچ ہی کہا ہے:

"Poetry is not the thing which can be verified."

یہ تو روح کے پردے میں محسوس کیے جانے والے احساسات کے استعارے ہیں جوگیتوں کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں ۔عزیز حامد مدنی نے ایک بہت فکرانگیز بات کہی تھی کہ ''زندگی کی ہزاروں ضدیں ،ذہن اس کا تخلیقی عمل ،تہذیب اوراس کانقش ونگاراپنی پیدائی کے لیے ہمیشہ ایک تازہ اسلوب بیان ہمیشہ ایک تازہ فکری افق کی تلاش میں ہوتے ہیں۔''

نگار صہبائی نے تازہ بہ تازہ اسلوبِ بیان اور تازہ فکری افق کی تلاش جاری رکھی اوراس تلاش میں آکاش سے پاتال تک اپنے فکروخیال اورجذبہ واحساس کودوڑاتے ہوئے ''انت سے آگے'' کی خبر لانے کی مہم پر چل نکلے۔ اس مہم جوئی کی کچھ اگلی پچھلی جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

سپنے تتلی بن کر گھومیں نینتوں کی پھلواری میں
رادھا اپنا آپ نہ سمجھے موہن کو کیا پائے
سونے رستے پاؤں پکڑ کر مجھ سے پوچھیں
جگ بیتا اے میت پرانے
کہاں سے لوٹ کے آئے
مہندی سے لکھ دوری ہاتھوں پہ سکھیو میرے سنوریا کا نام
اپنی اور سے دور بھی جا کر اپنی اور ہی پہنچے ہیں
پھول بن کر جہاں بھی کھلا ہوں
اپنی سانسوں میں تجھ سے ملا ہوں
بوند میں بھی ندی بہہ رہی ہے
کون لکھے کہ مت پھر گئی ہے
میرے اندر جھانک کے دیکھو
آنکھ بہت کچھ پائے گی
کھوج رہا ہوں سات سروں کو

بانسریا میں کون بھرے ہے

نگار صہبائی کی مت واقعی پھری ہوئی ہے جو ہفت خواں طے کرکے انت سے آگے کی خبر لانے میں منہمک ہیں۔لیکن یہ مقدس دیوانگی بھی ہرکس وناکس کوکہاں ملتی ہے جوسنجیدگی سے ایسے سوال اٹھائے جو دنیا کے مہاپرشوں اورعظیم شاعروں کے ذہنوں کوخدا جانے کس جہانِ معنی میں لے جاتے ہیں۔اوروہی کیفیت ہوتی ہے جو میر کے اس شعر میں ہے۔

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو　　　　دیر سے انتظار ہے اپنا

کچھ عرصے پہلے کی بات ہے ،محترمہ اویلین انڈریل (Evelyn Underhill) کی ضخیم کتاب مسٹیسزم (Mysticism) کا مطالعہ کررہا تھا جس میں وہ ماورائیت کے بارے میں لکھتی ہیں: "Its appeal will not be to the clever brain ,but to the desirous heart,the intuitive sense of man."

موصوفہ کا کہنا یہ ہے کہ روحانی تجربات کو بیان کرنے کے لیے علامتوں کا سہارا لینا پڑتا ہے کیوں کہ ان کا براہ راست اظہار ممکن نہیں۔ان کے نزدیک علامتوں کے تین بڑے درجات ہیں۔ پہلا درجہ تلاش و تجسس سے عبارت ہے۔دوسرا درجہ اپنے من میں ڈوب کراس قوتِ روحانی کو پانے کا ہے جو دلوں کو فتح کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو اور وہ محبت کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے۔تیسرا درجہ باطنی تطہیر و تکمیل کا ہے۔

نگار صہبائی کی تین کتابوں میں یہ تینوں درجات علامتی سطح پر موجود ہیں۔ ویسے تو ہر شاعر اپنی وارداتِ قلبیہ کا اظہار کچھ علامتوں کے سہارے کرتا ہے اور غزلیہ شاعری میں بہت سی علامتیں ایسی ہیں جن کے اظہار و ابلاغ سے اردو شاعری کے سمجھ دار قارئین کافی حد تک آشنا ہو چکے ہیں۔مگر نگار صہبائی کے گیتوں میں علامتوں کا جو سندر بن اپنی بہار دکھاتا ہے اس کی تفہیم آسان کام نہیں اور عام فہم نہ ہونے کا ایک خاص سبب یہ ہے کہ اردو کی شہرت ومقبولیت یافتہ شاعری میں بھی جو ثقافت جھلکتی ہے وہ ثقافت گیتوں میں اگر کسی قدر ہے بھی تو اس کا ابلاغ ایسے گیتوں کے ذریعے ہوا ہے جو فلم، ریڈیو اور ٹی وی کے لیے لکھے گئے۔

نگار صہبائی کے یہ گیت تو بار بار پڑھنے اور گیان دھیان میں ڈوب کر سمجھنے کی چیزیں ہیں اور ان کو سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جو علامات ،اصطلاحات ،اشارات ،استعارات اور تلمیحات وغیرہ ان گیتوں میں برتی گئی ہیں انہیں صدیوں کے ثقافتی دھاروں میں تلاش کرکے سمجھا جائے۔

☆☆☆☆☆☆☆

''گیت غنائی شاعری کی ایک ہئیت تو ہے مگر ہر غنائی شاعری کوگیت نہیں کہا جا سکتا۔گیت کی ہیئت کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک کہ اس میں ٹیک کا مصرعہ نہ پرو دیا جائے۔گیت نما نظموں اور خالص گیتوں میں یہ ٹیک کا مصرعہ خطِ امتیاز قائم کرتا ہے''(**بیکل اتساہی**۔بحوالہ ''آنسو آنسو برکھا''۔ص ۱۳)

ڈاکٹر منظر حسین (رانچی)

کتابِ عشق
روحانی مکاشفات کی تمثیل

ادب انسانی زندگی کا حسین ترجمان، اُس کے افکار کا پرتو اور اس کے خیالات کا عکس ہوتا ہے۔ لہٰذا ادب اور زندگی کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عالمی ادب میں کوئی بھی بڑا ادیب اور فنکار ایسا نہیں جس نے ادب کو زندگی کی بہتری کے لیے استعمال نہ کیا ہو۔ ادب کا وجود زندگی کے وجود پر موقوف ہے اور زندگی کا سب سے عظیم تصور خدا کا تصور ہے۔ خدا کے تصور کے بغیر اعلیٰ شعر و ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔ تعمیری ادب کی فکری اساس کے اِس بنیادی تصور کو ہم ''ذوق عبودیت'' سے موسوم کر سکتے ہیں جو ہماری زندگی کو ایک نیا نشاط، نئی قوت اور نئی توانائی بخشتا ہے۔ طاعت و بندگی کا یہ تصور انسان میں یقین کی روشنی اور ایمان کی حرارت پیدا کرتا ہے۔ ایک شاعر و ادیب جب اس یقین و ایمان سے معمور ہو جاتا ہے تو اُس کا سینہ روشن اور قلب ضیاء بار بن جاتا ہے جس کے نتیجے میں اُس کی تخلیق سے علم و عرفان اور رشد و ہدایت کی ایسی شعاعیں پھوٹتی ہیں جو ذہنوں کو منور کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کے لیے حیات آفریں، باعث سکون و مسرت اور وجہ بصیرت و برکت ثابت ہوتی ہیں۔ طاعت و بندگی کا یہی جذبہ و عمل ابن آدم کے جسم خاکی میں سوز و ساز، درد و داغ اور تب و تاب بخشتا ہے۔ اِسی کیفیت کا دوسرا نام ''عشق'' ہے۔ تخلیق کائنات اور حیات انسانی کے ارتقاء میں عشق اور معاملاتِ عشق کو ایک بنیادی اور کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اِسی جذبے نے خدا کو تخلیق پر مائل کیا۔ لہٰذا عشق کا جذبہ باعث ایجاد عالم بھی ہے اور مقصد ہستی کے حصول کا ذریعہ بھی۔ عشق ہی کے بدولت انسان کو اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ یہ کائنات اس کے اور صرف اُسی کے لیے تخلیق کی گئی ہے۔ عشق وہ نعمت کبریٰ ہے جو یقین کا راستہ دکھاتا ہے، زندگی کو با مقصد بناتا ہے اور مرد مومن میں الٰہی صفات پیدا کرتا ہے۔ اِس میں ہوا و ہوس کا شائبہ تک نہیں۔ بقول خلیفہ عبدالحکیم:

''مسلمانوں کے ہاں صدیوں سے عشق حقیقی اور عشق مجازی کی اصطلاحیں زبان زد عام ہیں۔ عشق حقیقی سے بعض

اوقات انسانوں کی باہمی بے لوث محبت مراد ہوتی ہے جس میں خود غرضی، نفسانیت یا جنسیت کا کوئی شائبہ نہ ہو اور بعض اوقات اِس کے معنی عشق الٰہی ہوتے ہیں یعنی اشخاص و اشیاء کی محبت کے ماوراء خدا کا عشق اور یہ عشق حقیقی دل میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان کا دل ہر قسم کی حرص و ہوس سے پاک ہو جائے:''

سرمد غم عشق بوالہوس را نہ دہند
سوز دل پروانہ مگس را نہ دہند

(فکر اقبال — خلیفہ عبدالحکیم) (ص:۲۱۶)

''عشق'' کی اصطلاح کو عالم گیر قوت حیات کے معنی پہنانے اور عشق کو ایک مستقل نظامِ فلسفہ کی بنیاد بنانے کا سہرا مشہور اسلامی فلسفی بوعلی سینا کو ہے جس نے اپنے رسالہ ''عشق'' میں عشق کا ایک منظّم فلسفیانہ تصور پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''عشق ایک عالمگیر جذبۂ حیات ہے۔ جو حیات کے نباتی اور حیوانی مدارج سے لے کر انسان کے روحانی ارتقا تک ہر سطح پر، حرکت اور ارتقا کے محرک جذبہ کی حیثیت سے کارفرما ہے۔''

(مشمولہ فلسفہ عجم از اقبال ص:۶۳-۶۴)

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کا ہر عمل عشق کے جذبے سے معمور ہے۔ یہ ایسا آفاقی جذبہ ہے جس کی وسعتیں زمان و مکان کی پابند نہیں۔ عشق سکون و طمانیت کا ضامن بھی ہے و خدا کی معرفت کا ذریعہ بھی اور خالق حقیقی کے قرب کا وسیلہ بھی۔ اللہ پاک کا ارشاد ہے:

یایتها النفس المطمئنةo ارجعی الی ربك راضية مرضيةo فادخلی فی عبدیo وادخلی جنتیo

''اے نفس مطمئن، چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش— پھر شامل ہو جا میرے خاص بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔''

اس آیت میں 'مطمئنہ' سے مراد وہ نفس ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اُس کی اطاعت سے سکون و قرار پاتا ہے اور اس کے ترک سے بے چینی محسوس کرتا ہے۔ اب حقیقی مذکورہ آیت میں اپنے لیے واحد متکلم کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے خود صاحب عشق کو اپنی قربت کا احساس دلاتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ عشق کی تجلیاں ہر شخص میں یکساں نہیں ہوتیں۔ ہر شخص کے دل میں اس کی بدولت مختلف قسم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض لوگ عشق میں دیوانے ہو جاتے ہیں اور گلیوں میں روتے پھرتے ہیں اور بعض لوگ اِسی عشق کی بدولت عارف ہو جاتے ہیں۔ اِس کی وجہ استعداد کی نوعیت ہوتی ہے۔

کسی شعر و ادب کا حسن و کمال ادیب و شاعر کے فکری و قلبی جلال و جمال کا پرتو اور آئینہ دار ہوتا ہے۔ جیسی حسین و

جمیل شخصیت ہوگی، اس کے حسن و جمال کا عکس اس کی تخلیق میں بھی پایا جائے گا۔ اُردو ادب میں صلاح الدین پرویز کی شخصیت مستغنی عن التعارف ہے۔ اُن کے ادبی وشعری کارنامے کو کسی ایک جہت میں مقید نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں تک اِن کی شاعری کا تعلق ہے۔ ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ اُن کی شاعری میں جمالیاتی واخلاقی اقدار کو بڑا دخل ہے۔ ساتھ ہی عشق کی سرشاری کو بھی کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ صلاح الدین پرویز اپنے قلم کو خالق کائنات کی امانت سمجھتے ہیں جس کے توسط سے وہ اپنی نیابت الٰہی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اُن کے قلم کی روشنائی میں عبدیت وعبودیت کا رنگ ہم آمیز ہے۔ وہ اپنے نوک قلم سے صفحہ قرطاس پر جو نقوش کھینچتے ہیں وہ زندہ و پائندہ بن جاتی ہیں۔ ان میں فکر ودانش کی روشنی وتابانی اور جذبات کی گرمی ودل سوزی پڑھنے والوں کے ذہن کو منور کرتی چلی جاتی ہے۔ یوں تو صلاح الدین پرویز کی درجنوں تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن کی پذیرائی ملک اور بیرون ملک کے اہل فن نے خوب کیا ہے۔ ان ادبی وشعری نگارشات پر مقالے لکھے گئے۔ ہر جہت سے تجزیہ کیا گیا۔ ادبی قدر و قیمت کا تعین کیا گیا۔ مجھے اس مقالے میں صلاح الدین پرویز کی ایک تصنیف ''کتاب عشق'' کا ادبی وفکری تجزیہ مقصود ہے۔ صلاح الدین پرویز کی تقدیسی نظموں پر مبنی اس شعری تصنیف کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کا فکری وعملی منبع وسرچشمہ خدا کی عبودیت، علوم نبوت، حکمت رسالت اور بزرگانِ دین کے فیوض و برکات ہیں۔ صلاح الدین پرویز نے طرب وانبساط کی فضا میں اپنے متین اور مقدس خیالات کو منضبط اُتار چڑھاؤ کے ساتھ ہم آہنگ کر کے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا ہے۔ پوری کتاب فنکار کے ذہن کی رسائی، فکر کی بلندی، سیرت کی پاکیزگی، جذبہ عبودیت کے علاوہ حکیمانہ تفکر اور شاعرانہ تخیل کی عمدہ مثال ہے۔ کتاب کو دو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب شاعر کے مختصر پیش لفظ کے بعد خدا کے نام چالیس مکتوب پر مشتمل ہے جس کا عنوان ''عشق مکتوب'' ہے۔

یوں تو مکتوب نگاری کی تاریخ بہت ہی قدیم ہے۔ عیسائی مذہب میں مقدس حواریوں کے خطوط کو انجیل کا ضروری جز خیال کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں سلیمان علیہ السلام اور سبا کی ملکہ بلقیس کے مابین خطوط کا ذکر ہے۔ لیکن خطوط کی نگہداشت اور تحفظ کا سلسلہ اسلامی عہد سے شروع ہوا۔ مسلمانوں نے خود رسول اکرم ﷺ کے خطوط کو محفوظ رکھا اور بعد میں انہیں کتابی شکل دی گئی لیکن بقول سید سلیمان ندوی:

'علماء اور صوفیوں میں امام غزالی المتوفی ۵۰۵ھ کے مکتوبات سے پہلے کی کوئی چیز ہمارے سامنے نہیں۔ صوفیانہ مکتوبات کے سلسلہ میں بھی ہندوستان کا نمبر سب ملکوں سے آگے ہے۔ دنیا میں جب تک تصوف کی دھاریں بہتی رہیں گی مکتوبات شیخ شرف الدین منیریؒ اور مکتوبات مجدد الف ثانی کے کوثر وسلسبیل روحانی پیاسوں کی پیاس کو بجھاتے رہیں گے۔''

(مہدی کے خطوط از حضرت سید سلیمان ندوی)

اُردو میں مکتوب نگاری کی ابتداء منظوم خطوط سے ہوئی جن کا سہرا دو آصف جاہی منصب داروں مرزا یار علی بیگ اور میر ابراہیم جیو کو جاتا ہے۔ یہ خطوط نواب ناصر جنگ شہید کے عہد (۱۱۶۴ھ) میں لکھے گئے اور ابھی بھی ادبیات اُردو حیدرآباد کی ایک بیاض میں محفوظ ہیں۔ ان خطوط کو ہی اُردو مکتوب نگاری کی تاریخ میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ اب تو اردو میں مکتوباتی ادب کا سرمایہ بہت ہی وقیع ہوگیا ہے۔ یہ خطوط اپنے دوستوں، عزیزوں، قرابت داروں، ہمعصروں، حکمرانوں، وغیرہ کو لکھے گئے ہیں۔ ان مکاتیب کے مطالعے سے ایک طرف مکتوبات نگار کی نجی اور شخصی زندگی، خیالات ونفسیات کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف اس عہد کے سیاسی، معاشرتی، اقتصادی حالات کے علاوہ مختلف تحریکوں اور ادبی سرگرمیوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن میری معلومات کی حد تک صلاح الدین پرویز نے خدا کے نام چالیس مکتوب لکھ کر ایک نئی روایت کی داغ بیل ڈالی ہے۔ اس مکاتیب میں عشق کے ایسے بلند حقائق ومعارف بیان کئے گئے ہیں جن کی بدولت قاری کو رب کی قربت اور کائنات کا سراغ ملتا ہے۔ صلاح الدین پرویز کا ادبی مطمح نظر حیاتِ انسانی کا بناؤ وسنوار اور اس کی تعمیر وتطہیر ہے۔ اُس کا قلم، اس کی تخلیقی صلاحیت، اُس کا ذہن وفکر سب اللہ کی دین اور امانت ہے۔ اِن مکاتیب میں وہ ایک عظیم مقصد کا داعی، ساری انسانیت کا ترجمان نظر آتے ہیں اور اپنی فکر عالی کی ضوفشانی سے اپنے خیالات کو تابناک اور درخشاں بنا کر پیش کرنے کا گُر جانتے ہیں۔ احساساتی محرکات سے جذبات خود بخود ابھرتے چلے جاتے ہیں۔ چونکہ اِن خطوط کا مکتوب الیہ خدا کی ذات ہے۔ لہٰذا اللہ کی حمد وثنا اور عبودیت کا اظہار ہے۔ اِس رحمانیت اور رحیمیت کی صفات کے پیش نظر شاعر اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے بخشش اور معافی کا خواستگار ہے۔ اندازِ بیان ایسا ہے کہ ''حسن طلب'' کی صفت پیدا ہوگئی ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار:

کل بھی تھا میں گنہگار اور آج بھی
اور کل بھی رہوں گا
قدر کرتا ہوں اس رات کی
جس میں، میں اور تو، دونوں موجود تھے
نعمتی ہوں تیرا مستحق ہوں بہت

صلاح الدین پرویز شاعری کو ہم 'کیفیاتی شاعری' سے موسوم کر سکتے ہیں جس کے توسط سے فکر ودانش کی کرنیں پھوٹتی ہیں اور ذہنوں کو منور کرتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ باطنی تخلیقی تجربات پر محیط صلاح الدین پرویز کے اِن مکاتیب میں گردوپیش کی زندگی، قدروں کی پائمالی، سیاسی وسماجی بدحالی، ادب وشعر کی بے حرمتی، تہذیبی روایات و اقدار کا انہدام، ماحول کا جبر اور عہد کا کرب وغیرہ شعروں میں ڈھل کر تطہیر قلب کا باعث بن جاتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں شاعروں اور ادیبوں کی آپسی چپقلش، گروہ بندی، منافقت، بغض وکینہ وحسد کے علاوہ

فن کی بے حرمتی کو نہایت ہی بیباکانہ اور ایماندارانہ طور پر ہدف ملامت بنایا گیا ہے۔ یہ اشعار صلاح الدین کے فکری جلال اور شعری جمال کی آمیزش کے آئینہ دار ہیں:

تیری دنیا کے نااہل کمزور نظموں کے شاعر
بہت بغض کینہ حسد
اپنے سینے میں رکھتے ہیں
کیا جانتے نہیں!
میرا ساز سخن تجھ سے روشن ہے
کچھ نہیں... کچھ نہیں
میں تو کچھ بھی نہیں

کیا سناؤں کتھا!
عقل حیرت سے جلتی ہے
نااہل سارے
ادب شعر کے بیوپاری بنے
ریوڑی اپنے اپنے پیادوں میں تقسیم کرتے ہیں
یہ فن سے بولہبیاں کرنے والے نہیں سوچتے
کل جو آئے گا ان کے لیے
کچھ ندامت کے سر لائے گا

ان اشعار میں دانشورانہ تفکر بھی ہے اور ہمدردانہ تڑپ بھی۔ یہ اشعار اِس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ شاعر اعلیٰ ادبی اقدار اور صالح روایات کا امین ہے۔ لہٰذا ادب کی بے حرمتی کو کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ یہ اُس کی اولوالعزمی اور اعلیٰ حوصلگی کا بین ثبوت ہے کہ اپنے قلم سے تیشہ کا کام لے رہا ہے اور وہ بھی توازن اور اعتدال کے ساتھ نہایت ہنر مندی سے۔

شعر کی دنیا میں خیالات کی ترسیل اور ابلاغ کے لیے فنکار مختلف پیرائے سے کام لیتا ہے۔ اگر جیمس فریزر کی تصنیف "Golden Bough" پیش نظر ہو تو ہمیں اِس حقیقت کا اعتراف کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ادب وشاعری میں اساطیر کا استعمال، تلمیحی اشارے فنکار کے مافی الضمیر کو ادا کرنے میں کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔ یہ ایسا صنعت

ہے جن کے ذریعے سے بڑی سے بڑی بات نہایت مختصر لفظوں میں ادا ہو جاتی ہے۔ صلاح الدین پرویز نے اپنی تصنیف ''کتابِ عشق'' میں تلمیحات استعمال کئے ہیں وہ مختلف تہذیبی، تمدنی اور تاریخی عناصر پر مشتمل ہیں اور اسلامی، ہندی، عجمی اساطیر و روایت پر مبنی ہوں۔ اِس سلسلے میں چند مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں:

(۱) میرا دل
چاہِ بابل ہو
اس چاہِ بابل میں کوئی تو ہو
جس سے میرا تعلق ہو
میرے تعلق کو
تو اپنی چادر اوڑھا

(صفحہ:۳۰)

(۲) اے خدا
تیرا کنعان ہی میرا دل ہے
میرے کنعان میں
سیف سے ماورا
عشق کی سلطنت مجھ کو دے

(صفحہ:۳۶)

(۳) مملکت حسن کی اُس کی اعلی
ہوئے ہیں سبھی مرد مثل زلیخا
کہ ملتے ہیں اُن کے پراسرار قصے
بیاباں میں 'کوہِ ندا' میں حرا میں
وہ کم سن ہے نازک ہے نا کتخدا ہے

(صفحہ:۴۴)

(۴) میں نے محبوب کے عشق میں جو لکھا ہے
اُسے تیری رقاصہ زہرہ بھی پڑھ لے
کہ وہ وجد میں تجھ کو لے آئے فوراً

شاعرانہ آرٹ کا کمال یہ بھی ہے کہ تخلیق کار اپنے مافی الضمیر کو صاف لفظوں میں بیان نہ کر کے تشبیہات، استعارات، تلمیحات، اساطیر، رمز و کنایہ کے پیرائے میں پیش کرے۔ اِس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا غور و فکر پر مجبور ہو کر مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ جب اُسے ذہنی جدوجہد کے بعد مفہوم سمجھ میں آ جائے گا تو اُسے ذہنی لطف و مسرت حاصل ہوگا۔ علامہ اقبال نے کہا:

برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی است

حدیث خلوتیان جذبہ رمز و ایمانیست

صلاح الدین پرویز نے اپنے مکاتیب میں تلمیحات و استعارات کا خلاقانہ استعمال کیا ہے۔ اِن میں معنی و مفاہیم کی ایک دنیا آباد ہے۔ بعض الفاظ اور اشارے اتنے نادر اور جدید ہیں کہ پڑھنے والا کلیجہ پکڑ کر رہ جاتا ہے۔ اِس سے صلاح الدین پرویز کی تاریخی بصیرت اور متنوع مشاہدہ اور تجربہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ واقعات کے بیان کے لیے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اُن میں توانائی اور ہمہ گیری ہے اور پڑھنے والے پر ایک سرور و انبساط کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ الفاظ کی طہارت و ندرت، جذبے کی پاکیزگی اور صداقت، فکری و فنی بالیدگی، لہجے کی شیرینی، فطرت نگاری کا وصف، اللہ کی رحمانیت و رحیمیت پر شاعر کا مکمل ایقان، عصری تقاضوں اور قلبی واردات کا حسین امتزاج ''کتاب عشق'' کے پہلے حصے ''عشق مکتوب'' کی شناخت بن چکی ہے۔ صلاح الدین پرویز نے شاعری کی صنف میں مکاتیب کے توسط سے گوہر آبدار کو پیش کر کے اُردو ادب و شاعری میں منفرد اور ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔ طوالت کے خوف سے ہر جہت کا تجزیہ ممکن نہیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ دراصل مقاماتِ تحیرات کا سفرنامہ ہے جو شاعر کے کیفیت جذب کا پتہ دیتا ہے۔ عارفانہ رنگ نگاہ و دل کو محصور کر لیتا ہے۔ کتاب کے آغاز میں برصغیر کے نامور ادیب اور ممتاز نقاد جیلانی کامران کا مقدمہ بہ عنوان ''عکس نامہ'' ''کتاب عشق'' کا گائیڈ پیپر ہے۔ جیلانی کامران نے اِس کتاب کا ہر جہت سے تجزیہ کرتے ہوئے اِس کا مغز اس طرح ابھارا ہے:

> ''صلاح الدین پرویز نے حصار بند دنیا کو جو سیکولر جدید دنیا کے اسم سے موسوم، چاہِ بابل سے نسبت دی ہے اور اِسے جہانِ فسوں گری کہا ہے جس میں انسان ہاروت و ماروت کا عکس بن کر اپنی قید کے دن گذار رہا ہے۔ اِس زندگی کو قفس کا استعارہ بھی بیان کرتا ہے۔ اِس نظم کی زبان میں قفس خارج میں بھی ہے اور جسم و بدن کے وجود کی شکل میں بھی انسان کو حراست میں لیے ہوئے ہے۔ اِس قفس کی رہائی صرف عشق کے ذریعہ ممکن ہے۔''
>
> (کتاب عشق صفحہ:٦٣)

جیلانی کامران کے اِس اقتباس سے میرے نظریے کی تائید ہوتی ہے کہ ''کتاب عشق'' شاعر کے باطن اور اس کی

روح کا ترجمان ہے۔ شعر و شاعری کے پردے میں صلاح الدین پرویز نے انسان اور خالق کائنات کے اس رشتہ ازلی پر روشنی ڈالی ہے جو رہروان محبت کی اخری منزل ہوتی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے ''ہم تو بندے کے شہہ رگ سے بھی قریب ہیں اور پھر یہ کہ ہم نے بندے میں اپنی روح پھونک دی ہے۔ صلاح الدین پرویز سیماب پا، متحرک اور متلاشی روح کی طرح نئی منزلوں کی طرف چل نکلتے ہیں تا کہ اپنے فن میں ڈوب کر زندگی کا سراغ پالیں۔ بلاد ہند سے فارس تک ننگے پاؤں چلتا ہوا ششدر و مبہوت تحیرات کے اِس سفر میں صلاح الدین نے لفظوں کو نئے نئے معنی بخشے ہیں جس کی تفہیم و تعبیر قاری کو اعلیٰ و ارفع حقائق کا پتہ دیتی ہے۔ اُس کا عشق پرشور ہے۔ اُس میں جوش و سرمستی غالب ہے اور قرب الٰہی عشق محمدی، تہذیب نفس اور تزکیہ و تالیف قلب کا ذریعہ بھی۔ یہ کارنامہ رشد و ہدایت کا وسیلہ بھی ہے۔ نئی اقلیم عشق اور ایک نیا عالم جستجو کو طے کرنے والا شاعر پر شروع سے آخر تک سپردگی کی کیفیت ہے۔ عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کے سفر میں تحیرات کی کئی منازل اور مناظر آتے ہیں۔ تخاطب اور خود کلامی کا انداز ایسا کہ کشفی، القائی اور رویائی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ ایک درویشانہ بے نیازی ہے۔ دیکھئے یہ اشعار:

عشق!

یہ میں کس کہستان سے گزر رہا ہوں

کبکان اور بازان ایک ساتھ

اڑ رہے ہیں

یہ سب کہاں جا رہے ہیں!

انہیں میں صرف سن رہا ہوں

فردوس بریں میں لیکن

چشمہ کوثر کے کنارے

سلیمان

ان کے مفہوم سے آشنا ہو رہے ہیں

یہ اشعار ایک خاص کیفیت کے آئینہ دار ہیں اور شاعر کے مقدس سوچ سے مملو۔ صلاح الدین پرویز نے ''کتاب عشق'' میں اپنے ذہنی اور قلبی تقاضے کے پیش نظر حضور اکرمؐ کے فضائل، محامد اور کمالات و صفات کو جس عقیدت اور فنکارانہ جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ اُن کے جذبے کی صداقت کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے حضور اکرم کی سیرت مبارکہ اُن کے سراپائے مبارک۔ اُن کے معجزے، عادات و اطوار کو نہایت عقیدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کتاب کا باب ''بباراشک''، ''انا من اہوی''، ''از بس کہ...'' وغیرہ کے اشعار مخصوص والہانہ کیفیت کے حامل

ہیں۔ یہاں میں صرف چند شعر پر اکتفاء کرتا ہوں:

خمخانۂ قرب کے ساقی!
آپ کا حکم اللہ کا حکم ہے
عرش کی کرسی آپ کی لپیٹ میں ہے
ے انوار کو موجود کرنے والے!
میری مدد فرمائیے
میری خوشی بھی موجود کیجئے
میری معافی قبول کیجئے
مجھے یقین ہے کہ آپ کا کرم
موسلا دھار بارش کی طرح
مجھ پر برسنے ہی والا ہے

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صلاح الدین پرویز نے تلے الفاظ حسن خطاب اور حسن بیان کے ساتھ تمام تفصیلات اور باریکیوں کو صحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ تمام اشعار دل کی گہرائیوں سے نکلے ہیں اور موتی کی لڑیوں کی طرح صفحۂ قرطاس پر چمک رہے ہیں۔ عالم تحیرات کے اِس سفر میں حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت امام حسینؓ، حضرت امام حسن اور دوسرے بزرگوں کی شان میں جو منقبت پیش کئے گئے ہیں ان میں بڑی بلند آہنگی اور نشاط انگیزی ہے۔ ہر لفظ شاعر کی بے پناہ عقیدت کا مظہر ہے۔ خصوصاً ''لحن ہندی و رقص داؤدی'' کے عنوان کے تحت خواجہ معین الدین چشتی کے منقبت میں عقیدت اور موسیقیت ہم آغوش نظر آتی ہیں۔ کلام میں سلاست و روانی کا وصف دلکشی پیدا کرتا ہے اور یہ وصف اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب شاعر زبان اور انتخاب الفاظ دونوں پر قادر ہو۔ ہر شعر سے قصیدے کی شان، الفاظ کا شکوہ اور بیان کا زور اجاگر ہے۔ تخلیقی تجربے کے اظہار کے لیے صلاح الدین پرویز نے نہ صرف نیا ذخیرہ الفاظ پیش کیا ہے بلکہ اظہار بیان کے نئے سانچے بھی پیش کئے ہیں مثلاً دہل گلیم کے اندر نہیں بجائے جاتے۔ علم صحرا کے وسط میں ہی گاڑے جاتے ہیں، بوسوں کی نرم رفو گیری، پانچ نمازوں کے آبھوشن، دارالشفاء کی نہر خلوت، بختیاری روٹی، میرا کی سی ہوئی جھولی، غیب کا پرکھن ہار وغیرہ ایسے استعارے اور تلازمے ہیں کہ پڑھنے پر ذہن میں ایک ترنگ کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ تمام تلمیحات، استعارے، اسلامی، ہندی، عجمی اساطیر و روایات پر مبنی ہیں جن سے صلاح الدین باطن کا شعور حاصل کرتے ہیں۔

حضور اکرمؐ کی یثرب میں آمد پر بنونجار کی بیٹیوں کے ذریعہ گانے والے استقبالیہ گیت کے سلسلے میں جو منظر نگاری کی گئی ہے اس میں Cinematography کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ ''کتاب عشق'' کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگئی ہے کہ تصوف اور تقدس پر مبنی اس شعری تصنیف میں مقامی رنگ و آہنگ، ہندی لفظیات، مقامی بولیاں، ہندوستانی روایات، رقص، موسیقی کے اصطلاحات کے استعمال نے شروع سے آخر تک وحدت تاثر کو قائم رکھا ہے۔ یہی نہیں کہ یہ تصنیف اسلامی اور ایرانی اصحاب و بزرگوں کا پرتو ہے بلکہ ہندوستانی شخصیات اور اُن کی روحانی خدمات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس جہت سے دیکھیں تو اس سے صلاح الدین پرویز کی وسیع المشربی، مذہبی رواداری احترامِ آدمیت اور بزرگوں کے تئیں عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے۔

جہاں تک اِس کتاب کی ہیئت (Diction) کا سوال ہے اِس ضمن میں اتنی بات کہوں گا کہ یہ القاء اور کشف پر مبنی نظم ہے جو سکر کی حالت میں تخلیق کی گئی ہے۔ ساتھ ہی شاعر پر جذب کی کیفیت ہے۔ لہٰذا اِس میں تسلسل اور ربط کی تلاش بے سود ہے۔ عالم تحیرات کے سفر میں اچانک ہی ایسے مقامات آتے ہیں جس کا ذکر شاعر کے لیے لازمی ہوجاتا ہے۔ پھر یہ کہ ایک طویل نظم کا خالق اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے اپنا ماڈل خود تیار کرتا ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال کی مثال بالکل سامنے ہے۔ مختلف غزلوں میں انہوں نے مقطع کا شعر پیش نہ کر کے قافیہ و ردیف بدل دیا اور انگریزی شاعروں میں YEATs کی شاعری میں بھی باتیں ہیں۔ کولرج کی نظم ''قبلا خاں'' میں بھی تسلسل اور ربط کا فقدان ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ طویل نظموں میں تسلسل، ربط یا ڈکشن کا سوال بیجا ہے۔ خصوصاً القائی، الہامی، رویائی شاعری میں۔ یہ ایک ایسی تقدیسی نظم ہے جس نے صلاح الدین پرویز کے اندر لذت پرواز پیدا کردی ہے۔ میرے خیال سے صلاح الدین پرویز کی تصنیف ''کتاب عشق'' اکیسویں صدی میں رویائی شاعری پر مشتمل ایک اہم اور گراں قدر تصنیف ہے۔

☆☆☆

نذر خلیق (خانپور)

''خوناب'' پر ایک نظر

میں نے طے کیا ہوا تھا کہ جب تک پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل نہیں ہو جاتا اُس وقت تک کسی دوسری اہم تحقیقی و تنقیدی سرگرمی سے باز رہنا ہے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا پی ایچ ڈی کا مقالہ محنت طلب اور انتہائی جانفشانی کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ ایک نازک اور اہم موضوع پر ہے۔ادبی دنیا کے سنجیدہ علمی حلقوں کی نظریں اس پر لگی ہوئی ہیں ۔میری تحقیق کا موضوع ہے ''اردو ادب میں سرقہ اور جعل سازی کی روایت''۔اس موضوع کے حوالے سے حزم واحتیاط کی بہت ضرورت ہے۔ان معروضات کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ میں آج کل انتہائی مصروف ہوں لیکن سات محرّم الحرام کو جناب سلطان جمیل نسیم صاحب کی طرف سے صبا اکبرآبادی کے مراثی کا مجموعہ ''خوناب'' مجھے موصول ہوا۔ساتھ ہی سلطان جمیل نسیم صاحب نے لکھا تھا کہ اسے ایک نظر پڑھ لیں کہ اس مجموعہ مراثی کو محرّم الحرام کے موقعہ پر شائع کیا گیا ہے۔سلطان جمیل نسیم صاحب انتہائی مخلص اور بے لوث شخصیت ہیں لگ بھگ گزشتہ پچاس سال سے لکھ رہے ہیں۔اردو افسانے میں اپنے معتبر حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ان کی ادبی حیثیت پر قلم اُٹھایا جا سکتا ہے۔کچھ محرم کے مہینے کا اثر تھا کچھ سلطان جمیل نسیم صاحب کے اخلاص کا اثر تھا کہ کتاب کے مطالعہ کے ساتھ ہی یہ چند سطور رقم کرنے کا موقعہ مل گیا ہے۔

'خوناب'' کا مطالعہ شروع کیا۔'خوناب کے مرتّب مشفق خواجہ ہیں۔یہ مجموعہ پہلی مرتبہ محرّم 1985ء میں شائع ہوا تھا اور اب محرّم 2004ء کو دوسری مرتبہ شائع کیا گیا ہے۔مشفق خواجہ دیباچے میں لکھتے ہیں۔

''جہاں تک قدرتِ کلام اور شاعرانہ محاسن کا تعلق ہے صبا صاحب کی مرثیہ نگاری دراصل قدیم فنِ مرثیہ نگاری ہی کی توسیع ہے۔اسی لیے تو جوش ملیح آبادی نے کہا تھا، {اُن (صبا صاحب) کے مرثیے سن کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا میر انیسؔ کی روح بول رہی ہے۔''(خوناب' مرتبّہ مشفق خواجہ۔ص ۹)

مشفق خواجہ صاحب کا یہ کہنا بجا ہے کہ صباؔ صاحب کی مرثیہ نگاری قدرتِ کلام اور شاعرانہ محاسن کے حوالے سے قدیم فنِ مرثیہ نگاری کی توسیع ہے لیکن میں جوش ملیح آبادی کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا کہ صبا صاحب کے مرثیے سن کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا میر انیسؔ کی روح بول رہی ہے۔میر انیس کی روح نے مرثیہ نگاری میں جو بولنا تھا بول لیا۔اور وہ بولا ہوا امَر ہے۔میر انیس کا موازنہ تو دبیر سے بھی ممکن نہیں ہے، صبا صاحب سے موازنہ کا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔بے شک یہ بھی حقیقت ہے کہ میر انیس کی نقالی آج کے کئی نئے مرثیہ نگاروں تک کی جا رہی ہے لیکن صبا اکبر آبادی کے مراثی میں نہ تو میر انیس کی گونج ہے اور نہ ہی ان کی رُوح بول رہی ہے۔ان کے مراثی میں سانحہ کربلا کی رُوح بول رہی ہے اور صبا صاحب کے اپنے انداز سے بول رہی ہے۔

مجھے مشفق خواجہ صاحب پر بھی ہلکی سی حیرت ہوئی کہ انہوں نے اپنی صائب رائے کے ساتھ جوش ملیح آبادی کی رائے کیوں منسلک کر دی حالاں کہ دونوں آراء متضاد تھیں۔میں یہاں مشفق خواجہ صاحب کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے صبا اکبرآبادی کے اشعار پیش کروں گا۔

ہم کون ہیں اور کیا ہیں؟ کہاں کے تھے؟ کہاں ہیں
سو نام ونشاں رکھ کے بھی بے نام ونشاں ہیں
ہم برگِ خزاں دیدہ ہیں یا ریگِ رواں ہیں
اک گم شدہ تہذیب کے اب مرثیہ خواں ہیں

اس بے خبری پر کوئی مضموم نہیں ہے
ہم کیا تھے' نئی نسل کو معلوم نہیں ہے

(ص۔26)

مرثیّے کے ان اشعار کو دیکھیں تو بلا شبہ جہاں فنی محاسن اور محسناتِ شعر کے حوالے سے قدیم کی توسیع صاف نظر آتی ہے۔وہاں مرثیہّ نگاری میں موضوعات کے تنوّع کی جھلک بھی نظر آئے گی۔شاعر نے ان اشعار میں منزل کی گم شدگی اور ذات کے عرفان میں نئی نسل کی بے خبری کو بھی اُجاگر کیا ہے۔مرثیّہ اب ایک خاص واقعہ سے متعلق رہتے ہوئے بھی نئی نسل کی بے حسی' بے خبری اور عظمتِ رفتہ کے احساس کی گمشدگی کے المیہ کے اظہار تک پھیل گیا ہے۔یہ انداز صرف صبا صاحب سے مخصوص ہے۔مجھے اپنے مطالعہ کی حد تک اس انداز کا آج کا کوئی اور مرثیہ نگار نظر نہیں آتا۔ڈاکٹر اسلم فرخی کہتے ہیں۔

''ہمارے عہد میں مرثیہ گوئی میں نئے رجحانات اور نئے امکانات کو روشن کرنے کے حوالے سے صبا صاحب کا کلام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔مرثیّے کی صنف کو فکر سے ہم آہنگ کرنے میں صبا اکبرآبادی کا نام بہت نمایاں ہے۔''(ص۔24)

صبا اکبرآبادی نے مرثیے کو صرف جذبات واحساسات کے اظہار کا ذریعہ ہی نہیں بنایا بلکہ فکری اور عقلی توانائی بھی اس میں بھر دی ہے۔ان کے مرثیے کے الفاظ' تراکیب اور مصارع واشعار، فکر کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔حالاں کہ غزل اور مرثیہ دونوں ان داخلی کیفیات کے اظہار کا ذریعہ ہیں جن کا تعلق دل سے ہے۔صباء اکبرآبادی کے ان اشعار کو دیکھیں اور فیصلہ کریں کہ کیا میں نے جو کچھ کہا ہے درست نہیں ہے۔

اب جو ہیں منبر نشیں اپنی جگہ سب بے نظیر
نو نہالانِ چمن سے ہیں تمنائیں کثیر
اپنے دامِ فکر میں ہم خود ہی رہتے ہیں اسیر
اب نہ وہ محنت نہ وہ مشقِ سخن کا دور ہے
اور تھا اپنا زمانہ، یہ زمانہ اور ہے

ان اشعار میں شاعر نے جن تلخ حقائق کو بیان کیا ہے درحقیقت یہ بھی مرثیے کا نیا اور منفرد انداز ہے کہ حسینؓ ابن علیؓ نے جس مقصد کے لیے اپنی اور اپنے رفقاء کی قربانی پیش کی تھی وہ پورا پورا حاصل نہیں ہوا۔آج وہ لوگ گوشہ نشین اور آنکھوں سے اوجھل ہوگئے ہیں جن سے حسینؓ ابنِ علی کے مشن کو آگے بڑھانا تھا۔اُن کی جگہ وہ لوگ ہیں جو''دامِ فکر''میں اسیر ہوکر رہ گئے ہیں'سستی' کاہلی اور محنت سے فرار جن کا شعار بن گیا ہے۔ایسے اشعار فکری ذخیروں سے برآمد ہوسکتے ہیں۔درحقیقت صباء اکبرآبادی نے شہادتِ حسینؓ کو جذبات کے ساتھ ساتھ فکر کو دعوت دینے کا ذریعہ کہا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا صباء اکبرآبادی کے مرثیے میں مقام کے بارے میں یوں کہتے ہیں۔

''صبا اکبرآبادی کو اردو شاعری میں جو مقام حاصل ہے ہم سب اُس کے معترف ہیں لیکن کم لوگوں کو اس بات کا علم تھا کہ انہیں مرثیے کے انتہائی مشکل فن پر بھی عبور حاصل ہے۔۔۔۔۔۔۔انہوں نے واقعہ کربلا کی ایک بالکل نئی تفسیر پیش کر دی ہے۔ان کے مرثیوں سے مراثی امام حسینؓ کے باب میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوتا ہے۔''
(خونناب'ص۔53)

صبا اکبرآبادی کے مجموعہ مراثی میں سہل ممتنع کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔سہل ممتنع کی خوبی اُن شعراء کے ہاں ملتی ہے جو فن کی بلندیوں پر ہوں اور صبا اکبرآبادی فن کی جس سطح پر تھے ان کے قارئین اس سے خوب واقف ہیں۔ان اشعار کو دیکھیں کہ سہل ممتنع کو صباء اکبرآبادی نے کس طرح برتا ہے۔

دوشِ ہوا پہ ہوتی ہے جس وقت یہ سوار
ہر گوشہ حیات کو کرتی ہے یہ شکار
دامن میں ڈھانپ لیتی ہے ہر قریہ و دیار
اُڑتا ہے دل سے تابہ بصارت بڑا غبار
جب تک ہے خواب میں کوئی قدموں سے کوٹ لے
بپھرے تو یہ فضا کی لطافت کو لوٹ لے
(ص۔99)

یوں تو صبا اکبرآبادی کے مرثیوں کے مجموعے''خونناب''میں فنی محاسن کی کثرت ہے اور جن کا جائزہ لینا ایک بھرپور موضوع کا تقاضا کرتا ہے۔تاہم کہہ سکتے ہیں کہ صباء اکبرآبادی کے بعد نئی نسل میں کوئی ایسا مرثیہ نگار دکھائی نہیں دیتا جس کے مرثیوں میں فن کا اتنا خیال رکھا گیا ہو'اور جذبات کے ساتھ ساتھ فکری سامان بھی مہیا کیا گیا ہو۔صبا اکبرآبادی خوش نصیب ہیں کہ قدرت نے انہیں سلطان جمیل نسیم جیسے بیٹے کا باپ بنایا ہے کہ جنہوں نے ان کی وراثتِ علمی کو نہ صرف سنبھال کر رکھا ہوا ہے بلکہ اس میں اضافے کا باعث بھی ہورہے ہیں۔خود بھی ادب تخلیق کررہے ہیں اور اپنے نامور والد کی ادبی خدمات سے اہلِ ادب کو متعارف بھی کرا رہے ہیں۔

سید احمد شمیم (جمشید پور)

صدائے کُن فیکون۔۔۔اور اسلم بدر

"وہ ایک کھلے آسمان کی رات تھی / میں لیٹا ہوا / بیکراں پھیلی ہوئی نیلگوں وسعتوں کو دیکھ رہا تھا / سر پر انگنت ستاروں کے جگنو چمک رہے تھے / با لکل میری آنکھوں کے اوپر پورا چاند مسکرا رہا تھا / میں نے پہلی بار محسوس کیا / میں اس خوبصورت کائنات کا ایک حصہ ہوں / یہ کائنات میری ھے / شائد یھی وہ لمحہ تھا / جو ایک شعر کی صورت میرے اندر اتر گیا / شعر جو بے صوت و صدا تھا......"

مندرجہ بالا سطریں اسلم بدؔر کے پہلے شعری مجموعہ ''سفراور سائے'' سے لی گئی ہیں، کہنے کی ضرورت نہیں کہ عہدِ آغاز ہی سے اسلم بدر کا یہ مسئلہ رہا ہے کہ میں کون ہوں؟ کس لئے ہوں؟ یہ کائنات کیا ہے؟ اسکی تخلیق کیوں ہوئی اور کس کے لئے ہوئی؟ اور اس کائنات کا جمال رنگ در رنگ، جلوہ در جلوہ کس طرح اپنے محیط میں ہمیں لئے ہوئے ہے۔ یہی وہ بامعنٰی لیکن خوبصورت احساس ہے جس نے اسلم بدر کے اندر سوئے ہوئے شعری جذبات کو پہلی بار متحرک کیا اور جس طرح وقت کے ساتھ ساتھ ان کا اپنا جسمانی اور ذہنی وجود بالیدہ ہوتا گیا، فکر کے سمندر کی موجوں کی یورشیں بڑھتی گئیں۔ جس کا خوبصورت شعری اظہار بالآخر ''کن فیکون'' کے سانچے میں ڈھل گیا، اور جو اس وقت میرے پیشِ نظر ہے۔

مجھے یاد آتا ہے کہ غالباً ستّر (۷۰) کے آس پاس کسی طویل ملاقات کی شام میں، میں نے اُن سے کہا تھا۔۔۔تم میں شعر کہنے کی بے پناہ صلاحیت ہے اور تم بہت زود گو بھی ہو، تمہیں مثنوی لکھنی چاہئے، جس میں بے پناہ امکانات ہیں اور جواب ایک بھولی ہوئی صنف ہوتی چلی جا رہی ہے۔ میں نے اپنی اس خواہش کا اعادہ 'سفر اور سائے' کا پیش لفظ لکھتے ہوئے بھی کیا تھا۔۔۔بات آئی گئی ہوگئی۔

ایک دن عزیزیہ نزہت سلمہا نے مجھے بتایا کہ وہ (اسلم بدؔر) آجکل کچھ لکھنے پڑھنے

میں زیادہ ہی مصروف رہنے لگے ہیں۔ شائد کوئی طویل نظم ہو رہی ہے، دفتر سے گھر آکر بس اپنے کمرے میں بند ہو جاتے ہیں، اس وقت میرا داخلہ بھی ممنوع ہوتا ہے۔

ملاقات ہوئی تو اسلم بدر سے میں نے پوچھا۔۔۔۔۔''بھائی بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی، سنا ہے کچھ لکھنے میں مشغول ہو۔؟'' ہنسے اور کہا۔۔۔'' آپ ہی کا دیا ہوا ٹاسک پورا کر رہا ہوں''۔ پوچھا، ''مطلب؟''۔ کہنے لگے، ''کئی برسوں سے ایک مثنوی لکھنے میں مصروف ہوں، اب تقریباً مکمل ہو چکی ہے، تین ہزار اشعار سے زیادہ لکھے جا چکے ہیں''۔ میں نے عرض کیا۔۔! ''خدا کی پناہ، اتنا بڑا کام اور مجھے خبر تک نہیں؟''۔ کہنے لگے۔۔! '' آپ کو سرپرائیز دینا چاہتا تھا۔ بخدا اس کی خبر میں نے نزہتؔ کو بھی نہیں دی ہے۔''

اب اس مثنوی کا مکمل مسودہ میرے پیشِ نظر ہے، جسکی پیشانی پر لکھا ہوا ہے ''کن فیکون''۔ اسلم بدر نے ایک طویل عرصے تک اس پر کام کیا ہے اور بار بار نظر ثانی اور حذف و اضافہ کے عمل سے گذرنے کے بعد اس میں تقریباً دو ہزار اشعار رہ گئے ہیں۔ اس فنکارانہ تراشیدگی نے بلا شبہہ مثنوی کا پیکر سڈول اور متناسب بنا دیا ہے۔ اظہار کی جمالیت اور شعری حسّیت قدم قدم پر قاری کا دامن تھام لیتی ہے۔

ہمارے یہاں طویل نظمیں عموماً ایک ہی بحر میں لکھی جاتی ہیں۔ مثنوی میں خاص طور پر اس کا خیال رکھا جاتا ہے، مگر اسلم بدر نے مختلف بحروں کو استعمال کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا سبب شاعر کا عجزِ بیان نہیں ہے، ایسا قصداً کیا گیا ہے، تاکہ دمِ قرآت Monotony کا احساس نہ ہو اور مطالعہ کا ذائقہ تازہ رہے۔ چنانچہ بحروں کی تبدیلی سے بیان میں تازگی اور اظہار میں ہم آہنگی پیدا ہوگئی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ تخلیقِ کائنات کے راز ہائے سربستہ کا بیان کرنے والی یہ پہلی مثنوی ہے۔ ''کن فیکون'' سے قبل بھی ہمارے شعراء نے اسرارِ حیات و کائنات کی عقدہ کشائی کی کوششیں کی ہیں۔ مثلاً پروفیسر عبدالمجید شمس عظیم آبادی نے اپنی طویل مثنوی ''حیات و کائنات'' میں تخلیقِ کائنات کے مرحلے اور مقصد کو بیان کیا ہے مگر اظہار کے تمام تر جلال و جمال کے باوجود طائرِ تخیّل کے پر کہیں کہیں جل اُٹھے ہیں اور علم و دانش کی شعلگی سے شاعری کا بدن مجروح ہوا ہے۔

میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں اسلم بدر کی ''کن فیکون'' اور شمس عظیم آبادی کی حیات و کائنات کا تقابل کرنا چاہتا ہوں، سچّائی یہ ہے کہ موضوع کی یکسانیت کے علاوہ ان میں مغائیرتیں کافی نمایاں

ہیں۔

اور یوں بھی مماثلتیں تو دھوکا ہوتی ہیں ۔ ہر چیز کی اپنی اصلیت ہوتی ہے۔خود ہماری اپنی نگاہ دھوکا کھا جاتی ہےتو ہم کہتے کہ فلاں چیز فلاں کی مماثل ہے، جبکہ ہر شئے کی سالمیت ہی میں اس کی اصلیت ہوتی ہے۔

اسلم بدر نے کن فیکون میں اسرارِحیات سے پردہ ہٹانے کی کوشش میں کن کن جہانوں کی سیر کی ہے، کیا کیا جوکھم اٹھایا ہےاور کیسے کیسے چیلنج کوقبول کیا ہےاس پر کچھ کہنا بھی ایک چیلنج کو قبول کرنا ہےاور میں اس کا اہل نہیں ہوں، اس لئے اپنی شکست طئے ہے۔مگر کیا کیجئے گا کہ کبھی کبھی ہار بھی فتح مندیوں سے زیادہ پیاری لگتی ہے،شرط یہ ہے کہ معروض بھی پیارا ہو۔مجموعی طور پر اسلم بدر نے کن فیکون کے راز کومثلثی دائروں کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

(الف)۔اساطیر اور مذہب۔ (ب) ۔فلسفه

(ج) ۔جدید و قدیم سائنسی تصورات و تلاش

اوران دائروں کے تحت جوعنوانات آئے ہیں وہ کچھ یوں ہیں۔

ہندومت ، وید، بھگوت گیتااور پُران ،منوسمرتی ،جین دھرم ، بودھ مت ،زرتشت ، عہد نامہ قدیم و جدید،قرآن کریم۔۔۔۔

سانکھیہ درشن،سقراط، ارسطو ، فیثا غورث ، فلاطینوس ، ابیقوریت ،رواقیت ، وجودیت ، یہودی فلسفہ،فلسفۂ تشکیک،تصورِزمان ومکان (قدیم وجدید)،فلسفہ ہائے مادّہ وارتقائے مادّہ۔۔۔۔

آفرینشِ عالم کا سائینسی تصور، وسعت وجسامات،توجیحاتِ قیامت، ناکارگی ، عالمِ ضدّین ، دوسری دنیا ہماری ضرورت ، عالمِ ضدّین ، وجودِباریٔ تعالٰی۔۔۔۔۔

واضح رہے کہ یہ ترتیب شاعر کی نہیں میری اپنی ہے جو میں نے اپنی سہولت کے لئے دی ہے۔

مندرجہ بالا سطروں کے حوالے سے یہ حقیقت آئینہ ہو جاتی ہے کہ کن فیکون کی قرآت میں صرف شاعرانہ ذوق کافی نہیں ہے، قاری کا اپنا ذہن بھی وسیع محیط پر سفر کرنے کا اگر حوصلہ نہیں رکھتا ہےتو یقیناً کن فیکون کا مطالعہ اس کے لئے بےلذّت اور تھکا دینے والا ہو جائے گا۔لیکن اسرارِحیات کو جاننے کی دیوانگی اگر ہےتو قدم قدم پر ایک جہانِ حیرت سے دوچار ہوگا اورانجانی لذّتوں سے شادکام بھی۔

مثنوی کی ابتدا حمد، مناجات اور نعت رسولؐ سے ہوئی ہےاور یہی اس کی روائت بھی رہی ہے۔ حمد و مناجات اور نعت کی پاکیزہ فضاؤں سے گذرنے کے بعد مختلف مسائل ، مباحث ، افکار اور نظریات کا ایک

رزمیہ ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ بادی النظر میں بعض تصورات اورافکار متخالف اور متضاد دکھائی دیتے ہیں لیکن باطنی طور پراس کثرت کے درمیان وحدت کے اس نُور کی یافت بھی اُن آنکھوں کے لئے مشکل نہیں ہے جو ظاہر سے گذر کر باطن میں اترنا جانتی ہیں اوراسلم بدر صرف ایک شاعر نہیں ہیں وہ اہلِ دل بھی ہیں۔اللہ تعالٰی نے اُنہیں حج وعمرہ سے مکرّر نوازا ہےاور اندر کی آنکھیں کھول دی ہیں۔

مثنوی کے کُھلتے ہی حمدِ باری تعالٰی پر نظر پڑتی ہے جسے پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ جلالِ خداوندی کے تصوّر سے اسلم بدر کی سانسیں بکھرنے لگی ہیں اور دم پھولنے لگا ہےاور کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

طویل اور اب داستاں کیا کریں   سمجھ لیجئے ہم بیاں کیا کریں
صدا بے صدا اور دھن لا دھن   ادا بے ادا اور بدن لا بدن
اب اسلؔم زیادہ صفائی نہ دے   خدا ھے وھی جو دکھائی نہ دے

حمدِ باری تعالٰی کے بعد باری تعالٰی کے حضور میں جو مناجات کی گئی ہے، ایسی ہے کہ لفظ لفظ سے نور کی کرنیں پھوٹتی ہیں اور اُن کی روشنی میں اپنی ذات کا آئینہ بھی چمک اُٹھا ہے، مَن عَرَفَه نَفسهُ فَقَد عَرَفه رَبّهُ۔

اللہ۔۔! یہ کائنات میری   انفاسِ حیات و ذات میری
رقّاص سیّاروں کی یہ محفل   سورج کی ستاروں کی یہ محفل
یہ نقش و نگارِ بزمِ ہستی   یہ نظمِ عالم یہ رزمِ ہستی
اعراض و جوہر کا یہ تناسب   انفاس و پیکر کا یہ تناسب
یہ چہرے جو بن سنور رہے ہیں   سب مجھ سے سوال کر رہے ہیں
ہر بزمِ شہود ہے سوالی   خود میرا وجود ہے سوالی
میں کیا ہوں ، سبب کہ استعارہ   منظر ہوں ، نظر ہوں یا نظارہ
کر میری نگاہ بھی تو روشن   کُھل جائیں دیوارِ دل میں روزن
روزن سے ترے اشارے دیکھوں   ہر ذرّے میں سو نظارے دیکھوں

اور جب دیوارِ دل میں روزن کُھل جاتے ہیں اور آنکھیں بےحجابانہ جلوے دیکھنے کی اہل ہو جاتی

ہیں تو دل خود بخود ثنائے خواجہ کے لئے جُھک جاتا ہے۔اور عشقِ رسولؐ کا نشہ دوآتشہ ہوجاتا ہے۔

صدائے کُن سے فکاں تک　　مکانِ لا سے مکاں تک
ظہورِ عام سبب تھا　　وہی ارادہؐ رب تھا
لرز رہے تھے دھندھلکے　　سیاہ شب میں ازل کے
عمیق تر تھی سیاہی　　سیاہی پر تھی سیاہی
ابھی حجاب تھا منظر　　مگر وہ نُور کا پیکر
نہاں تھا دُور فضا میں　　لباسِ صبر و رضا میں
پسِ وجودِ عدم تھا　　وہ قبلِ لوح و قلم تھا

اور حضورِ مدینتہ العلمﷺ میں ہدیۂ نعت پیش کرتے ہی تجسس کے خاموش سمندر میں طوفان آجاتا ہے۔تلاش اور آگہی اور پانے اور جاننے کی بےقرار موجیں شاعر کو مضطرب کردیتی ہیں۔

زمیں آسماں کیوں ازل سے نہیں　　چھُپی ہے کہاں علّتِ اوّلیں
ازل ماورائے زماں کیوں ہوا　　ابد آفرینش مکاں کیوں ہوا
نہیں ہے تو کیوں ہمسرِ کائنات　　کہاں ہے وہ صورت گرِ کائنات
کہاں سے کہاں تک ہے بزم وجود　　خلائی ہے کیوں منظرِ ہست و بود

تلاش وبصیرت کی یہی شعلگی ہے جو علم کے چراغ روشن کرتی ہے اور اندر اور باہر کائنات روشن ہو جاتی ہے۔

علم کُل سے ہے جزو کی پہچان　　علم ہی جزو سے ہے کُل کا گیان
وسعتوں کی مکانیت ہے علم　　واقعوں کی اضافیت ہے علم
علم سے مادّے ہوئے سارے　　جوہری واقعات کے دھارے
علم، اوقات کا پلٹ جانا　　علم، ابعاد کا سمٹ جانا

لیکن انسان علم اور ایقان کی اس منزل پر بہت بعد میں پہونچا، اس سے پہلے تو لاانتہا اندھیروں اور اجالوں میں بےسمتیت کا سفر پیش آیا ہے۔خوف، قیاسات، اجالا، اندھیرا، یقین، بےیقینی ،ایک انجانی حقیقت کو جاننے کی تڑپ اور تڑپ کی چبھن، نارسائی کا زخم اور رسائی کا مرہم یہ

سب مرحلے ہیں جس سے انسان گذرتا ہے۔۔۔۔۔۔۔

خوف آتا تھا جب نظاروں سے　　بات کرتا تھا چاند تاروں سے
محفلِ کائنات تھی درپیش　　رہ گذارِ حیات تھی درپیش
ایسے اندھے سفر میں بےچارہ　　مضمحل، جاں گسل، تھکا ہارہ

- - - - - - - - - - -

سوچ اُکتا گئی اُڑانوں سے　　آئی آواز آسمانوں سے
دین، حالات کا عطائی نہیں　　کبریائی ہے، ارتقائی نہیں

یہاں یہ ذکر غالباً بےجا نہیں ہوگا کہ ذہنی اڑان کے سبب دین کا آئینۂ وحدت بکھر کر جلوۂ کثرت کا نظارہ بھی دکھاتا رہا ہے، اور اس سفر کی کہانی کی پہلی صدا، صدائے اوم ہے۔

بیٔے خلق، پہلی صدا اوم ہے　　برہما کے لب کی نوا اوم ہے
وجود اوم ہے، لا وجود اوم ہے　　ازل اور ابد، ہست و بود اوم ہے

- - - - -

زمان و مکاں سے ہے آزاد اوم　　مگر ہر دشا میں ہے آباد اوم
برہم چکر تھرکن ہے، دھڑکن ہے اوم　　برہمانڈ کی ایک گونجن ہے اوم

اور یہ گونجن مسلسل جاری ہے۔۔۔ ”کہ آرہی دمادم صدائے کن فیکون“　(اقبال)

ہندو مائیتھولوجی میں تخلیقِ کائنات کو کئی پہلوؤں سے دیکھا گیا ہے۔مثلاً شری دیوی بھگوت پران میں خالقِ کائنات کو عورت کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔کیونکہ ہندوؤں کا اس بات پر یقین رہا ہے کہ جننی حقیقت میں عورت ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام شکتیوں کی تمثیل ہندوؤں کے یہاں عورتوں کے حوالے سے کی گئی ہے اور اپنی ناآسودہ خواہشوں اور آرزوؤں کا مخزن انہیں کو بتایا گیا ہے۔مثلاً گیان کے لئے سرسوتی، دولت کے لئے لکشمی، طاقت کے لئے دُرگا اور تباہی و موت کو کالی کا روپ دے دیا گیا ہے۔ شری دیوی بھگوت پُران میں تخلیقِ کائنات کے رازِ سربستہ کو شری دیوی کی تمثیل کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔یہ حکائت، حکمت اور لذّت سے خالی نہیں ہے۔وہ یوں ہے کہ شری دیوی کو جب اپنی تنہائی اور یکتائی نے بہت ستایا اور اندر کی

خواہشوں کا یلغار حد سے سوا ہوا تو کسی کی رفاقت کی ضرورت بے چین کرنے لگی۔ جبکہ اسلام میں حضرتِ آدم کو تنہائی نے جب ستایا تو انہیں کے وجود سے حوّا کی تخلیق ہوئی، مگر یہ دونوں ہی مخلوق ہیں، خالق نہیں۔ جبکہ شری دیوی بھگوت پران میں خالقِ کُل شری دیوی ہے۔ جو اپنی تنہائی اور شدید جنسی جذبوں سے مضطرب ہو کر اپنی ہتھیلی سے ہتھیلی رگڑنے لگتی ہے تو اسکے ہاتھ میں آبلے پڑ جاتے ہیں، واضح رہے کہ سائینسی حقیقت میں بھی Friction کی اہمیت مسلمہ ہے۔ پھر یوں ہوا کہ ہتھیلیوں کی یہ آبلے ٹوٹے تو پانی کا ایک سیلاب بہہ چلا، اور اسی پانی سے برہما نے جنم لیا۔

یہاں یہ نکتہ دھیان میں رہنا چاہئے کہ تخلیقِ کائنات اور آفرینشِ حیات کا تصوّر تمام دنیا کے اساطیر اور مذہب میں پانی کے وجود سے جڑا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ سائنسی حقیقت بھی یہی کہتی ہے کہ پانی کے بغیر حیات کا وجود ممکن ہی نہیں۔ تو پھر یوں ہوا کہ شری دیوی نے برہما سے اپنا سنجوگ چاہا، مگر برہما نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ تو، تو میری جننی ہے، میرا تیرا سنجوگ ممکن ہی نہیں ہے۔ تب شری دیوی کی آتشِ غضب میں برہما کا آکار جل اُٹھا۔ اور تب وشنو پیدا کئے گئے اور انکا بھی وہی انجام ہوا۔ وشنو کے بعد شنکر نے جنم لیا۔ شنکر نے، جو برہما اور وشنو سے زیادہ ہوشیار اور جذبۂ جنس سے سرشار تھے، شری دیوی کو اپنانے کی حامی بھری مگر اس شرط کے ساتھ کہ تم اپنا دوسرا روپ اختیار کرو اور یہ کہ برہما اور وشنو کو دوبارہ پیدا کرو اور انکے لئے دو عورتوں کو بھی خلق کرو۔ شری دیوی نے شنکر کی یہ بات مان لی اور پاربتی کا روپ اختیار کر لیا۔ اور اس طرح ان تین خاندانوں کے ذریعے حیات کا قافلہ چل پڑا۔ اسلم بدر نے اسے یوں پیش کیا ہے۔۔۔

شری دیوی کا ہے ازل سے وجود — یہی ذات ہے خالقِ ہست و بود

ہوئیں بوجھ جب اس پہ تنہائیاں — ہوئی فکر، ہوں بزم آرائیاں

تمنّاؤں نے جب کیا بے قرار — گھِسا ہاتھ، مسلا کفِ اختیار

ہتھیلی پہ اک آبلہ پڑ گیا — نشاں گویا تخلیق کا پڑ گیا

منوسمرتی کے برخلاف اور منوسمرتی سے بہت پہلے وید میں تصورِ کائنات پیش کیا گیا ہے اور تخلیقِ کائنات کا یہ تصور، اسلامی تصور سے بہت حد تک ملتا جُلتا ہے، اور یہ اس لئے کہ دینِ حق واحد ہے اور اسے موج در موج کثرت، ہماری آوارہ خیالی نے دیا ہے۔ مگر یہ آوارہ خیالی یوں مقدس ہے کہ اسی کے طفیل فکر و نظر کے ہزار ہا روزن وا ہوئے ہیں۔ چنانچہ اسلم بدر نے اسے بہت ہی خوبصورت

اور شاعرانہ پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ یہاں پہونچ کر تصوّف کے کئی نکات اپنی پنکھڑیاں کھولنے لگتے ہیں۔۔۔۔

نہ آزادیاں تھیں، نہ رسمِ قیود — نہ کوئی عدم تھا، نہ کوئی وجود

وجودِ فنا و بقا بھی نہ تھا — شب و روز کا سلسلہ بھی نہ تھا

نہ تھی بادِ صرصر نہ بادِ نسیم — مسافر تھا کوئی نہ کوئی مقیم

پناہِ ازل بے پناہی سی تھی — سیاہی میں غلطاں سیاہی سی تھی

تھا پیشِ نظر جو کھُلا آسماں — یہ بے سمت بھی تھا نہ جانے کہاں

وہ کیا شئے تھی کیا حلقۂ آب تھا — یا شائد بہت گہرا گرداب تھا

جہاں پانیوں کا تھا بے بحر و بر — وہ جو کچھ تھا لیکن کہاں تھا مگر

یہ سارے منظر بہ شکلِ عدم — انہیں پانیوں میں تھے شائد بہم

مگر ایک وہ بس وہی ایک بس — کہ تھا خود نفس، بے نفس، ہم نفس

وہ بے جسم و جاں، بے زماں بے مکاں — وہ پنہاں کہیں تھا مگر تھا کہاں

خود اپنی توانائیوں کا وجود — خود اپنی نمو سے ہوا خود نمود

گویا۔۔۔۔ لَم یَلِد وَلَم یُولَد۔ معلوم حقائق کی روشنی میں اسے مان لینے میں شائد کوئی قباحت نہیں ہے کہ تمام مذاہب میں ویدک دھرم کو سب پر تقدّم حاصل ہے۔ سمرتیاں بہت بعد کی ہیں اور بہت خوب ہیں مگر اس سے بھی انکار نہیں ہے کہ وید کے خالص تصوّرِ وحدانیت کو اس سے نقصان پہونچا ہے۔ چنانچہ منوسمرتی میں تخلیقِ کائنات کا جو تصوّر ہے اُسے اسلم بدر نے تمام شاعرانہ لوازمات کے ساتھ یوں پیش کیا ہے۔۔۔۔

جگت پہلے فطرت میں پوشیدہ تھا — تھا اک خواب اور وہ بھی نادیدہ تھا

تھا چاروں طرف تیرگی کا قیام — کوئی نقش تھا اور نہ کوئی مقام

یکا یک اندھیرے میں پھوٹی کرن — اُٹھی کسمساتی ہوئی انجمن

اُجالے کا وِستار ہونے لگا — برہما، اَوِشکار ہونے لگا

اجالے سے نکلا، اجالے لئے — کتابِ جہاں کے حوالے لئے

وید کے بعد ہندوستانی مذاہب میں گیتا کا تصوّرِ خدا وہ تصوّر ہے جس پر نگاہ تھم جاتی ہے۔ اور یہ مُسلم صوفیا میں بھی بہت مقبول رہا ہے۔ البتّہ گیتا کی موجودہ شکل ایسی ہے جس میں انسانی ذہن کی صنّاعی

کا عکس صاف جھلکتا ہے اور وہ ہے وجودِ حق کو کشن کی تمثیل میں دکھانے کا عمل ۔مگر فکر کے اس منطقے میں داخل ہونے کا حوصلہ مجھے نہیں ہے ۔میں یہاں اسلم بدر کے مندرجہ ذیل اشعار کی قرات پسند کرتا ہوں، یہ مانتے ہوئے کہ یہ صدائے حق کی ترجمانی کرتے ہیں۔۔۔۔

سنو میں ازل بھی ابد بھی ہوں میں　　یگوں تک جو پھیلی ہے، حد بھی ہوں میں

(ازل اُس کے پیچھے ابد سامنے ... نہ حد اسکے پیچھے نہ حد سامنے) ۔ اقبالؔ

سنو میں ہی شیرینئ آب ہوں　　سنو میں ہی انوارِ مہتاب ہوں
سنو میں ہوں لمحات کا کارواں　　سنو میرے اندر ہیں دونوں جہاں
سنو میں ہی دھرتی کی خوشبو بھی ہوں　　سنو میں ہی اگنی ہوں وائیو بھی ہوں
مجھی میں ہیں یہ آسمان و زمیں　　کہ میرے سوا اور کچھ بھی نہیں
سنو اوم کا میں ہوں وصفِ کمال　　سنو مجھ میں پوشیدہ ہے انت کال

ہمارے وجودی صوفیا کہتے ہیں۔۔۔ لا موجود الّا اللہ۔

مگر اسی ہندوستان میں فکر و نظر کا یہ سیلِ رواں ایک نیا موڑ لیتا ہے، اور یہ ہے برہمنی تصوّر پر غیر برہمنی طاقتوں کی یلغار کا۔ مہاویر اور جین دھرم کے بعد گوتم بُدھ آتے ہیں جو ہندوستان کی سیاست، ہندوستان کے فلسفہ اور اسکے فکر و نظر کی پوری بساط پلٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ سنسکرت جیسی مہذّب زبان پیچھے کر دی جاتی ہے اور پالی کا مقدّر جاگ اُٹھتا ہے، یہاں تک کہ گوتم بُدھ وجودِ باری تعالیٰ کے بیان میں بھی خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ اسی خاموشی سے خود بدھ ازم میں فکر کے دو دھارے پیدا ہوتے ہیں، ایک یہ کہ خدا ہے ہی نہیں اور دوسرا یہ کہ بُدھ خود خدا ہے۔۔۔

خدا کوئی معبود، خالق نہ رب　　نہ تخلیق کا ہی کوئی ہے سبب
زمان و مکاں کا خمیرِ ازل　　ہے در اصل خالق کا نعم البدل
یہ سارا جہاں اک حسیں خواب ہے　　نظارہ یہ عکسِ سرِ آب ہے
مہہ و آفتاب، آسمان و زمیں　　ہے جو کچھ نظر میں وہ کچھ بھی نہیں

اور جو کچھ ہے وہ صرف نروان ہے۔۔۔۔۔۔

ہے نروان ہی زیست بعد از ممات　　اسی میں ہے مضمر خدائی صفات
تغیّر ہے اس میں نہ ردّ و بدل　　خدا کا ہے نروان نعم ا لبدل

اس ضمن میں جب اسلم بدر ہندوستان سے نکلتے ہیں تو آتش کدۂ ایران میں داخل ہوتے ہیں اور زرتشت کی پناہ ڈھونڈ ھتے ہیں، وہاں ژنداوستھا اور گاتھا کے حوالے سے ایک انوکھی بات معلوم ہوتی ہے کہ نسلِ انسانی دراصل نباتاتی ہے اور پہلا انسانی جوڑہ ہے ''میش اور مشیان'' جو کسی پیڑ پر پھل گیا تھا۔۔۔اور پھر وہاں سے آگے بڑھتا ہوا اُن کی فکر کا قافلہ مشرقِ وسطیٰ پہونچتا ہے، تو وہ عہد نامۂ قدیم وجدید کے اوراق اُلٹتے ہیں، یہاں تک کہ قرآنِ مبین کے اُجالوں میں پہونچتے ہیں اور یقین کی متاعِ گراں حاصل کرتے ہیں۔مگر اس ذکر کو فی الحال میں یہیں روکتا ہوں کیونکہ مثنوی میں دنیا کے دیگر مذاہب سے بھی رجوع کیا گیا ہے۔اسلم بدر، ثنویت، تثلیثیت ،لذّت وشہوت، عشق و مستی، فنا میں بقا کی تلاش وغیرہ سے گذرتے ہوئے فلسفۂ قدیم و جدید تک پہونچ جاتے ہیں اور اس ضمن میں رواقیت، زینو کی تجسیمیت ، ابیقوریت، کے تصوّرات کی تھرتھراہٹوں تک پہونچتے ہیں۔ابیقوریت جو ارواح کی بقا اور خلاّقئی خدا سے انکار کا نام ہے۔جو نہ جنّت پر یقین رکھتی ہے اور نہ دوزخ سے خوف زدہ ہے وہ محض چراغِ آگہی کی جویا ہے، آگہی جو اندرون میں ہے، سرور جو اپنی ذات سے باہر نہیں ہے۔۔۔

روشن جو چراغِ آگہی ہے　　غم میں سرورِ زندگی ہے
راضی بہ رضا کی خو ہے سب کچھ　　اندر کا جہانِ ہُو ہے سب کچھ

اور یہیں سے فلسفۂ جدید وقدیم کی عقدہ کشائی کا عمل شروع ہوتا ہے۔اسلم بدر اپنی اس مثنوی میں سقراط ،ارسطو، فیثا غورث ،فلاطینوس ،سانکھیہ درشن ،تشکیک سے گذرتے ہوئے ابنِ سینا اور فلسفئ اسلام امام غزالی اور پھر جدید فلسفوں میں ڈیکارٹ ، برگساں، آئنسٹائین وغیرہ کے خیالات کے حوالے سے مسئلۂ حیات وکائنات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ فلسفیانہ مطالعہ سے ایک عجیب بات سامنے آتی ہے کہ تلاشِ حق کے جویا ہندوستان کے ہوں یا عرب کے یا یونان کے، سب ایک ہی انداز میں سوچتے نظر آتے ہیں۔مثلاً یونانی فلسفی فلاطینوس کے یہاں وید کی جلوہ ریزیاں ملتی ہیں اور یونان سے یہی نورانیت مسلم فلسفیوں اور صوفیوں تک پہونچتی ہے۔اسلم بدر کہتے ہیں۔۔۔

بُدھ کی تعلیمِ ذات سے مخمور　　جامِ ویدانت کے خمار سے چُور
اُپنِشد کا سرورِ بادہ 'وہ ایک'　　یوگ کا عالمِ کشادہ 'وہ ایک'
وحدتِ کُل وجود کی تعلیم　　مصدرِ ہست و بُود کی تعلیم

وہ عدم بھی ، وہی وجودِ عدم   اور وہی شاہد و شہودِ عدم
لاوہی ہے ، وہی الٰہ بھی ہے   بے پناہی بھی ہے پناہ بھی ہے
ذات کا ذکر یا صفات کی بات   اس کے محدود ہونے کے خطرات
اُس کے موجود ہونے کا بھی یقین   اس کی شانِ وجود کی توہین

اور پھر اسی سلسلے میں آگے چل کر یوں کہتے ہیں کہ۔۔۔۔۔۔

عقل کی واں تلک رسائی نہیں   عقل کو قربتِ خدائی نہیں
عقل کب اُس دیار تک جائے   درمیانِ سفر ہی تھک جائے
------   ------
عقل کا اس جنوں سے کیا ناطہ   ''عشق بن یہ ادب نہیں آتا''

اوراسلم بدر اس حقیقت تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں کہ احدیت کا خالص تصوّرِ ذاتِ باریٔ تعالیٰ کو اسماو صفات سے ماورا مانتا ہے۔ اگر اہلِ نظر مجھ پر خود نمائی کا الزام نہ دھریں تو میں اپنی غزل کے چند اشعار نذر کرنا چاہتا ہوں۔

حصارِ جسم تو ٹوٹا ، یہ مرحلہ کیا ھے   صفات و ذات کا ہونٹوں پہ ذائقہ کیا ھے
تلاشِ ذات کی منزل ، نفیٔ ذات میں ھے   نفیٔ ذات میں ناموں کا تذکرہ کیا ھے
مرا وجود ھے مانا ، وجودِ لا موجود   مگر یہ فکرِ رسا ، ذھنِ نابغہ کیا ھے
شمیمؔ آئو محیطِ خلا میں کھو جائیں   لباسِ جسم سے گذریں مضائقہ کیا ھے

اسلم بدر چونکہ سائینس کے طالب علم رہے ہیں اس لئے بھی انہوں نے جگہ جگہ پر اس مثنوی میں اپنی سائینسی معلومات سے استفادہ کیا ہے، خصوصی طور پر وسعت اور جسامتِ کائنات کے اسرارِ سربستہ کا بیان کرتے ہوئے۔ جدید سائینسی تحقیقات کی روشنی میں مادّہ اور ارتقائے مادّہ کے حقائق کو بھی ایسے دلچسپ اور پُر اثر انداز میں بیان کیا ہے کہ سائینسی حقائق بیانیہ سے آگے نکل کر ہجر و وصالِ محبوب کی داستانی شکل اختیار کرتی نظر آتی ہے۔ مثلاً، اس عظیم دھماکے کا ذکر کرتے ہیں جو جہانوں کے وجود کا سبب ہُوا، کہتے ہیں۔۔۔۔

ازل سے ہیں موجود ذرّاتِ برق   کُل اشیائے عالم ہیں، سوغاتِ برق
یہ ذرّے تھے، بے پیکر و لا بدن   سجی تھی توانائی کی انجمن
اچانک ، جمودِ توانائی میں   کہیں دُور مرکز کی گہرائی میں
کسی برق پارے میں ہلچل ہُوئی   طبیعت اسیری سے بیکل ہوئی

رفاقت کا ازلی چلن چھوڑ کر   نکل آیا قیدِ کہن توڑ کر
ہوئی بندشوں سے وہ آزاد جب   مہیب اک دھماکہ ہوا، پُر غضب

اسی موضوع پر قرآنِ کریم کے مطالعے کے حوالے سے کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔

عدم پر مسلّط زمانہ نہ تھا   نہ ہی وقت کا کوئی پیمانہ تھا
------   ------
سبک سار قدرت کی آغوش تھی   زمیں آسمانوں میں روپوش تھی
حجابوں کو اذنِ خدائی ملا   دمِ وصل حکمِ جُدائی ملا
اک آوازِ کُن بے صدا گونج اُٹھی   مکاں تھرتھرایا، فضا گونج اُٹھی

اور پھر قیامت کی سائینسی توجیح بھی، کہ پھر ویسا ہی ایک دھماکہ ہوگا اور تمام ارض و سماوات فنا ہو جائیں گے۔۔۔۔۔

ہیں لاکھوں سدائم کے تاریک خول   کروڑوں کروڑ آفتابوں کے غول
ستاروں بھرے راستے کہکشاں   غبارِ توانائی کی وادیاں
------   ------
ہزاروں ہیں ایسے بھی گرم آفتاب   کئی ان میں پوشیدہ، کچھ بے نقاب
نظر میں ہیں بس آگ کی بھٹّیاں   نظاروں سے آگے دھواں ہی دھواں
احاطے میں اِس آتش و دوُد کے   ہیں تپتے ہوئے ڈھیر بارُود کے
لپکتے ہوئے شعلے ہیں منتظر   نظاروں کو ہو جانا ہے منتشر
بھڑک کر سبھی خاک ہو جائینگے   نظارے خلاؤں میں کھو جائینگے

مگر حیات کا سلسلہ فنا نہیں ہوگا۔ وہ نئے منطقوں میں داخل ہو جائے گا اور یہیں سے حیات بعدِ ممات کا آغاز ہوگا۔ اور فنا کا وہ لمحہ بھی حیات بعدِ ممات کی آنکھوں میں ایک اُچٹی ہوئی نیند کی طرح ہوگا۔

موت اک ماندگی کا وقفہ ھے ... اور آگے چلیں گے دم لے کر (میرتقی میر)

اور یہیں آ کر اسلم بدر 'عالمِ ضدّین'، 'حیات بعدِ ممات' اور 'دوسری دنیا۔ ہماری ضرورت' کی لازمیت پر شعری منطق اور قرآن کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں۔۔۔۔۔

ہے دنیا کی ضد دوسری کائنات.....یہاں نفئی سب کچھ ، وہاں سب ثبات

محاسبۂ روزِ قیامت کے متعلق بیان کرتے ہوئے، انکا سائنسی شعور کہتا ہے کہ

ابتدائے آفرینش سے اب تک تمام عکس وصدا، فضاؤں میں اب بھی موجود ہیں۔ انسانی شعور انہیں کشید کرنے کی کوششوں میں، ریڈیائی (صوتی وعکسی) نشریات تک تو پہونچ ہی چکا۔ وہ دن بھی شائداب بہت زیادہ دُور نہیں کہ ہم اپنی مرضی کے مطابق گذرے ہوئے کسی بھی پل یا عہد کو اپنے گھر بیٹھے دیکھ سکیں گے۔
اگر انسان اس طرح کی کوششیں کر رہا ہے تو وہ خالقِ کائنات کے لئے کیا مشکل ہے کہ بروزِ حشر ہمارے اعمال نامے ہمارے سامنے کھول دے۔۔۔۔

علم کی قید میں زمان و مکاں — علم کی حد، حدودِ لا امکاں

علم سے مل گئی ہمیں یہ دلیل — ہے فضا عکس وصوت کی اک جھیل
وقت کے سیل کا یہ مخزن ہے — جس کی ہر لہر ایک درپن ہے
انہیں لہروں میں اپنا کل محفوظ — اپنے ماضی کا ہر عمل محفوظ
روزِ محشر محاسبہ ہونا — انہیں لہروں کا آئینہ ہونا

اس مثنوی میں کئی مقامات پر قرآن عظیم کی آیاتِ کریمہ سے اجالا حاصل کیا گیا ہے۔

سَبحِ اِ سمَ رَبِکَ ا لاعلی(۱)۔ اَلّذِی خَلَقَ فَسَوَّ ی(۲)۔ وَالَذِی ُ قَدَّرَ فَھَدیٰ(۳)۔ ۔۔۔۔۔(سورہ الاعلیٰ، آیات ۱۔۳)
(اپنے رب کے نام کی تسبیح کرو۔ جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا (ہر طرح سے سجایا)۔ جس نے تقدیر بنائی اور ہدائت فرمائی۔)

آ رائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں ۔(غالبؔ)

اسلم بدر نے اُس خلاّقِ عظیم کے طریقۂ ہدایات اور مسئلۂ جبر وقدر پر اِن آیات کے پیشِ نظر اپنے مطالعے اور شاعرانہ منطق کے حوالے سے 'قرآنی تعلیمات اور تخلیقی عمل' کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا ایسا خالق نہیں ہے کہ تخلیق کر کے چھوڑ دیتا ہے بلکہ اپنی خلقت کو ہر طرح سے سجاتا سنوارتا بھی ہے، ان میں ایک تناسب بھی قائم کرتا ہے پھر اُن کی تقدیر بھی مقرّر کرتا ہے اور اُنہیں ہدائت بھی دیتا ہے۔ خصوصی طور پر عملِ تسویہ کی خوبصورت وضاحت پیش کی ہے۔۔۔۔!

وہ خالق بھی ہے، وہ مصوّر بھی ہے — وہ ہادی بھی ہے اور مقدّر بھی ہے
انہیں چار الفاظ میں ہیں نہاں — مظاہر کی تکوین کی داستاں

دیا کم، نہ ہی کچھ زیادہ دیا — بدن کے مطابق لبادہ دیا
نہ ہوتا اگر یہ 'سوائی' عمل — ٹھہر جاتا ہر کیمیائی عمل
نہ جوہر کی قوّت کا ہوتا ظہور — جنوں خیز ہوتی نہ رفتارِ نُور
کسی کو کیا جبر سے ہمکنار — کسی کو دیا قدر پر اختیار
یہی قدر ہے وہ دُرِ بے بہا — جسے سب نے قانونِ فطرت کہا
بہر آن، تخلیقِ کُل کے لئے — مناسب، مقرّر حوالے دیئے
بہر گام، مشکل کشائی بھی کی — ہدائت بھی دی، رہنمائی بھی کی

اور وہی ہے جو ایک دن اس کائنات کو فنا بھی کر دے گا کہ اسی خلاّق علیم کے ارادہ سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے اور اسی کے حکم سے ہم آغوشِ فنا ہو جائے گی اور اسی کی طرف لوٹ جائے گی۔۔۔۔

هر اك كارواں تهك كے سو جائے گا.....سفر ايك دن ختم هو جائے گا

۔۔۔اَوَلَیسَ اَ لَّذِی خَلَقَ ا لسَّمٰوٰتِ وَ الاَرضَ بقٰدِرٍ عَلیٰٓ اَن یَّخلُقَ مِثلَھُم ط بَلیٰ ق وَھُوَ ا لخلّٰقُ ا لعَلِیم(۸۱)۔انَّمَااَمَرُہٗ اِذَآاَرَادَ شَیاً اَن یَّقُولَ لَھہٗ کُن فَیَکُون (۸۲)۔ فَسُبحٰنَ الَّذِی بِیَدِہٖ مَلَکُو تُ کُلِّ شئیٍ وَ اِلَیہِ تَر جَعُوُن (۸۳)۔۔۔(سورہ یٰسین، آیات ۸۲۔۸۳):

[بھلا (وہ) جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا، کیا وہ اِس بات پر قادر نہیں کہ اُن کو (پھر) سے ویسے ہی پیدا کر دے۔؟ کیوں نہیں۔! ۔اور وہ تو بڑا پیدا کرنے والا اور علم والا ہے۔ اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا اردہ کرتا ہے تو اُس سے فرما دیتا ہے کہ ہو جا، تو وہ (چیز) ہو جاتی ہے۔ وہ ذات پاک ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے، اور اُسی کی طرف تُم کو لوٹ کے جانا ہے۔]

مگر صدائے کُن گونجتی رہے گی اور اس کی گونجن کتنے عالموں کو جنم دے گی، اُسی کا راز ہے اور وہی جانتا ہے۔ میں اسلم بدر کے ساتھ ساتھ یہاں تک آ گیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اس خوبصورت مثنوی کی تخلیق پر اُنہیں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے رخصت ہو جاؤں۔۔۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔۔وَما علینا الا لبلاغ.

☆☆☆

آپ کے خطوط اور ای میلز

☆☆**نیا سال مبارک**! ''جدید ادب'' کا تازہ شمارہ شاندار ہے۔گٹ اپ کے اعتبار ہی سے نہیں ،مندرجات کے حوالے سے بھی یہ شمارہ اعلیٰ ادبی معیار کا حامل ہے۔خوبی کی بات یہ ہے کہ اس پر کسی ایک ادبی حلقے کی چھاپ نظر نہیں آتی۔آپ نے تمام مکاتبِ فکر کے ادباء کی پروجیکشن کی ہے۔یہ بہت اچھی بات ہے۔''دیکھ دھنک پھیل گئی'' پر تبصرہ خوب ہے اور نظم شناسی کی ایک عمدہ مثال!بس ذرا مختصر تھا۔احباب نے ایک آنکھ میچ کر اس کے اختصار کی تعریف کی۔بڑے ظالم لوگ ہیں۔ **ڈاکٹر وزیر آغا**۔لاہور

☆☆(**بنام نذر خلیق**)برادرِ گرامی سلام ورحمت

''جدید ادب'' موصول ہوا۔یادآوری اور کرم فرمائی کا احسان مند ہوں۔میں سمجھتا ہوں کہ بیرون ملک چھپنے والے پرچوں میں ''جدید ادب'' ہر اعتبار سے بہت مختلف اور نمایاں نظر آتا ہے۔ادارت صاف نظر آتی ہے۔مواد کے معیار اور تنوع نے ''جدید ادب'' کو بہت کم عرصے میں اردو دنیا کا ایک اچھا ادبی رسالہ بنا دیا ہے۔برادرم حیدر قریشی اور ان کے رفقائے کار ہماری داد وتحسین کے بجاطور پر مستحق ہیں۔اللہ تعالیٰ توفیق ارزانی کرے۔

افتخار عارف چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد

☆☆ڈیئر حیدر قریشی صاحب

I am sorry for the delay in responding to your e-ms. I am on my computer today after about a weak or even more. All last days I was not well because of the fracture of my right hand. Besides some physical discomfort I have found quite inconvenient to deal with one hand, particularly with the left one! As doctor promised the plaster will be removed after a month, - otherwise I won't ''واقعہ سخت اور جان عزیز'' not before. So, I have to exercise my ulta hath – be able to do anything for quite a long time! Anyway, my computer with the help of a finger of the left hand can send you my hearty gratitude for your all e- mails.

I have looked through the fehrest of naya Jadeed adab. It is full of so interesting things! آپ کا اداریہ،انتظار حسین کا خطاب،اور افتخار عارف پر شگفتہ الطاف کا مضمون اور کچھ شاعری پرنٹ آؤٹ کر چکی ہوں۔کل پرسوں پڑھوں گی۔جنوری میں اس شمارے کا انتظار کروں گی۔کتابی شکلیں ابھی تک مجھے آن لائن والی شکلوں سے بہتر لگتی ہیں۔مجھے پہلے کی طرح آپ کے کام کی صلاحیت کے معجزے پر حیرت بھی ہے اور صدرشک

بھی۔سمجھ میں نہیں آتا ہے آپ 24 گھنٹوں کو 48 گھنٹوں یا اس سے بھی زیادہ کس طرح بنا لیتے ہیں؟۔اگلی ملاقات ہوگی (انشاءاللہ) تو آپ سے یہ منتر سیکھنے کی کوشش کروں گی۔جہاں تک اگلے شمارے کے لئے میرے مضمون کی بات ہے تو ابھی کیا کہہ سکتی ہوں۔۔۔۔میرے دائیں ہاتھ کی ہڈی ٹھیک سے جُڑ جائے اور کوئی بلائے ناگہانی نہ ہو تو آپ کے رسالے کے لئے لکھنا باعثِ شرف سمجھوں گی۔

ڈاکٹر لڈمیلا (ماسکو یونیورسٹی۔روس)

☆☆

خود یہ حیدرؔ بھی جدید اور ادب بھی ہے جدید
تبصرہ اس پہ اگر ہو گا تو کیا ہو گا مزید
'گفتگو' میں ہے نہاں ایک غضب کی تحریک
'جعلی شعرا' کے لیئے سچ ہے بہت ضربِ شدید

صفدر ہمدانی (لندن)

☆☆آپ کا جدید ادب پڑھا،بہت خوب ہے۔ترنم ریاض صاحبہ کا 'ٹیڈی بیئر' بہت پسند آیا۔ان کو ہماری طرف سے مبارکباد دیجئے گا۔آپ کے ماہیے ''نمازِ عشق'' بہت پسند آئے۔اتنا اچھا اور خوبصورت ادبی میگزین نکالنے پر میری مبارکباد قبول فرمائیں۔ **عثمانہ اختر جمال** (امریکہ)

☆☆ tabassumkashmiri@hotmail.com 24.01.2004 14:21:09

Dear Haider,

Today I received the new issue of Jadeed Adab. I read most of the magazine just in one sitting,it keeps very fine readable material. I appriciate the afforts you are making at a place which is far away from the centres of Urdu literatue. I am deeply inspired by the short story of Munsha Yaad. The story is highly engaging,it's plot structure, build up of the theme and his craft while chiselling the character of mother is wonderful. Rashid Amjad's story is also very fine, he has created his own world of fiction which is unique and amazing. I saw the ghazals of my friend Nasir Zaidy after a long time his poetry refreshed me. I will send you my poems within few days.

☆☆وعدہ تو یہ تھا کہ ''جدید ادب'' کے لئے نظمیں ارسال کروں گا مگر فرصت نہ ملی کہ ان کو ایک نظر دوبارہ دیکھ سکتا۔ میں غزل نہیں کہتا۔ آج تک کبھی ایک غزل بھی کہیں نہیں چھپی مگر گزشتہ چند برس سے توکیو کی ایک یونیورسٹی میں ہر سال ایک اردو مشاعرہ ہوتا ہے اور مجھے صدر شعبہ کی دوستی کے ناطے شریک بھی ہونا پڑتا ہے۔ اسی شرکت کے لیے اور مشاعرے کے روایتی لوازمات پورے کرنے کے لئے ہر سال دو تین غزلیں کہنے کی ضرورت آ پڑتی ہے۔ یہ غزلیں اسی ضرورت کا نتیجہ ہیں۔ سوچا کہ ''جدید ادب'' کی نذر کر دوں۔ نظم کے بعد ذائقہ بدلنے کے لیے غزل کہنے میں ایک ثقافتی لطف ضرور ملا ہے۔ میں آپ کی سرگرمیوں کا مداح ہوں اور آپ کے زورِ قلم کے لیے دعا گو ہوں۔ **ڈاکٹر تبسم کاشمیری** (شعبہ اردو۔ اوساکا یونیورسٹی۔ جاپان)

☆☆(**بنام نذر خلیق**)''جدید ادب'' کے تازہ ترین شمارے کی دو کاپیاں موصول ہوئیں۔ یاد آوری کے لیے ممنون ہوں۔ صورت وسیرت دونوں اعتبار سے شمارہ خوب ہے۔ آپ حضرات اردو کی جو خدمت کر رہے ہیں اسے اردو والے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ **پروفیسر ظہور الدین**۔ (شعبہ اردو۔ جموں یونیورسٹی۔ کشمیر)

☆☆جدید ادب سے ہر دو طریقوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ (طبع شدہ اور انٹرنیٹ) پر دستیاب شماروں کے مطالعہ کرنے کے بعد میں ہمیشہ ارادہ کرتا ہوں کہ آپ کو خط لکھوں گا لیکن ہر بار دل کی بات قلم اور زبان پر لانے کی بجائے خاموشی اختیار کرنے کی عادت سی پڑ چکی ہے۔ اسے میری کوتاہی سمجھئے یا سستی۔ وقت کا بہانہ نہیں لگاؤں گا۔ چونکہ وقت تو ہر انسان کے پاس 24 گھنٹے ہی ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے میں آپ کا معترف ہوں کہ آپ حصول روزگار کے ساتھ ساتھ ادبی دنیا کیلئے کافی وقت دے رہے ہیں۔ قریشی بھائی ایک بات بتاؤ کیا جرمنی میں دن 24 گھنٹوں کا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں یہی زندگی ہے۔ زندگی تو جذبوں کا نام ہے سانس لینے کا نہیں۔ جذبے ہی انسان کو جوان اور بوڑھا کرتے ہیں۔ میرے سفر کی یادیں ''پیغمبروں کی سرزمین'' پر جدید ادب نے جو تبصرہ کیا میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ جدید ادب کو جس جدید طریقہ سے چلانے پر گامزن ہیں یہی وقت کی ضرورت ہے۔ ثابت قدم رہیں اللہ آپ کو کامیابی عطا فرمائیں گے۔ محمود ہاشمی صاحب آپ کو بہت یاد کرتے ہیں اور سلام پیش کرتے۔ **یعقوب نظامی**۔ (بریڈفورڈ۔ انگلینڈ)

☆☆جنوری۔ جون ۲۰۰۴ء کا ''جدید ادب'' ملا۔ ایسا لگتا ہے ''جدید ادب'' کا تیسرا دور پہلے دونوں ادوار سے آگے نکل رہا ہے۔ مضامین کا حصہ بے حد وقیع ہے اور آپ کے حسن انتخاب کا مظہر صبا اکبر آبادی صاحب کی حمدیں پڑھ کر لطف آ گیا۔ افسانوں کے حصے میں منشا یاد اور رشید امجد کے نام ہی اس حصے کو بھاری بھر کم بنانے کے لیے

کافی ہیں محمد عاصم بٹ اپنے آپ کو منوا رہے ہیں۔ جواز جعفری کی غزلیں میں نے ہمیشہ شوق سے اور لطف لے کر پڑھی ہیں۔ غزل کے دونوں حصے مرقع ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اس دور میں نظم کے لیے سرمایہ افتخار ہیں۔ ''ماہیا'' حیدر قریشی کی محنت اور ذہانت کے باعث اب ایک تحریک کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ یہ ایک معرکہ ہے جو حیدر قریشی کی برسوں کی محنت اور لگن سے سر ہوا ہے۔ اب یہ صنف پوری طرح سامنے آ گئی ہے اور ہمارے دور میں حیدر قریشی سے منسوب ہوئی ہے۔ تبصرے سب کے سب اعلیٰ درجے کے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ''جدید ادب'' کا یہ شمارہ خوب سے خوب تر کا سفر ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ ''جدید ادب'' پوری دنیا میں پڑھا جا رہا ہے۔ خدا آپ کے حوصلوں کو بلند رکھے۔ آپ اور پروفیسر نذر خلیق مبارک باد کے مستحق ہیں۔ **اکبر حمیدی** اسلام آباد

☆☆(**بنام نذر خلیق**)''جدید ادب'' نے مدت مدید کے بعد ساعت دید عطا کی تو قدیم یادوں کے دریچے کھل گئے۔ روشنی اور خوشبو مل کر عود کر آئیں تو قلب ونظر معطر ومنور ہو اٹھے ہیں اور پھر جب خوشبو یادوں کی اور روشنی جذبوں اور لفظوں کی ہو۔۔۔ تو روح کی سرشاری کے کیا ٹھکانے۔۔۔۔ کبھی جب خان پور سے حیدر قریشی جدید ادب نکالتے تھے اس دور کی قلمی رفاقتیں یاد آئیں تو قلبی رابطوں کی بازیافت کا جذبہ مچل اٹھا۔ انہیں میرے محبت بھرے سلام بھیجئے گا اور یہ ''حاضری''۔۔۔ محبتوں کے ساتھ۔ **محمد فیروز شاہ**۔ میانوالی

☆☆جدید ادب کا شمارہ چند یوم قبل موصول ہوا۔ از حد ممنون ہوں۔ جرمنی سے جدید ادب جیسا جریدہ نکالنا؟ میں آپ کی اردو عاشقی کی دل سے قدر کرتی ہوں۔ یہ واقعی بڑے حوصلے اور جگر کاوی کی بات ہے، اس کارِ خیر کے لئے میری مبارکباد قبول فرمائیے۔ جدید ادب کو ہر لحاظ سے معیاری پایا۔ شعری حصے نے از حد متاثر کیا۔ نثری حصہ بھی معیاری اور دلچسپ ہے۔ آپ خود ایک ادارہ سے کم نہیں۔ ایک باذوق ادب نواز اور۔۔۔۔ شخصیت کے علاوہ آپ ایک باکمال شاعر بھی ہیں۔ میں برسوں سے آپ کو پڑھتی آ رہی ہوں۔ آپ کی ہر تخلیق متاثر کرتی ہے۔ اللہ آپ کے قلم کو اور قوت عطا فرمائے (آمین) **نسرین نقاش**۔ سری نگر، کشمیر، انڈیا

☆☆'جدید ادب' کا شمارہ عزیز دوست سنجئے گوڑ بولے کے توسط سے ملا۔ آپ کی ادبی خدمات کے بارے میں کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ میری طرف سے ہدیۂ تہنیت قبول فرمائیے۔ جدید ادب کے لئے دعا گو ہوں! **ایوب راز** (کویت)

☆☆ سہیل احمد صدیقی کے توسّط سے آپ کا رسالہ موصول ہوا تاہم اپنی کچھ مصروفیات کی بنا پر فوری طور پر

تحریری رابطہ نہ کرسکی۔رسالے کا مطالعہ کیا پسند آیا سچ تو یہ ہے کہ اردو ادب کے حوالے سے جو بھی چراغ روشن ہوگا اس کی کرنیں کسی نہ کسی گوشے کو ضرور منوّر کریں گی۔میں آپ کے لیے استقامت کی دعا کرتی ہوں اور تسلسل کے ساتھ اسکے اجراء کی خواہشمند ہوں۔ **رخسانہ صبا** (کراچی)

☆☆ شروع سے آخر تک جدید ادب اپنا معیار برقرار رکھتا ہے۔اس کے افسانے،مضامین نے مجھے اپنے سحر میں گرفتار رکھا۔بہت ہی پسند آئے۔ مدیرانہ اعلیٰ کارکردگی کا توقع سے بھی زیادہ ثبوت دیا گیا۔آپ کی یہ ادبی مصروفیت وسرگرمی ادب سے آپ کی وابستگی کا اسارا ہے۔غزلیں،نظمیں،ماہیے تمام ہی اپنی اپنی جگہ اچھے ہیں۔

سیما عابدی (امریکہ)

☆☆ جدید ادب کا شمارہ نمبرایک چند ماہ پہلے بھائی ناصر عباس نیر نے مطالعے کے لیے دیا۔گزشتہ ماہ جھنگ میں ان سے ملاقات ہوئی۔ پہلا شمارہ ان کو واپس کیا تو دوسرا شمارہ انھوں نے نہ صرف مطالعے کے لئے دیا بلکہ افسانہ بھیجنے کی بھی تاکید کی۔

جدید ادب کی فہرست دیکھی تو افسانے میں سارے دوستوں کو موجود پایا۔ڈاکٹر رشید امجد کا افسانہ ''بے سفری'' پڑھا تو چونک اٹھا۔علامتی انداز میں ترسیل اور ابلاغ کا موجود ہنا رشید امجد کے فن کا خاصہ ہے۔ان کے علامتی افسانے میں بھی ابہام نہیں ہوتا۔اور یہ خوبی ہمیں ہر علامتی افسانہ نگار کے ہاں نہیں ملتی۔افسانہ منزل کے افسانہ نگار منشاء یاد کا افسانہ میں نے ''ماں جی'' میں نے ملتان پہنچ کر پڑھا۔اگلے روز مجھے میانوالی واپس آنا تھا۔افسانے کی کرافٹ اتنے کمال کی تھی کہ میں گردوپیش سے کٹ کر رہ گیا۔اس عالمگیر موضوع پر ادب میں بے بہا خزینہ موجود ہے۔ شعراء نے ماں کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا ہے تو نثّار قلم کاروں نے نثر میں اپنے فن کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ ''ماں جی'' ایک Classic Piece of literary art ہے۔منشاء یاد کے فنی سفر میں یہ ایک ایسا سنگِ میل ثابت ہوگا۔ جسے ہمیشہ بطورِ ریفرنس پیش کیا جائے گا۔افسانے کے اختتام پر میری آنکھوں سے ساون برسنے لگا۔ مجھے میری ماں یاد آئی اور میں ٹوٹ کے رویا۔میں نے اسی وقت منشاء یاد کو فون کیا۔جدید ادب کے ریفرنس سے ان تک اپنے جذبات پہنچائے۔اس افسانے کا تجزیہ پورے مضمون کا متقاضی ہے۔۔۔حیدر قریشی صاحب ۔۔ میرا وعدہ رہا میں ''ماں جی'' پر مضمون لکھ کر جدید ادب کو ہی بھجواؤں گا۔مشرف عالم ذوقی کا افسانہ لیبارٹری انسانی ضمیر کو جھنجوڑنے والا ایک ایسا تازیانہ ہے۔جس میں پوری نسلِ انسانی کا المیہ کُرلا رہا ہے۔میں اپنے دوست مشرف عالم ذوقی کو اتنا شاندار اور بھرپور افسانہ لکھنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔مشتاق انجم کا ''سسکتی روشنی کی فریاد'' ترنم ریاض کا ''ٹیڈی بیر'' اور محمد عاصم بٹ کا ''انتظار'' بہت پسند آئے۔اظہر الحق کا افسانہ ''کالی دھند'' گو انسانی بے حسی

اور معاشرتی قدروں کے زوال کی عکاسی کرتا ہے۔کہیں ایک ادھورا پن ہے جو اس افسانے میں کھٹکتا ہے۔لیکن اس کے باوجود افسانہ نگار نے جو محنت کی ہے اس کی داد دینا ضروری ہے۔مجموعی طور پر جریدے میں تمام اصنافِ سخن کا معیار اعلیٰ ہے۔جریدے کا ہر صفحہ مدیر کی قابلیت کی عکاسی کر رہا ہے۔

محمد حامد سراج (میانوالی)

☆☆ ''جدید ادب'' بہ یک وقت کتابی صورت میں اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہونے والا اردو کا ادبی جریدہ ہے جو www.jadeedadab.com پر پڑھا جاسکتا ہے۔۔۔جدید ادب کا تازہ شمارہ گوناگوں خوبیوں کا حامل ہے۔ فرحت نواز شیخ کے دعائیہ ماہیے،امین خیال کے نعتیہ ماہیے اور بشریٰ رحمٰن،ترنم ریاض، عارف فرہاد،سجاد مرزا، نسرین نقاش،محمد ارباب بزمی، ارشد اقبال آرش، وسیم انجم،کرشن مہیشوری،گلشن کھنہ،مسعود احمد چودھری، ریحانہ سرور، انیتا مروندی، پروین غزل،نوشی جان اور ریحانہ احمد کے بے شمار خوب صورت ماہیے ''جدید ادب'' کا خاص گوشہ رکھتے ہیں۔

''کتاب میلہ'' کے عنوان کے تحت ریحانہ احمد نے مختلف اصناف سخن میں نکلنے والی کتابوں اور جرائد کا اجمالی رتعارف دے کران کتب اور رسائل کے پڑھنے کا اشتیاق پیدا کیا۔ جب کہ ناصر عباس نیرؔ کی کتاب ''چراغ آفریدم'' کا ساجدہ نواز نے، اور یعقوب شاہ عرشیں کے ''آخری آنسو'' کا محمد حمید شاہد نے تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے۔سہیل احمد صدیقی (کراچی) نے عصمت علی پٹیل کی ''تاریخ کھتری'' کے حسن وقبیح پر کھل کر لکھا ہے۔ان کے علاوہ خود مدیر حیدر قریشی نے ''تمنا بے تاب'' (رشید امجد) محمد احمد سبزواری فن اور شخصیت'' (رضیہ حامد) اور ''ہر اک طرف سے'' (اکبر حمیدی) کی کتابوں پر تبصرے کر کے ان کتابوں کا ایماندارانہ جائزہ لیا ہے۔

مظہر امام کی آٹھ غزلیں شاہد ماہلی کی چھ غزلیں، سعادت سید کی پانچ غزلیں، خورشید اقبال کی چھ غزلیں، عارف فرہاد کی سات غزلیں گویا ان شاعروں کا مکمل تعارف ہیں۔ صلاح الدین پرویز کی نو نظمیں، سعادت سعید کی پانچ نظمیں اور ڈاکٹر فراز حامدی کے دس گیت ان شاعروں کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ان خاصی منظومات کے علاوہ نثری حصہ بھی کچھ کم نہیں۔

جانے کے بعد (جوگندر پال) ادبی تحقیق اور اس کے مسائل (پروفیسر شفیق احمد) ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی تنقید نگای (ناصر عباس نیرؔ) جدید افسانہ نگاری میں رشید امجد کا مقام (ثمینہ اصغر علی) اور آخر میں ستیہ گوڈبولے اور کرشن مہیشوری کا مشترکہ مضمون ''اردو کا مستقبل'' امکانات اور اندیشے'' رسالے کی جان ہیں جس میں ان دونوں قلم کاروں نے اردو کے بیشتر اہم مسائل پر کھل کر اظہار رائے کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ اردو کے موجود رسم الخط کو بدلنے سے اردو مکمل طور پر مر جائے گی۔رسم الخط کے بدلنے سے اس کا حلقہ وسیع ہونے کا خیال ایک غلط مفروضہ ہے۔انھوں

نے ترکی کی مثال دے کر کہا کہ آج ترکی ادب بے نام ونشان ہو کر رہ گیا ہے۔ اردو کو زندہ رکھنے کے لیے اردو اخبارات ورسائل کو خرید کر پڑھنے کی ترغیب دی جانی چاہیے۔ گھوسٹ رائٹنگ ghost writing کی مخالفت ہونی چاہیے تا کہ اردو میں متشاعروں اور جعلی قلم کاروں کا سدباب ہو۔

حیدر قریشی نے اپنے ابتدائی ادبی زمانے کی کھٹی میٹھی یادیں بڑے دل نشین انداز میں بیان کی ہیں۔

ڈیلی منصف حیدرآباد میں چھپنے والے تبصرہ کا ایک اہم حصہ

رؤف خیر (حیدرآباد۔دکن)

☆☆(**بنام نذر خلیق**) عزیزم حیدر قریشی کو برسوں سے جانتا پہچانتا ہوں' واقعی ادب دوست انسان ہیں۔ اب ان کی ادبی شخصیت پر اور کیا لکھوں کہ لکھنے والوں نے ایک ضخیم کتاب میں بہت کچھ لکھ دیا ہے۔ فی الحال ''جدید ادب'' کا شمارہ نمبر۲ میرے پیشِ نظر ہے اور سب سے پہلے 'گفتگو' پر کچھ گفتگو کرنا ہے جو حیدر قریشی کا تحریر کردہ اداریہ ہے۔

جہاں تک جدید ادب کے بنیادی مزاج کا سوال ہے مجھے ذاتی طور پر مدیر محترم کے اس قولِ فصیل سے اختلاف کا حق ہے کہ یہ مزاج مستقل اور سینئر لکھنے والوں سے ہی متعین ہوتا ہے۔ ارے صاحب! ہمارے نئے لکھنے والوں میں ایسے باشعور اور کثیر المطالعہ ادب تخلیق کرنے والے بھی ہیں جن کی نگارشات میں عصری آگہی و جدید حسّیت کے ساتھ ساتھ دیرینہ ادبی روایات اور اکابرین ادب سے کسبِ فیض کی صورتیں بھی ملتی ہیں اس لیے نئے لکھنے والوں کی قدر افزائی جدید ادب کا طرہ امتیاز ہونا چاہیئے۔ البتہ یہ احتیاط لازم ہے کہ فنی سقم سے پاک ہوں اور فکر واحساس میں موضوعی ومعروضی خرد افروزی وادب آموزی کا سلیقہ ہو۔ ادبی شعور کی کمی کا مسئلہ، ادب کے قارئین کی صورت حال، جعلی شاعروں اور ادیبوں کی کھیپ بے شک یہ مسائل حاضرہ اہم ہیں اور ان پر سنجیدگی سے غور وخوض کی ضرورت ہے۔

میرا خیال ہے کہ ادبی شعور میں کمی نہیں۔ دنیائے ادب اب ادبی شعور کے لیے صرف کتابوں اور جریدوں پر اکتفا نہیں کرتی برقی ذرائع ابلاغ کا پھیلاؤ بھی کافی اثر انداز ہو رہا ہے۔ ادب کے قارئین میں واقعی پہلی جیسی لگن نہیں۔ اسے آپ سہل پسندی اور تن آسانی پر محمول کیجئے اور بات پھر برقی ذرائع کی بھرمار تک پہنچتی ہے۔ ذرا دیکھئے تو کتنے ٹی وی چینل ہیں جن کی دید وشنید کا سلسلہ روز وشب کی تخصیص کے بغیر جاری ہے۔

اب رہا جعلی شاعروں اور ادیبوں کی کھیپ کا مسئلہ تو بھائی میرے! ''جس دیئے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا''۔ ہمارے اس شہر قائد کراچی میں ایسے کئی دھن دولت اور اعلیٰ عہدوں والے ہیں جنکی بڑی خوبصورت خوبصورت کتابیں شائع ہوئی ہیں مگر کام کسی کا نام کسی کا۔ نمبر۲ مال تو ادب کی منڈی میں بھی ہر دور اور ہر زمانے کا

سودا رہا ہے بہر کیف آپ کے بقول ''ادب کو اولیّت اور اہمیت دینا بے حد ضروری ہے''۔

مضامین ومقالات میں ڈاکٹر جمیل جالبی، خلیق الرحمٰن، ناصر عباس نیّر، شگفتہ الطاف، کرشن مہشوری اور نذر خلیق کی تحریریں متنوع موضوعات پر لائقِ مطالعہ ہیں خصوصاً نذر خلیق نے ''اردو کی اہم ادبی ویب سائیٹس'' کی جو معلومات فراہم کی ہیں ان کو عصرِ رواں کی ترجیحی ضرورتوں میں شمار کرنا چاہیئے۔ بہتر ہوگا کہ یہ سلسلہ جاری رہے۔

انتظار حسین صاحب طرز ادیب وانشاء پرداز ہیں۔ ہمارے افسانوی ادب میں ان کا بڑا نام ہے۔ نصف صدی پہلے ہی ان کی تخلیقی انفرادیت کے ڈنکے بجنے لگے تھے۔ عام فہم زبان میں ایسے زوردار فقرے لکھنا ہر قلمکار کے بس کا کام نہیں ''ادیب کی شخصیت تو ماس میڈیا کے کام آسکتی ہے ادب ماس میڈیا کے کام کی چیز نہیں''۔ غزلیں، نظمیں اور ماہیئے پڑھے' خوشی ہوئی کہ ہماری شاعری کے دامن میں کیسے کیسے گہر ہائے آبدار کا اضافہ ہو رہا ہے۔

افسانوں میں پہلا افسانہ رشید امجد کا ''بے سفری'' ہر چند کہ عام فہم بیانیہ افسانوں سے خاصہ مختلف اور تجریدی وعلامتی ہے مگر اس کی ادبی اہمیت وافادیت ہمارے افسانے کی عالمی اٹھان کے لیے بہر طور قابل قدر قریب قریب چالیس برسوں سے ہمارے افسانوی ادب میں بڑے معرکے کے تخلیقی تجربات ہوتے رہے ہیں۔ رشید امجد کا نام ایک بڑے افسانہ نگار کے طور پر ابھرا ہے اور ان کا یہ افسانہ بھی عظمتِ فن کی دلیل ہے۔

منشاء یاد کا افسانہ 'ماں جی' دیکھتے ہی قدرت اللہ شہاب یاد آ گئے تاہم یہ بھی بڑے منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں جن کے ڈرامے ٹی وی پر بھی دیکھتا رہا ہوں۔ سادگی میں پرکاری پیدا کرنے کا آرٹ ایسے ہی قلم کو آتا ہے۔

باقی تمام افسانے بھی اثر آفریں ہیں۔ خصوصی مطالعہ بھی لائقِ مطالعہ۔ خصوصاً پچھلے اداریئے پر ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کا تبصرہ (جسے آپ اداریے پر ردِ عمل قرار دیتے ہیں) مختصر ہوتے ہوئے نہ صرف فکر انگیز بلکہ بصیرت خیز ہے۔ بات کچھ یوں ہے مغربی افکار ونظریات کی اپنی ایک دنیا ہے اُدھر سو فیصد تعلیم یافتہ اور بیشتر صورتوں میں خوشحال وآزاد خیال لوگ ان کے سروں کی ٹوپیاں ہم اپنے سروں پر زبردستی منڈھنے کی سعی ءلا حاصل کیوں کریں ہاں جو فکری وفنی جہتیں ہماری اپنی روایات کے تسلسل میں مثبت اجتہادی کردار ادا کرنے کے قابل ہوں بے شک ان کو ڈاکٹر صاحب کی طرح اپنائیں اور نقد ونظر کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد تخلیق وتنقید میں جذب کریں تو بہتر ہے۔ محترم وزیر آغا نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اوراقِ ادب ہی کی چھان پھٹک میں بسر کیا ہے۔ مجھے ان کی تمام باتیں اچھی لگیں۔

ماہیئے پر مکالمہ پسند آیا۔ ہمیں اپنے دیس کی اصناف سخن کو حیاتِ نو دینے میں مسلسل پیش رفت کو اپنائے رہنا چاہیے۔ بیت' کافی' دوہے' وائی' ٹپے' ماہیئے اور گیت وغیرہ کی کلاسیکی بنت میں اب جدید کلاسیکی اور

جدید حسیاتی رنگ وآہنگ پیدا کرنا عصری شعور وآگہی اور بقائے ادب کو تقویت دینے کے مصداق ہے۔میرے پاس جدید ادب کی صرف ایک جلد ہوتی ہے جو کئی پڑھنے والوں کے کام آتی ہے۔بہر کیف اس جریدے کے دنیائے ادب پر بڑے دوررس اثرات پڑرہے ہیں اور پڑتے رہیں گے۔

؎ وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا   ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔

پروفیسر آفاق صدیقی،صدر نشیں سندھی ادبی بورڈ، کراچی

☆☆ جدید ادب کا دوسرا شمارہ یہاں بھائی عمر صاحب سے ملا تھا۔اس شمارے کو ادبی حلقے نے بہت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا۔پسند کیا۔۔۔اردو دنیا میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ کوئی اردو ادبی رسالہ ویب سائٹ پر معیاری مواد کے ساتھ موجود ہو،اور وہ عزت جدید ادب کو خدا کے فضل سے حاصل ہے۔پڑھنے والے آہستہ آہستہ واقف ہورہے ہیں۔ **ڈاکٹر ولی بجنوری** (سابق معالج صدر جمہوریہ ہند۔دہلی)

☆☆ جدید ادب شمارہ نمبر۲ عزیزم نذر خلیق کے ذریعے موصول ہوا تھا۔اپنی شعبہ جاتی مصروفیات اور تحقیقی کاموں کی نگرانی کی وجہ سے جدید ادب کا اس انداز سے تو مطالعہ نہیں کر پایا کہ جس طرح کرنا چاہیئے تھا تاہم جستہ جستہ دیکھا ہے۔سب سے پہلے تو آپ کا لکھا ہوا اداریہ توجہ کا مرکز بنا۔آپ نے درست لکھا ہے کہ قاری سے زیادہ ادیبوں کی ادب سے عدم دلچسپی اور ادبی شعور کی کمی قابلِ توجہ ہے آج کا ادیب مطالعہ اور مشاہدے سے دور ہوتا جارہا ہے۔آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے بھی اپنے انداز سے اس سلسلے میں اپنے ایک مضمون میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے یہ حقیقت ہے کہ ادب کو تخلیق کرنے والے جب ادب کی روح کی حقیقت سے نا آشنا ہوں گے تو پھر ایک عام قاری کا ادبی شعور اور ذوقِ مطالعہ کس طرح بڑھ سکتا ہے۔

آپ جس لگن اور محنت سے جدید ادب کے ذریعے ادب کو فروغ دے رہے ہیں مجھے یقین ہے کہ اس کے مثبت اور غیر معمولی نتائج برآمد ہوں گے۔صبا اکبر آبادی کے غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت بھی ایک اہم کامیابی ہے۔مضامین میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا مضمون (اچھا ادب کیا ہے)ایک اہم مضمون ہے کیوں کہ ڈاکٹر صاحب نے جس انداز سے اچھے ادب کی وضاحت کی ہے اس سے ادب کی ایک حقیقی صورت سامنے آتی ہے۔غزلوں کا انتخاب تو اس لیے بھی جاندار ہے کہ آپ خود ایک شاعر ہیں افسانوں میں رشید امجد کا افسانہ بے سفری منشا یاد کا ماں جی اور محمد عاصم بٹ کا انتظار'اہم افسانے ہیں۔نظموں میں ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر آفاق صدیقی، خورشید ناظر فرحت نواز، تابش کمال، شمسہ اختر کی نظمیں خصوصیت کا درجہ رکھتی ہیں۔خصوصی مطالعے میں صبا اکبر آبادی کا کلام (تضمین غالب) مابعد جدیدیت (اداریئے پر ردِ عمل) اور ماہیئے پر مکالمہ اہمیت کے حامل ہیں۔جدید ادب کے

اس شمارے میں ماہیئے، کتاب گھر میں کتابوں پر تبصرے تو قابلِ مطالعہ ہیں ہی تاہم تفصیلی مطالعے میں ڈاکٹر صدیق خاں شبلی کا مضمون (اپنا گریباں چاک) اس لیے بھی اہم ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب پر ایک منفرد اور اچھوتے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔آپ کا جدید ادب صوری اور معنوی اعتبار سے ایک منفرد ادبی جریدہ بن کر ابھرا ہے۔پروفیسر نذر خلیق کے مسلسل اصرار کے باوجود جدید ادب کے آئندہ شمارے کے لیے اپنی کوئی چیز نہیں بھیج سکا اور اس کی وجہ میری مصروفیت ہے۔انشاء اللہ اس کے بعد کے شماروں کے لیے چیزیں بھیجتا رہوں گا۔ **ڈاکٹر شفیق احمد** صدرِ شعبہ اردو و اقبالیات۔اسلامیہ یونیورسٹی' بہاولپور۔